● نسترن احسن فتیحی

کال بیلیا

دنیا نجانے کتنے پیروں پر گھومتی ہے کسے معلوم؟ لیکن شاید اسی لئے یہ کہیں بہت تیز تو کہیں بہت سست رفتار سے گھومتی محسوس ہوتی ہے۔ مگر کال بیلیا قبیلے کی نرملا جوگن اپنے ان ہی دو پیروں سے سارے عالم کی خاک چھان چکی ہے۔ وہ پچھلے پانچ سال سے ایک ہی رفتار سے گھوم رہی ہے صرف اس لمحے کے انتظار میں جب اسے اپنے قبیلے میں ایک بار پھر واپس لوٹنا ہے۔ اسے اپنے دل میں اس ایک خواہش کے علاوہ اور کسی خواہش کا پتہ نہیں ملتا۔ لوگ کہتے ہیں ابھی اس کی عمر بہت کم ہے اور اسی کم عمری میں اس نے بہت شہرت حاصل کر لی ہے۔ پچیس سال کی عمر میں اسکے پاسپورٹ پر کتنے ہی ملکوں کا ویزہ لگ چکا ہے ساتھ ہی وہ اپنے وطن کے چپے چپے کی سیر بھی کر چکی ہے۔

لوگ عمر کا حساب نہ جانے کیوں دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں رکھتے ہیں۔ عمر کا حساب تو تجربوں، حادثوں اور سفروں میں رکھنا چاہئے۔ اس کی زندگی کا سفر تو جیسے دو صدیوں پر محیط ہے۔ جی ہاں..... دو صدیاں..... کیونکہ وہ بیک وقت دو صدیوں میں ایک ساتھ جیتی آئی ہے۔ دو صدیوں میں ایک ساتھ جینے کی تکلیف کیسی ہوتی ہے یہ اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا..... صرف ایک اڑان سے وہ اکیسویں صدی سے ایسی جگہ پہنچ جایا کرتی تھی جہاں دنیا کا وہ حصہ جیسے اپنی رفتار بھول چکا ہو۔ گویا آج بھی وہ حصہ اور وہاں کے لوگ پندرھویں صدی عیسوی میں جی رہے ہوں اور المیہ یہ ہے کہ وہی اس کا مقدر تھا، اس کی مجبوری تھی..... اکیسویں صدی کی جھلک دیکھ دیکھ کر پچھلی صدیوں جیسے حالات میں جینا اس کی قسمت تھی۔ اور اپنے اسی مقدر سے جب اس نے محبت کرنا سیکھ لیا تو تقدیر نے یہ کیا موڑ لے لیا کہ پانچ سال سے وہ اس جگہ سے دور ہے اور ایک لمحہ بھی اسے چین نصیب نہیں۔ اپنے کال بیلیا قبیلے کی وہ عالمی شہرت یافتہ مگر ایسی بدقسمت رقاصہ ہے جو اپنے قبیلے سے دور رہنے پر مجبور ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے ملک کے علاوہ وہ کوپن ہیگن، ڈنمارک جیسی جگہوں پر گھوم گھوم کر رقص کی تعلیم دیتی رہی۔ مگر اپنے قبیلے کی طرف نہیں جا سکی۔ پشکر، پالی، اجمیر، چتوڑگڑھ، کی مٹی میں اس کے لئے جو کشش تھی وہ اسے کھینچتی ہے، اس کے ساتھ اب ایک چار سال کا بیٹا بھی ہے جو اپنے مستقبل

سے بے خبر گداز بستر پر آرام سے سو رہا ہے..... وہ گردن موڑ کر ہوٹل کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی.....

وہاں سے پہاڑی کی ڈھلان پر چیڑ کے درختوں کے جھرمٹ میں نیچے دور تک گھاٹی نظر آ رہی تھی اس گھاٹی کے ساتھ کہیں نمایاں اور کہیں غائب ہو جانے والی پگڈنڈیاں سانپ کی مانند بل کھاتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے دور افق پر نظر دوڑائی سورج چھپ چکا تھا، آسمان کہیں زرد کہیں پیلا اور افق کے ساتھ سرخی مائل تھا۔ دور پہاڑی کے عقب سے جھانکتے ہوئے کیمپ کے آدھے حصے پر اندھیرا اتر آیا تھا اور وہاں کام بند ہو چکا تھا، جنوب کے سمت اڑنے والے جنگلی پرندوں کی قطاروں کے نیچے انسانوں کا ریلا اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں تھا، جنکے ہاتھوں اور کندھوں پر بچھاوڑا، بیلچہ اور دوسرے اوزاروں کا بوجھ تھا اور وہ اپنے تھکے ہوئے بیزار قدموں سے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔

''گھر'' یہ لفظ اس کے کال بیلیا قبیلے کے لئے گویا ایک گالی تھی..... ایک بددعا اور اس بددعا کو سینے سے لگائے وہ پشت در پشت جیتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے اپنے بابا سے سنا تھا کہ بھگوان وشنو کے ماننے والے گرو چالندر ناتھ نے اپنے دو شاگردوں گورکھ ناتھ اور کنی پاؤ کو کوئی وردان دینے سے پہلے دو پیالے دے کر کہا تھا کہ تم نے آج تک جو ہنر اور فن مجھ سے سیکھا اسے ثابت کرنے کے لئے ان پیالوں کو کسی چیز سے بھر دو پھر وردان پاؤ گے۔ گورکھ ناتھ نے اس اپنے پیالے کو پھل کے میٹھے اور مزیدار پکوان سے بھر دیا مگر کنی پاؤ نے اپنے پیالے کو زہر سے بھر دیا تب ناراض ہو کر گرو نے کنی پاؤ کو شراپ (بددعا) دیا کہ وہ پشت در پشت در در بھٹک کر سانپ کا زہر جمع کریگا اور یہی اس کا ذریعہ معاش ہوگا۔

اور اسی لئے ان کے قبیلے کے لوگ آج بھی ریگستان کے ویرانوں، ٹیلوں اور جھاڑیوں میں سانپ ڈھونڈھتے ہیں، پتھر توڑ کر، بھیک مانگ کر مزدوری کر کے جیتے ہیں۔ ان کے ڈیرے بستی کے حاشیے پر لگائے جاتے ہیں۔ لوگوں کی خوشیوں میں رقص اور موسیقی کی محفل سجا کر سانپوں کے کرتب دکھا کر وہ ہر وقت خوش رہتے ہیں۔

مگر نرملا جوگن ان سے مختلف تھی وہ سوال بہت کرتی تھی..... یہ جانے بغیر کہ شراپ میں جینے والوں کو سوال کا حق نہیں ملتا۔ اس لئے پانچ سال سے وہ اپنے سوالوں کے جواب کی تلاش میں بھٹکتی رہی ہے۔ اتنے برسوں میں اس کے اندر صرف اور صرف ایک خواہش پروان چڑھی ہے، کہ وہ اپنے قبیلے میں جا کر بابا، ماں اور بھائی کی تین قبروں سے لپٹ جائے..... وہ قبریں جو اس کے دل میں کھدی تھیں..... اور وہ خود ایک ایسی دنیا میں تھی جو نہ زندہ تھی نہ مردہ اور اسی لئے وہ دنیا اسے وحشت ناک معلوم ہوتی تھی کہ وہ مدتوں سے زندگی اور موت سے قطعاً بے گانہ اور لاتعلق ہو چکی تھی۔ اس کو اپنی اس بے جان دنیا میں زندگی

کے انتہائی حقیر اور کمزور ہونے کا احساس اندر ہی اندر کا تار رہتا تھا، اسی لئے رقص پر تھرکتے ہوئے پیروں نے روح سے ناطہ توڑ لیا تھا۔

تھکن، کمزوری، اندیشوں اور الام کے بوجھ میں دبے رہنے کے باوجود ایک بے حس سی قوت انتہائی شدت سے کسی الاؤ کی مانند دہکتی اس کے دل میں باقی تھی جو اسے جینے پر مجبور کیے ہوئے تھی۔ اس کا اپنے بیٹے سے بھی بس ایسا ہی کچھ ناطہ تھا جتنا کہ اپنے رقص سے باقی رہ گیا تھا۔ نرملا جوگن نے اپنے باپ جوگی ناتھ اور بھائی ویروم جوگی سے سانپ کا زہر نکالنے کا ہنر نہیں سیکھا تھا وہ تو ماں کے کندھوں پر بیٹھ کر گھومر ڈالتے ڈالتے اور لور کے تال پر تھرکتے تھرکتے جانے کب زمین پر اتر کر اس سے قدم ملا کر ناچنے لگی اور پندرہ سال کی عمر سے ہی شہرت کی سیڑھیاں طے کرتی گئی۔

وہ اپنے قبیلے کی سب سے خوبصورت عورت تھی، ریگستان کی دھوپ اور ہوا کے اثر سے اس کے ہاتھوں اور چہرے کی جلد بھی دوسرے قبائلی باشندوں کے مانند سرخ تھی اور اس کے نقوش بہت پرکشش تھے۔ اپنی ہرنی جیسی خوابناک آنکھوں میں وہ بڑے بڑے رنگین خواب لئے پھرتی، جو سرخ ڈوروں کی شکل میں اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت تحریر رہتے۔ سیاہ ریشمی لہنگا چنی کے رنگین نقش ونگار اس خوبصورت سپیرن کے حسن میں ایسا نکھار پیدا کرتے کہ بڑے سے بڑا تکبر اس کے سامنے سرنگوں ہونے کو بے چین ہو جاتا۔

مگر حاشیے پر پھینکے ہوئے یہ لوگ اچھوت تھے۔ سب کی خوشیوں میں شریک ہو کر ناچ گا کر بستی سے باہر اپنے ڈیرے میں لوٹ جاتے نرملا کی باہر کی دنیا میں مانگ بڑھ رہی تھی اور اسے اچھوت ماننے والوں کی نظروں میں حرص۔ اس وقت تک اس سپیرن کو اندازہ ہی نہ تھا کہ سانپ صرف ریگستانی علاقے کی جھاڑیوں اور ٹیلوں میں بل بنا کر ہی نہیں رہتے بلکہ ان سے بھی خطرناک زہریلے سانپ انسانی شکلوں میں بڑی بڑی حویلیوں میں رہتے ہیں۔ بچپن سے وہ سانپوں کو بلوں میں دیکھتی آئی تھی۔ جب اس کا بابا خطرناک پھنیر ناگ کو بے بس کر کے اپنی ٹوکری میں ڈالتا تو اس کا دل خوشی سے جھوم جاتا اور وہ ماں کے کندھوں سے مچل کر اترتی اور بابا کی گود میں بیٹھ جاتی، وہ اپنی رنگیں پگڑی کو مضبوطی سے سر پر جماتا اور اپنی گھنی مونچھوں کے درمیان ہولے سے مسکرا دیتا۔ نرملا کے لئے گھر کا مطلب ماں بابا اور بھائی کا ساتھ تھا۔ اپنی خانہ بدوشی میں زمین کے جس حصے پر یہ چاروں اپنا ڈیرہ جماتے وہی اس کا گھر ہوتا۔ پندرہ سال کی عمر سے وہ باہر کا سفر کرنے لگی۔ کم عمری میں اتنے مواقع ملنے سے اس کی سمجھ اور عقل کھلنے لگی، اسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنا آ گئی قبیلے کی کچھ اور عورتیں بھی باہر جاتی تھیں مگر اتنی جلدی جلدی نہیں اس لئے قبیلے میں اس کے خاندان کی حالت معاشی طور پر سب سے بہتر ہو گئی..... نرملا جوگن اپنے بابا سے اپنے قبیلے کی حالت اور طور طریقوں پر سوال

جواب کرنے لگی..... اسے دوسری دنیاؤں کے سامنے اپنے قبیلے کی کسمپرسی تکلیف دینے لگی..... وہ اپنے باپ سے کہتی"..... بابا اب دھوپ میں بھٹک کر سانپ کو ڈھونڈھنا چھوڑ دو۔"

"ناگ کو ٹوکری میں بند کر کے اس کا تماشہ دکھانا چھوڑ دو....."اور اس کا باپ ہنستا ہوا پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔

"جانتی ہے ہمیں کال بیلیا کیوں کہا جاتا ہے؟"

وہ نفی میں سر ہلا دیتی تو بتاتا.....

"کیونکہ ہم موت کے ساتھی ہیں کال مطلب موت اور بیلیا ساتھی کو کہتے ہیں..... ہم موت کے ساتھی ہیں جبھی تو ہم زہریلے سانپوں کے بلوں میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں، انہیں بیلی بنا سکتے ہیں اور سانپ کسی کو کاٹ لے تو اس کا زہر بھی اتار سکتے ہیں، تو نے دیکھا تھا نا اس دن زمیندار کے بیٹے راجیش کو سانپ نے کاٹا تو تیرے بابا کے پاس کیسے دوڑے آئے سب، یہ ہنر ہے، یہ ہمارے پرکھوں کا اثاثہ ہے۔"

اور نرملا سمجھ گئی اپنی قسمت سے راضی بہ رضا ہو کر اپنے قبیلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مست رہنے لگی۔ مگر جس انسان کو اس کے بابا نے سانپ کے زہر سے بچایا تھا اسی نے بار بار اس کا راستہ روکنا شروع کیا۔ بہانے بہانے سے وہ یہاں وہاں اسے گھیرتا اور وہ غصے سے بل کھا کر رہ جاتی، چاہ کر بھی بابا کو یہ بات نہ بتا پاتی کہ اسنے جسے بچایا ہے وہ بھی ایک زہریلا سانپ ہے جسے بچانے کے بجائے مرنے دیا ہوتا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی سے ہٹ آئی اور اپنے نرم بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ اس کی زندگی میں یہ آسائشیں جن چیزوں کو کھو کر آئی ہیں وہ ایسی تو نہ تھیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھا جائے مگر اپنا قبیلہ اپنے لوگ کتنے بھی قدامت پرست ہوں، وہ علاقہ کتنا بھی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو، اپنی تہذیب کی جڑوں سے جڑ کر جینا اور مرنا انسان کی سب سے پہلی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی نظروں میں اس کی زندگی فلم کی طرح چلا کرتی اس کا بچپن، جوانی، اس کی محبت..... آنسو ڈھلک کر تکیے میں جذب ہو گئے..... ذہن ماضی میں الجھتا چلا گیا۔ رقص و موسیقی کی وہ محفل جو گاؤں گھر کی ہر خوشی کے موقعے پر جمتی تھی۔ اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر گھومر ڈالتی اور وہ لور کے دھن پر دیوانہ وار ناچتی، اس کا منگیتر چکی گھوڑی کا رقص کرتا اور پورا قبیلہ مل کر موسیقی کی دھن میں اپنی ساری محرومیاں بھول جاتا۔ نیند اور یادوں کے خمار میں اسے لگا بین اور پنگی کی رسیلی دھن پر تیرتی ہوئی وہ جیسے اس علاقے میں پہنچ گئی ہو۔ جہاں اس کا بھائی ہاتھ میں بڑا بھاری کونٹ لئے کنٹیلی جھاڑیاں کاٹتا چل رہا ہو، اسے کانٹے دار جھاڑیوں سے کیسی دشمنی تھی، وہ کونٹ اس کے ہاتھ سے کبھی علیحدہ نہ ہوتا۔ اس کا دوپٹہ جس جھاڑی سے الجھتا وہ بھائی کو آواز دیتی اس سے صرف ایک سال

ہی تو بڑا تھا۔ جبکہ اس کا منگیتر کرما جوگی سہل پسند اور ڈرپوک تھا۔ وہ ہمیشہ اس کا مذاق اڑاتی اور ایک دن راجیش کنٹیلی جھاڑیوں کی طرح اس کی راہ میں حائل ہوا تو وہ بھائی کو آواز دینے لگی..... پھر کیا تھا وہ کونٹ سمیت راجیش کے سر پر حاوی ہو گیا اور اس دن بھی بابا بیچ میں نہ کودا ہوتا تو راجیش کی جان چلی جاتی..... بابا نے راجیش کو بچا دیا مگر ٹھا کر کو سپیرے اور نیچ ذاتی کے کا لبیلیا قبیلے کے لڑکے کی یہ جرت برداشت نہ ہوئی..... جس قبیلے کو ان کے گاؤں میں مردے تک جلانے کی اجازت نہیں، تا کہ یہ اچھوت اپنے مردے جلا کر ہوا، پانی سب دوشت نہ کر دیں۔ انہیں حکم تھا کہ یہ اپنے مردے اپنی جگہیوں کے درمیان اپنے آنگن کے سامنے دفنایا کریں اور ہندو دھرم ماننے والا یہ قبیلہ ہمیشہ اپنے مردے دفناتا ہی آیا تھا اپنے آنگن میں اپنے دروازے کے سامنے۔ مگر ویروم کی یہ گستاخی ناقابل معافی ٹھہرائی گئی۔

نرملا گھبرا کر آٹھ بیٹھی..... نیند میں بھی پانچ سال پرانی باتیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں..... ویروم کا غصے سے سرخ چہرہ اب بھی اس کی نظروں میں ویسے ہی گھومتا، ہر رات وہ اس عذاب سے گزرتی تھی دن مصروفیت میں نکل جاتا مگر رات اسے روندتی ہوئی گزرتی..... جو پانچ سالوں پر محیط تھی..... اسے لگتا ایک بار وہ اپنے قبیلے چلی جائے ماں بابا اور بھائی کی قبر پر تو شائد اسے قرار آ جائے..... وہ راجیش کو اپنے ہاتھوں سے اس کے کئے کی سزا دے اور اپنے منگیتر کی بزدلی پر ایک بار اس کے منہ پر تھوک آئے۔ اس کا چہرہ آنسوں سے بھیگ گیا..... اس نے بیٹے کی طرف دیکھا..... وہ اپنے مستقبل اور ماں کی دلی کیفیت سے بے خبر سو رہا تھا۔ اسی کی وجہ سے کرما جوگی بہانے بناتا ہے اسے گاؤں آنے سے روکتا ہے۔ اسے یاد آیا کیسے ٹھاکر نے موقع دیکھ کر ویروم کو اٹھوا لیا اور وہ بار راجیش کی جان بچانے والا بابا ماں کو ساتھ لیکر ٹھاکر سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے پہنچا تو ٹھاکر نے اس کی جھولی میں بھی موت ڈال دیا خبر ملی کر پاگلوں کی طرح روتی فریاد کرتی نرملا وہاں پہنچی تو ٹھاکر نے کال بیلیا قبیلے کی تاریخ میں اس رات کو قیامت کی رات بنا دیا۔ اس کے باپ اور بھائی کی لاش کو ڈیرے کے سامنے پھینک گئے..... ماں غم سے نڈھال ہو گئی۔ اور نرملا کو انہوں نے اتنا ڈسا کہ اس کا جسم اس زہر سے نیلا پڑ گیا اور وہ اسے بھی کال بیلیوں کے ڈیرے پر مردوں کی سی حالت میں پھینک گئے۔ جب تک نرملا کے جسم میں سانس لوٹی ماں نے زندگی سے منھ موڑ لیا تھا۔ اپنے ڈیرے میں وہ تنہا تھی اور سامنے تین قبریں..... اسے دنیا کی ہر چیز قبر کی طرح ساکت لگ رہی تھی۔ پھر اسے کرمانے سمجھا کر وہاں سے رخصت کر دیا کہ حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ اسے بلا لیگا..... مگر حالات ٹھیک نہ ہوئے، کرما خود آ کر اس سے مل جاتا اور ہر بار اس سے موٹی رقم وصول کرتا جلد شادی کا وعدہ کرتا اور اسے سمجھاتا کہ وہ گاؤں آنے کی غلطی نہ کرے ٹھاکر کو پتہ نہ چلے کہ تو نے اس کے بچے کو جنم دیا ہے ورنہ وہ پورے قبیلے کو ختم کر دیگا۔

اور وہ اس کی بات مانتی رہی..... ناچتی رہی اور اس کے دل میں الاؤ سلگتے رہے بالکل اس کے گاؤں کے اس ریت کے ٹیلے کی طرح جس میں کوئلہ بنانے کے لئے لکڑیوں کے ڈھیر سجا کر چاروں طرف سے اسے ریت سے ڈھک دیا جاتا ہے اور اس میں اندر ہی اندر آگ سلگائی جاتی تھی۔ جس سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا رہتا تھا تین دن بعد آگ بجھ جاتی تو یہ ٹیلہ کرید کر اندر سے کوئلہ چن لیا جاتا.. وہ بھی اسی ٹیلے کی طرح اندر ہی اندر پانچ سال سلگتی رہی ہے۔ اسے جب جب معلوم ہوتا کہ اس کا خانہ بدوش قبیلہ پھر اسی جگہ خیمہ زن ہے جہاں وہ تینوں قبریں ہیں تو وہ جانے کو تڑپ اٹھتی۔ کرمانے اسے دو دن پہلے ہی فون کر کے یہ احسان دیا تھا کہ آج کل وہ سب وہیں ہیں اور اس کے ڈیرے کو بھی صاف ستھرا کروا دیا ہے اور قبر پر کچھ نئے پتھر ڈال دئے ہیں۔

صبح اٹھ کر نرملا جوگن نے اپنے پروگرام آرگنائزر سے چند دنوں کی چھٹی لی اور گاؤں جانے کا اردہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ کرما اسے کبھی اجازت نہیں دیگا۔ مگر اب اسے پرواہ نہیں۔ اسے یقین ہو چکا ہے، اس کے ساتھ برا ہونے سے کچھ بچ نہیں گیا ہے۔

نرملا جوگن گاؤں پہنچی تو اسے ایک اجنبیت کا احساس ہوا..... سب تلاش معاش میں نکل چکے تھے۔

وہ نظر اٹھا کر جدھر بھی دیکھتی اسے آسمان اور زمین کی بے پناہ وسعتوں میں سن سن کرتا سناٹا نظر آیا اسے اپنے اندر اور باہر خلا کا سامنا در پیش تھا..... آسمان کی لامتناہی وسعتوں کے نیچے ریت کی بے پناہ مقدار پر سورج کی گرم کرنیں منعطف ہو کر انسانی سانسوں کو معدوتر کر رہی تھیں، کسی چیز کو جنبش یا دم مارنے کا یارانہ تھا اور ان لاتعداد اور غیر معمولی طور پر مہین کرنوں کے آپس میں خلط ملط ہوتے رہنے کے دوامی عمل کے علاوہ اور کوئی حرکت محسوس نہ ہوتی تھی۔ جہاں تک اس کی نگاہ جاتی دنیا محض ہوا سورج اور ریت بس ان تین چیزوں پر مشتمل دکھائی دیتی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے ڈیرے کے سامنے پہنچی جہاں تین قبریں موجود تھیں جن پر کچھ پتھر رکھ کر اس ابھر کو نمایاں کر دیا گیا تھا وہ بیٹے کی انگلی تھامے قبر کے پاس پہنچی۔ یہ وہ قبریں تھیں جنھیں گاؤں میں دو گز زمین کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اس بے بس لمحوں کے درمیان کسی وقت اس کے دل میں نفرت اور بغاوت کی مٹی سے ایک آرزو پنپی اور اس نے اپنے ہاتھ سے ان قبروں کو چھو کر ایک وعدہ کیا۔ وہ دل ہی دل میں بولی بابا۔ بھیا میں سپیرن سے وش کنیا بن کر آئی ہوں۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ زہر کا پیالہ بھر بھر کر خود پیتی رہی کئی پاؤنے اس پورے قبیلے کو ایک زہر کا پیالہ بھر کر شراپ گرست کروا دیا تھا میں ہزاروں پیالے پی کر خود کو اتنا زہریلا بنا چکی ہوں کہ اس دنیا میں سب کو شراپ دے سکوں۔

شام ہوتے ہوتے قبیلے کے لوگوں میں اس کے آنے کی خبر پھیل گئی، کرما بہت خوف زدہ تھا۔

"کیوں آئی ہے تو..... صبح ہوتے چلی جا ٹھا کر کو پتہ نہ چلے۔"

''نہیں جاوں گی میں، میں نے جرم نہیں کیا تو کیوں ڈروں۔''

''وہ بچے کو نہیں چھوڑیگا، ہمیں بھی مروادیگا۔''

تو نہ چھوڑے۔ یہ میری ذمہ داری نہیں، میں اب کام نہیں کرونگی۔ سمجھا تو......''

''باولی ہوئی ہے چھوری اپنے بچے کو کوئی مارتا ہے...... کیسی ماں ہے تو؟'' سمجھانے والوں میں سی کسی کی آواز آئی......۔

یہ سن کر وہ تلخی سے ہنسی اور بولی ''جب سوکھا پڑ جاتا ہے اور کہیں کوئی پھول پھل نہیں ملتے تو شہد کی مکھیاں اپنی ہی چھوٹی مکھیوں کو ڈنک مار مار کر ختم کر دیتی ہیں کہ اب انہیں کھلائیں گی کہاں سے......''

''تو مر، مگر سن لے تیری وجہ سے ہم پر کوئی آفت آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' کرما تلملاتا ہوا نکل گیا۔

نرملا ڈیرے سے نہ نکلی۔ یہ رات بھی اس پر بھاری تھی وہ خود کو نہ سویا ہوا محسوس کر رہی تھی نہ جاگتا ہوا، اس کے ڈیرے کی دیواریں ہوا سے ہل رہی تھیں، چھت میں لگی پنیاں کھڑ کھڑ کرتیں اور اپنی کمزوری اور کم مائیگی کا ماتم کرتی رہتیں، وہ نہ تو ان آوازوں کو اندر آنے سے روک پانے پر قادر تھیں جو اس کے خلاف تھیں اور نہ ماضی میں اجنبی قدموں کو روکنے کی سکت ان میں تھی، جنہوں نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ گرد ونواح کے تمام منظر پست واقع ہوئے تھے، زمین بالکل ساکت اور بے سایہ تھی، خلا کی لامتناہی وسعتوں میں اس کی حیثیت ایک پلیٹ فارم جیسی تھی ......نرملا کو لگا کہ یہ بڑے سخت حالات ہیں اور بس وہ خود کو بہت مضبوط اور مستعد رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت رات تک جاگنے کی وجہ سے وہ دیر تک ڈیرے میں سوتی رہی، بیٹے کی اسے فکر نہ تھی آج تو اسے دیکھنے والے کافی تھے۔ وہ نہ جانے کس کے پاس تھا۔

اگلی صبح ذرا دیر سے اٹھی تو رات کو پی ہوئی بوٹی کا اثر اتر چکا تھا...... جسم کی تکان بھی زائل ہو چکی تھی۔ ڈیرے پر سناٹا پسرا تھا اس تپتی دھوپ میں پورا ریگستان کھویا ہوا سا لگ رہا تھا، افق کا کہیں پتہ نہ تھا، لرزتی ہوئی زمین کے ہر حصے میں ہوا لہراتی ہوئی اوپر کو آٹھ رہی تھی گرد وغبار کے بگولے آٹھ آٹھ کر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دور دور تک زمین لرزتی نظر آ رہی تھی جس پر نگاہ ٹھہرنا محال تھا۔ بہت دور کچھ بونے بونے گردسے اٹے درخت یا جھاڑیاں اکادکا نظر آ رہی تھیں۔ اس کی نظر ڈیرے کے سامنے تین قبروں پر ٹھہر گئی۔ وہ ڈیرے سے نکل کر قبر کے پاس آئی تب ہی کرما کا چھوٹا بھائی دوڑتا ہوا آیا...... ٹھاکر کو پتہ چل گیا وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔

''نرملا زہریلی ہنسی ہنسی...... آنے دے آج اس سے بھی حساب چکتا ہو جائے ......اور حقارت

سے کرما کی طرف دیکھا جو خونی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا، دانت پیس کر بولا ''مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔''

وہ حقارت سے زمین پر تھوک کر بولی ''ڈرپوک......'' مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی...... ایک گولی چلی کرما کی بندوق سے دھواں نکل رہا تھا اور نرملا آنکھوں میں حیرانی لئے سہ پہر کی گرم ریت پر اوندھے منہ ڈھے گئی۔ اس کا بیٹا کہیں سے نکل کر آ کھڑا ہوا تھا گاؤں اور اس کے حاشئے کی سرحد پر شائد اس کے قدم جرم کی دنیا کی طرف مڑنے کو تیار تھے۔ اور کرما مطمئین تھا کہ اس نے بروقت سارے قبیلے کو قبرستان بننے سے بچا لیا تھا اور ٹھاکر سے کئے گئے معاہدے کے تحت خسارے میں بھی نہیں رہا تھا۔

« ● »

"Lisan" Road No.- 5
Iqra Colony, New Sar Syed Nagar
Aligarh (U.P)

نام رسالہ

استفسار

اکتوبر ۲۰۱۵ء سے مارچ ۲۰۱۶ء

مدیران

شین کاف نظام، عادل رضا منصوری

صفحات: ۱۶۰

قیمت : ۷۵/روپے

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دھلی

● **انتخاب۔ ۱**

● **مشتاق احمد نوری**

لمبی ریس کا گھوڑا

آج وہ بہت خوش تھا۔ اس نے اپنے طور پر بہت بڑا تیر مار لیا تھا۔ حالانکہ اس کی بیوی سلمٰی نے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

''ان کے ساتھ تمہیں ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اس سے اتنی ہمدردی کیوں؟ وہ تمہارا رشتہ دار لگتا ہے کیا؟'' اکبر کے جواب میں اس نے کہا:

''دیکھو اکبر! اس میں رشتہ دار لگنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ انہوں نے تمہارا کبھی نقصان نہیں کیا اور نہ ہی ان سے تمہاری لڑائی ہے پھر............؟''

''تم چپ رہو سلمٰی۔ تم ان بڑے لوگوں کو نہیں جانتیں۔ یہ دیکھنے میں بہت معصوم لگتے ہیں، لیکن......''

''ہوتے ہوں گے''، سلمٰی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ اشفاق صاحب تو ایسے نہیں ہیں۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ وہ ایک اصول پسند آدمی ہیں۔ تم سے ہمیشہ بڑی محبت سے پیش آتے رہے ہیں......''

''چھوڑو ان باتوں کو، تم ابھی میری سیاست نہیں سمجھ پاؤ گی۔ میں ایک عرصہ سے موقع کی تلاش میں تھا، وہ آج مل گیا۔ اب کل کیا ہوگا...... دیکھا جائے گا۔'' اکبر نے اس معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

سلمٰی خاموش ہو گئی۔ وہ جیسی بھی رہی ہو کسی کو بلاوجہ ذلیل کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ آج بھری محفل میں اکبر نے اشفاق صاحب کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا تھا کہ سارے لوگ دنگ رہ گئے تھے۔ سکتے میں تو وہ بھی آ گئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ انہوں نے بڑی محبت سے کہا تھا:

''سلمٰی تم بھی آنا...... تم میری مہمان رہو گی۔''

اگر اسے ذرا بھی خدشہ ہوتا کہ اکبر ایسی ذلیل حرکت کرے گا تو وہ ہرگز اس محفل میں نہیں آتی۔ وہ یہ سب سوچ رہی تھی اور اکبر کی نگاہیں خلا میں اٹک گئی تھیں۔ اس کے نہ جانے کون سے جذبے کی تسکین ہوئی تھی کہ وہ بہت پرسکون لگ رہا تھا۔ وہ جسمانی طور پر اپنے ہنومان نگر کے ایم آئی جی فلیٹ میں تھا لیکن اس کی

روح بہار کے اس خطے میں بھٹک رہی تھی جہاں گوبی کے کھیت میں انسانی سر بو دیے گئے تھے اور اس علاقے نے فساد کی ایسی ہولناکی جھیلی تھی جس کی مثال اس سے قبل نہیں دیکھی گئی۔

اس نے جب سے آنکھ کھولی خود کو ایک ایسے ماحول میں پایا جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ چھوٹی سی آبادی والا یہ محلّہ ناتھ نگر جہاں دن رات چرخوں اور کرگھوں کی آواز آتی رہتی، پاورلوم کی گھڑ گھڑاہٹ ان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئی تھی۔ اس گھڑ گھڑاہٹ میں معصوم بچے بھی بڑی میٹھی نیند سونے کے عادی ہو گئے تھے۔ کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ہینڈلوم کپڑے کا کاروبار نہیں ہوتا تھا۔ کہیں مختلف رنگ کے دھاگے رسیوں پر جھول رہے ہیں کہیں دھاگوں کی رنگائی چل رہی ہے۔ کہیں کپڑے بنے جا رہے ہیں اور کہیں ان کی تھان بنائی جا رہی ہے۔ ایک زمانے میں یہاں کا ریشم پورے ملک میں مشہور ہوا کرتا تھا لیکن اب سب خواب کا حصہ بن گیا تھا۔ نسیم الدین انصاری صاحب بے حد شریف اور ملنسار آدمی تھے۔ ان کا اپنا کاروبار تھا۔ دو چار پاورلوم کے مالک وہ بھی تھے۔ ایک معمولی کاریگر کے پیشہ سے شروع کر کے انہوں نے اپنی محنت مشقت سے اسے کاروبار کا درجہ دیا تھا۔ اصغر علی ان کا پہلا بیٹا تھا جس کی پیدائش پر انہوں نے لڈو تقسیم کئے تھے لیکن جب اصغر علی دس سال کا ہوا تو اسے اپنے نام کا معنی سمجھ میں آیا۔ اس نے خود ہی اپنا نام بدل لیا۔ باپ نے لاکھ سمجھایا لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی۔

''اصغر معنی چھوٹا...... کیا میں زندگی بھر چھوٹا ہی رہوں گا۔ اگر رکھنا ہی ہے تو میرا نام اکبر رکھئے۔ اس سے نام کا بھی اثر پڑے گا۔''

باپ کیا کرتا...... اب اصغر علی، اکبر علی ہو گیا۔ اکبر شروع سے ہی ذہین تھا۔ اس نے اسکول میں اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کی اور مقامی کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کے کالج میں داخل ہونے تک نسیم الدین انصاری صاحب کے یہاں یکے بعد دیگرے چھ بچے پیدا ہو چکے تھے۔ کثیرالاولاد ہونے کے ناطے اکبر کے کالج کا خرچ ان کے بوتے کا نہیں تھا پھر بھی انہوں نے بچے کی خواہش کے سامنے ہمت نہ ہاری اور رہی سہی کسر پروفیسر خان نے پوری کر دی۔

جس کالج میں اکبر کا داخلہ ہوا، پروفیسر خان اسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ بڑے مخلص شخص تھے اور لوگوں کی دل کھول کر مدد بھی کیا کرتے تھے۔ اکبر کی لگن کو وہ تعریفی نظروں سے دیکھتے تھے اور گاہے بگاہے اس کی مدد بھی کر دیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے ہی شہر کا بچہ ہے، پڑھ لکھ جائے گا تو محلے کا بھی نام روشن کرے گا۔ ان کی لڑکی جب میٹرک میں آئی تو انہوں نے اکبر کو اسے ٹیوشن پڑھانے پر رکھ لیا کہ اس طرح اکبر کی مالی مدد بھی ہو جائے گی۔

اکبر نے کبھی بھی اپنے ماحول کو قبول نہیں کیا۔ نسیم الدین صاحب اسے اپنی پشتینی کاروبار میں لگانا چاہتے تھے لیکن وہ سوت دیکھ کر ہی بدک جاتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ یہاں رہا تو اس کی قسمت بھی دھاگوں کی

طرح الجھ جائے گی۔ جس طرح اتنی محنت سے بنے کپڑوں پر مال داروں کا حق ہوتا ہے اسی طرح اس کی زندگی بھی دوسروں کی غلامی میں چلی جائے گی۔ وہ بڑا آدمی بننے کا خواب بچپن سے ہی دیکھتا آیا تھا اور وہ ہر قیمت پر ان خوابوں میں رنگ بھرنا چاہتا تھا۔ وہ تو وقت کا منتظر تھا کہ کب اڑان کا موقع میسر ہو اور وہ آسمان میں اڑنے لگے۔

''چائے پی لو، ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

سلمٰی کی آواز پر وہ چونکا اور اس کی جانب غور سے دیکھنے لگا۔ نہ جانے آج اسے سلمٰی کا چہرہ بدلا بدلا سا کیوں لگ رہا تھا۔ چائے سے نکلتی بھاپ کی طرح وہ بھی ہوا میں گم ہونے لگا۔

پروفیسر خان اسے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ اس کی جلد باز فطرت سے وہ بہت متفکر رہتے تھے۔ اکثر اسے سمجھاتے ہوئے کہتے:

''دیکھو اکبر..... دنیا کے پیچھے بھاگنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہاری تقدیر میں جتنا لکھا ہے اسے سے زائد نہیں ملنے والا۔''

''تو کیا ہم زندگی بھر چھوٹے ہی رہیں اور سماج کے یہ سفید پوش زندگی بھر موج مستی کرتے رہیں۔ کیا سارا سکھ وہی لوگ اپنی قسمت میں لکھا کر لائے ہیں۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہے.....''

''تو پھر ہم لوگوں کا اس طرح استحصال کیوں ہوتا ہے۔ کپڑے بننے والوں کے بچوں کے جسم پر کپڑے کیوں نہیں ہوتے؟ یہ کپڑے سفید پوش کو ہی کیوں بھلے لگتے ہیں۔ ہمارے لوگ پشت در پشت اس کاروبار سے جڑے ہیں، وہ اس سے باہر بھی نہیں نکل پاتے کہ باہر نکلنے کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے ہیں۔''

پروفیسر خان گفتگو کا رخ دوسری جانب موڑنے میں ہی عافیت سمجھتے۔ اکبر کے اندر جو آگ تھی وہ کسی کو بھی جلا کر راکھ کر سکتی تھی۔ خود اس کا اپنا وجود اس آگ میں جھلس رہا تھا۔ انہیں ڈر صرف اس بات کا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ لڑکا کوئی ایسا گل ضرور کھلا جائے گا جس کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے واقعی ایک ایسا گل کھلا دیا جس کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی تھی۔

ایک رات چپکے سے وہ پروفیسر خان کی کم سن لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ لڑکی نے بس ابھی ابھی میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ عمر یہی کوئی پندرہ سولہ کے آس پاس رہی ہوگی۔ ان کی لڑکی کو پڑھانے کے چکر میں وہ خود اس کو پڑھتا رہا اور جب پڑھتے پڑھتے اس نے پوری کتاب ہی چاٹ ڈالی تو آخری ورق پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی۔

پورے شہر میں بھونچال آ گیا۔ پروفیسر خان جیسے شریف آدمی پر جیسے پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ نسیم الدین نے ان کے قدموں میں سر رکھ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلایا لیکن اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ وہ لڑکی کو لے

کر سیدھے راجدھانی آ گیا اور اپنے ایک پرانے دوست عاصم کے یہاں پناہ ملی۔

خان صاحب نے تھانے میں رپورٹ درج کرانے سے انکار کر دیا کہ رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی لیکن لڑکی کے ماموں اس کی تلاش میں راجدھانی تک آ گئے۔ انہیں سراغ بھی ملا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خبر بھی ملی کہ لڑکی تین مہینے کے پیٹ سے ہے۔ یہ خبر سن کر خان صاحب رو پیٹ کر رہ گئے۔ لڑکی لے جا کر بھی کیا کرتے؟ کون کرتا شادی؟ اس جگ ہنسائی کے بعد مزید جگ ہنسائی؟ انہیں درد اس بات کا نہیں تھا کہ بیٹی بھاگ گئی، انہیں تو درد یہ تھا کہ وہ آستین میں سانپ پالتے رہے اور اس نے موقع ملتے ہی انہیں ڈس لیا۔ اکبر کی کمینگی کی وجہ سے پوری انسانیت سے ہی ان کا یقین اٹھ گیا تھا۔

اس پورے واقعہ کے درمیان جو سب سے زیادہ پرسکون رہا وہ اکبر تھا۔ اس نے کچا کام کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ جب اسے مکمل یقین ہو گیا کہ وہ تین مہینے کی حاملہ ہے تب ہی اسے سکون ملا اور وہ اسے بہلا پھسلا کر لمبے لمبے خواب دکھا کر لے بھاگا۔

''پاپا..... آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

وہ چونکا۔ اس کے سامنے اس کی بیٹی کھڑی تھی جس نے اس بار آئی ایس سی میں داخلہ لیا تھا۔ سامنے شکلا جی کھڑے تھے جو ایک فنکشن کے سلسلے میں اس سے ملنے آئے تھے۔

''اکبر جی، اس ڈرامے کے بارے میں آپ سے بات کرنی ہے جس کے شو کے لئے ہم لوگ فنکشن کر رہے ہیں۔''

''آپ نے سلمٰی سے بات نہیں کی؟''

''سلمٰی جی سے تو بات ہو چکی ہے، وہ ابھی شرما جی سے ڈسکس کر رہی ہیں۔ آپ نے اس سلسلہ میں کچھ کہا؟''

''ہاں..... ں.....'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے اشوک جی سے بات کر لی ہے۔ وہ اُدگھاٹن سا روہ میں ضرور آئیں گے۔''

''لیکن ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ وعدہ کر کے کبھی نہیں آتے۔'' ڈرتے ڈرتے شکلا جی نے کہا۔

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے اور پھر ان کا یہ پروگرام تو سلمٰی نے طے کیا ہے۔''

یہ سن کر شکلا جی نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ جب سلمٰی نے پروگرام طے کیا ہے تو یہ طے ہی ہوگا۔

شکلا جی تو مطمئن ہو کر چلے گئے اور وہ سوچنے لگا:

''یہ ڈرامہ والے بھی خوب ہوتے ہیں۔ اسٹیج پر کوئی اور ڈراما ہوتا ہے اور پردہ کے پیچھے کوئی اور

ڈراما کھیلا جاتا ہے۔''

اس نے ایک لمبی سانس لی۔

''اس کا نام راج نیتی ہے..... جو سامنے ہے، وہ نہیں ہے اور جو نظر نہیں آتا وہی سچ ہوتا ہے۔''

اس نے بھی کم ڈراما نہیں کیا تھا۔

لڑکی بھاگنے کو تو بھاگ آئی تھی لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اکبر اسے کہیں کا نہیں رکھے گا۔ اس نے جب ڈرتے ڈرتے عاصم کی شکایت کی تھی کہ کس طرح اس نے اس کی غیر موجودگی میں.....

''بھول جاؤ ان باتوں کو۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا۔

''کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔'' پھر اس نے بڑی گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا:

''تم فکر کیوں کرتی ہو، تمہارے پاس اب کھونے کے لئے بچا ہی کیا ہے۔''

وہ تو بھونچک رہ گئی تھی۔

''یا اللہ..... میں کیا سے کیا ہو گئی.....'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی لیکن اس کے آنسو دیکھنے کے لئے اکبر اس کے سامنے نہیں تھا۔

اکبر نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف سامنے دیکھنے کا عادی تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات سیاست کے گلیارے کے ایک ماہر کھلاڑی اشوک رائے جی سے ہو گئی۔ ان کے دوست انہیں پگا بھگت کہتے تھے۔ رائے جی باہر سے معصوم لگتے لیکن اندر سے بہت ماہر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے اکبر کو ایک ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ لمبی ریس کا گھوڑا ثابت ہو سکتا ہے۔

کاہر اپنی کامیابی کے لئے کسی نہ کسی زینے کا استعمال کرتا تھا۔ پہلا زینہ تو خان صاحب ثابت ہوئے تھے جن کی چوکھٹ ہی اکھاڑ آیا تھا اکبر۔ اب رائے جی اس کی ترقی کے لئے دوسرا زینہ تھے۔ رائے جی نے اس کی دھار میں اور شان چڑھایا اور اسے کامیابی کی راہ کے داؤ پیچ سکھائے۔

چار پانچ ماہ بیت گئے، اسی دوران وہ ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا۔ سلمٰی نے جب پہلی بار اپنی بیٹی کا منھ دیکھا تو وہ اپنے سارے دکھ درد بھول گئی۔ اس کے سامنے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے کوکو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

سلمٰی ماں بن کر ایک مکمل عورت ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں اس کے چہرے میں ایک عجیب سا نکھار بھی پیدا ہو گیا۔ اس تبدیلی کو اکبر نے بھی محسوس کیا پھر اس نے اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے

سلمٰی کو اور رنگین بنانا شروع کر دیا۔ ادھر سلمٰی کا رنگ اترتا رہا اور اُدھر اس کے خواب، زمین پر اترنے لگے۔ جہاں بھی اس کا کام اٹکتا وہ سلمٰی کی سیڑھی لگا دیتا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ:

''جس کے پاس خوبصورت بیوی سا زینہ ہو وہ دنیا کی کوئی بھی بلندی طے کر سکتا ہے۔''

وہ اس زینہ کے سہارے زندگی کی ایک سے ایک کامیابی حاصل کرتا رہا۔ اشوک کمار رائے بھی سلمٰی پر بہت مہربان تھے۔ پھر کیا تھا۔ اکبر نے ایم اے کیا، نوکری ملنی مشکل تھی اس لئے اس نے ایک این جی او کا رجسٹریشن کروا لیا۔ اب اس کے ذریعہ سرکاری اعانت حاصل کرتا اور مستی سے زندگی گذارتا۔ ایک این جی او اس نے سلمٰی کے نام سے بھی رجسٹر کروایا۔ اب یہ دونوں ادارے اس کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے کافی تھے۔

اب وہ منزل کی تلاش میں دوڑنے لگا۔

اس کے اندر کانٹوں کا بن اُگ آیا تھا جس سے وہ اندر ہی اندر لہولہان ہو رہا تھا۔ اسے سماج کے اعلیٰ طبقے کے افراد سے شدید نفرت تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ انہیں لوگوں نے اس کے طبقے کا استحصال کیا ہے۔ انہیں زمانے سے دبا کچلا سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کی اس منفی سوچ میں دم تھا، سچائی تھی لیکن اس کا رویہ غلط تھا۔ وہ اعلیٰ سماج کے ہر فرد سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ حالات بدلنا نہیں بلکہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا تھا کہ جو خود اس کے لئے گھاتک ثابت ہو رہے تھے۔

وہ ایک عجیب سی احساس کمتری کا شکار تھا۔ محفلوں میں کسی بات پر بحث کرنا تو دور کی بات وہ لوگوں سے آنکھ ملا کر گفتگو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بات منوانے کی صلاحیت بھی اس میں نہیں تھی۔ وہ صرف دوسروں کو گالیاں دے سکتا تھا۔ ان کا مذاق اڑا سکتا تھا اور اس کی منفی سوچ جس ڈگر پر اسے ڈالتی وہ چلنے لگتا۔ یہ اس کی منفی سوچ ہی تھی کہ اس نے اپنے سب سے بڑے محسن پروفیسر خان کے ساتھ سب سے بڑا دھوکہ کیا تھا۔ دراصل اس نے اونچے طبقے سے انتقام لیا تھا۔ کس بات کا؟ یہ تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

سلمٰی کو اس نے واقعی ایک زینہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ شروع شروع میں سلمٰی کو یہ سب ناقابل برداشت لگا، پھر قدرے اَٹ پٹا اور اب اسے ایک عجیب سا لطف بھی آنے لگا تھا اور کبھی کبھی تو وہ خود ہی بڑھ کر اس کی ترقی کے لئے زینہ بن جاتی تھی۔

ایک بار اکبر نے محسوس کیا کہ جب سے رائے جی کی مہربانیاں بڑھی ہیں سلمٰی پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اس نے اشارتاً یہ بات سلمٰی سے کہہ بھی دی لیکن سلمٰی نے بہت واضح الفاظ میں جواب دیا تھا:

''دیکھو اکبر، میں تو نسیم سحری کی طرح معصوم تھی۔ تم نے میری معصومیت کی ردا کو خود ہی تار تار کر دیا۔ اب تو تم نے مجھے باوسوم بنا دیا ہے اور میں اس ڈگر پر چل پڑی۔ اس ڈگر پر میں اپنی مرضی سے نہیں آئی

بلکہ تم نے اپنے فائدے کے لئے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ میں جب رکی تو تم نے دھکے مار کر آگے بڑھایا اور جب کہ میں اس ڈگر پر بڑھ آئی ہوں تو اس کی بھی کچھ اپنی پرپرائیں ہیں، کچھ سیمائیں ہیں اور کچھ مجبوریاں ہیں، اس لئے میں اس کا الٹگھن کیسے کر سکتی ہوں۔ تمہارے آکروش کرنے سے کیا ہوگا.....؟''

وہ چپ ہو رہا۔ اپنے کئے کا آخر علاج بھی کیا تھا۔

وہ جب سے ہندی ڈرامے میں کام کرنے لگی تھی تب سے اس کی گفتگو میں ہندی الفاظ کثرت سے در آئے تھے۔ وہ بات بات میں آکروش، سنگھرش، نپنسکتا، جیسے الفاظ کا استعمال کرتی تھی۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کون سی گنتھی الجھی ہوئی تھی کہ وہ ایسے الفاظ کا استعمال بات بات میں کرنے لگتی۔

پورے شہر میں اس کے گھر کا نام ہی ''زینہ گھر'' پڑ گیا تھا۔ وہ جدھر سے بھی گذرتا لوگ چپکے سے کہتے:

''وہ دیکھو، زینے والا جا رہا ہے۔''

یہ سب سن کر اس کے اندر کانٹے کا بن اور پھیل جاتا اور اس کے جی میں آتا کہ وہ سارے زمانے کو لہولہان کر دے۔

اسی دوران بنگال میں ایک یوتھ فیسٹیول کا انعقاد ہوا۔ اس میں سلمیٰ کو بطور خاص مدعو کیا گیا اور دل رکھنے کے لئے دعوت نامے میں اس کا نام بھی جوڑ دیا گیا۔ سلمیٰ پہلی بار باہر نکلی تھی۔ بنگال کی فضا اس کے لئے نئی تھی۔ وہاں کا کھلا پن اسے بہت بھایا۔ اسی فیسٹیول میں اس کی ملاقات دلیپ گانگولی سے ہوگئی۔ کیا بانکا جوان تھا اور اس کی آواز میں تو ایک جادو تھا۔ سلمیٰ گانگولی کی طرف شدت سے کھنچتی چلی گئی۔ اسے اکبر کے ساتھ دوسروں نے بھی محسوس کیا، خصوصاً شرما جی جو سلمیٰ کے ساتھ ہی آئے تھے۔ انہیں لگا کہ اب سلمیٰ ان کے ہاتھ سے بھی پھسل جائے گی۔ اس لئے انہوں نے اکبر کا کان بھر دیا۔

اکبر نے اسی رات ہوٹل کے کمرے میں سلمیٰ کو خوب کھری کھری سنائی۔ سلمیٰ نے بھی تڑ کی بڑ کی جواب دیتے ہوئے چبا چبا کر الفاظ ادا کئے۔

''اکبر علی صاحب..... آپ کو یہ یاد ہے کہ آپ میرے پتی پرمیشور ہیں، لیکن آپ نے آج تک مجھے ایک پتنی کا درجہ نہیں دیا۔ صرف بچہ پیدا کر دینے سے میں آپ کی پتنی نہیں ہوگئی۔''

وہ رکی اور اس کی جانب نفرت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی.....

''آپ اپنے فائدے کے لئے مجھے دوسروں کے پہلو میں بھیجتے رہے۔ یہ آپ کی نپنسکتا نہیں تو اور کیا تھی۔ میں جب آپ کی مرضی سے یہ سب کر سکتی ہوں تو پھر جب اپنی مرضی سے کر رہی ہوں تو آپ کو آکروش کیوں ہو رہا ہے؟ یہاں آپ اصول پرست ہو گئے؟ نہ جانے آپ کس اصول کی بات کرتے

ہیں جس نے زندگی بھر صرف نفرت کرنا سکھایا ہو وہ مجھے محبت کا درس دے رہا ہے؟''

''چپ رہو سلمیٰ..... تم میرے صبر کا امتحان مت لو اور نہ ہی میری مرضی میں دخل دو۔'' وہ چیخا

''میں دخل کہاں دے رہی ہوں۔ دخل تو آپ دے رہے ہیں۔ نو سو چوہے کھلا کر آپ بلی کو حج پر کیوں بھیجنا چاہتے ہیں؟''

اس رات دونوں میں خوب بک جھک ہوتی رہی۔ سلمیٰ نے بھی عاجز آ کر ایک ساتھ نیند کی ڈھیر ساری گولیاں نگل لی لیکن ایسے لوگوں کو اتنی آسانی سے موت کب ملتی ہے۔ جو اس طرح پل پل مرنا سیکھ جاتے ہیں ان کی زندگی بہت لمبی ہو جاتی ہے۔

سلمیٰ کو بھی بچا لیا گیا اور اکبر میاں کی جان میں جان آئی کیونکہ ایک جھٹکے میں انہیں لگا تھا کہ جس زینے پر وہ کھڑے تھے کسی نے اچانک پاؤں کے نیچے سے کھینچ لی ہو۔

بنگال سے واپسی کے بعد سلمیٰ میں ایک خاص تبدیلی محسوس کی جانے لگی تھی۔ وہ قدرے مجبور ہو گئی تھی۔ اس کا باہر نکلنا بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ شرما جی بھی آتے تو وہ ملنے سے انکار کر دیتی۔ اپنی جوانی دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے بعد بھی اس کا دم خم باقی تھا۔ اس کی بیٹی مقامی کالج میں پڑھتی تھی اور بیٹا کسی دوسرے شہر میں تعلیم پا رہا تھا۔ اشوک کمار رائے جی نے سی ایم کوٹا سے اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں کروا دیا تھا۔ اس کی پوری کوشش رہی تھی کہ وہ اپنا سایہ بچوں پر نہ پڑنے دے۔

بنگال سے آنے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت بیٹی کے ساتھ گذرتا جو آئی ایس سی کا امتحان دینے والی تھی اور رائے جی نے وعدہ کیا تھا کہ اس بار بیٹی کا بھی داخلہ کوٹا سے کروا دیں گے۔ اکبر سے اس کی رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ اکبر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ سلمیٰ کے دل میں کون سی گانٹھ بیٹھ گئی ہے جو کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔

اس نے سوچا وقت کے ساتھ سب کا کس بل نکل جاتا ہے۔ سلمیٰ بھی ہفتہ عشرہ میں نارمل ہو جائے گی۔ سلمیٰ کی مدد سے اس ایم آئی جی فلیٹ تو خرید ہی لیا تھا۔ اب ایک کار بھی آ گئی تھی کیونکہ اب کافی بڑے لوگوں میں اس کی پہنچ ہونے لگی تھی اور مزید ترقی کے لئے اس کے پاس جو زینہ تھا ابھی اس کے امکانات روشن تھے۔

دونوں کے درمیان ایک سرد سی جنگ جاری تھی اور ادھر ایک بڑے نیتا نے اسے ایک ادارے کا چیئرمین بنوانے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا تھا:

''آپ تو مصروف رہتے ہیں۔ آپ سلمیٰ جی کو کل شام بھیج دیجئے گا۔ میں انہیں سارا..... سمجھا دوں گا اور پھر انہیں بھی تو مہیلا آیوگ کا سدسیہ بنانا ہے۔ چیئرمین بننے کے بعد تو آپ کا ایم ایل سی بننا

طے ہے اکبر جی۔ اب تو آپ کے راج ہی راج ہیں۔''

گھر لوٹ کر اس نے سارا پلان سلمیٰ کو سمجھا دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ رات بھر رنگین..... دیکھتا رہا۔ کبھی وہ خود کو الل بتی لگی کار میں گھومتا ہوا دیکھتا اور کبھی ایوان بالا میں اپوزیشن کو گالیاں دیتا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن وزارت کی کرسی بھی حاصل کر لے گا۔

صبح سویرے وہ بیدار ہوا تو بغل کا بستر خالی تھا۔ سلمیٰ نے اس پر ایک سلپ چھوڑا تھا:

''اکبر علی صاحب! آپ نے مجھے ہمیشہ زینے کی طرح استعمال کیا اور میں آپ کی ہر بات مانتی رہی۔ اپنی دنیا کو بے رنگ کر کے آپ کی دنیا رنگین بناتی رہی۔ اب تو میں ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہوں جس پر واپسی کے نشان ہوتے ہیں تو ایسی حالت میں جب واپسی ممکن ہی نہیں تو میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب یہی سب کرنا ہے تو پھر اپنے لئے ہی کیوں نہ کروں؟..... زندگی بھر میری آب اتری اور آب دار آپ ہوتے گئے..... آپ کو جو بننا تھا آپ بن چکے، اب جو بننا ہے وہ میں بنوں گی۔ چاہے چیئرمین ہو یا ایوان بالا کی ممبری..... آیوگ کی ممبری ہو یا وزارت کی کرسی..... آپ کی مرضی سے بہت جی چکی، اب اپنی مرضی سے جینے کے لئے میں آپ کا یہ گھر چھوڑ رہی ہوں.....''

اس کے ہاتھ میں کاغذ کا سلپ تھر تھرانے لگا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی سرک گئی۔ خوابوں کی فلک بوس عمارت آن واحد میں زمیں بوس ہو گئی۔ اس سے قبل کہ اس کی آنکھوں میں مکمل اندھیرا چھاتا، دروازے سے آواز آئی:

''پاپا! چائے.....''

اس کی بیٹی دو کپ چائے لئے پوچھ رہی تھی:

''امی کدھر گئی ہیں پاپا.....؟

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا دروازے سے ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اس کے ہاتھوں می تھر تھراتے کاغذ کو اڑا کر کھڑکی سے باہر لے گیا۔ اس نے گھور کر اپنی جوان بیٹی کو دیکھا اور اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی اور اس کی آنکھوں میں پھیلتا ہوا اندھیرا غائب ہونے لگا.....!

A/103 Second Floor
Ali Nagar Near Gulshan Plaza
P.o .Anisabaad Patna 800002 (Bihar)

- **تجزیہ**
- **ڈاکٹر منظر اعجاز**

لمبی ریس کا گھوڑا۔ ایک تجزیہ

مشتاق احمد نوری ایک لمبے عرصے سے افسانے لکھ رہے ہیں اور ملک و بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں ان کے افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے ''بیسویں صدی'' کے مزاج کے افسانے بھی لکھے اور اس میں بھی ان کے کئی افسانے شائع ہوئے۔ حقیقت پسندی اور توہم پرستی سے بھی موضوعاتی سطح پر ان کا تخلیقی سرو کار رہا ہے۔ ان کے تین افسانوی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ وہ کسی مخصوص تحریکی میلان اور تخلیقی رجحان کے افسانہ نگار نہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کو بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی مسائل کی مختلف زاویے سے عکاسیاں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں تنوع بھی ہے اور رنگا رنگی و پوقلمونی بھی، اسی لئے یہاں بیزار کن یکسانیت بار نہیں پاتی۔

مشتاق احمد نوری افسانہ نگار ہی نہیں، افسانوں کے تنہیم کار اور تجزیہ نگار بھی ہیں۔ وہ اپنے افسانوی کرداروں کا تجزیہ بھی مختلف زاویے سے کرتے ہیں۔ یہ کردار بھی گرد و پیش کے سماج اور ماحول سے اخذ کئے جاتے ہیں، اس لئے بالعموم کردار بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور واقعات و واردات میں بھی کوئی انوکھا پن نہیں ہوتا، اس کے باوجود واقعات و واردات کی پیوند کاری و ہم کاری یا ترتیب سے جو پلاٹ تیار ہوتا ہے، وہ گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ زبان اور بیان کا اسلوب بھی متوجہ کرتا ہے۔ میں نے ادھر ان کے کئی افسانے دیکھے مثلاً ''لمبے قد کا بونا'' اور ''لمبی ریس کا گھوڑا'' وغیرہ۔ اس طرح کے ایمائی، استعاراتی اور علامتی طرز اظہار میں اسلوب کی سطح پر نشتریت اور تیغ زنی و تیرافگنی کی بھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، مزید یہ کہ نمک پاشی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ''لمبی ریس کا گھوڑا'' سے بھی یہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ افسانہ ''نئی حقیقت پسندی'' کا ترجمان ہے اور نئی حقیقت پسندی جیسا کہ ہم جانتے ہیں حقیقت پسندی کے مختلف رجحانات سے مرکب ہے۔ یہ سماجی حقیقت پسندی، معاشی حقیقت پسندی، نفسیاتی اور جنسی حقیقت پسندی اور تہذیبی و اخلاقی حقیقت پسندی کے رنگا رنگ دھاگوں سے بنی ہوئی ہے۔ اس میں انسانی

رویوں اور فکر ونظر کے مختلف شیڈس بیک وقت نظر آتے ہیں۔

بہر حال مشتاق احمد نوری نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، وہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے، لیکن اس کو برتنے میں مشتاق احمد نوری کی جو فنکاری دکھائی دیتی ہے، وہ قابل اعتنا اور لائق توجہ ہے اور اسی زاویے سے نوری کا انفراد و امتیاز روشن ہوتا ہے۔

استحصال و انتقام کا جذبہ مختلف قصے کہانیوں میں، مختلف انداز و اسلوب میں ابھرتا رہا ہے۔ ان کی نوعیت وصورت اور کیفیت وکمیت بدلتی رہی ہے۔ پریم چند کے ''کفن'' میں گھیسو اور مادھو، بدھیا کے کفن کے لئے چندہ کا پیسہ کھا پی کر برابر کر دیتے ہیں۔ مادھو اندیشے میں مبتلا ہے کہ سارے پیسے کھانے پینے میں نکل گئے تو کفن کہاں سے آئے گا، لیکن گھیسو کو یقین ہے کہ کفن کا انتظام ہر حال میں ہو جائے گا۔ جن لوگوں نے کفن کے لئے پیسے دئے ہیں، پھر وہی لوگ دیں گے اور اگر نہیں دیں گے تو خود خریدیں گے اور اچھا کفن خریدیں گے۔ مادھو کی یہ سوچ، اس کا یہ رویہ اس سماج کی اجتماعی نفسیات، اس کے جذبات اور اس کی روایت کے پیش نظر استحصال کا پہلو رکھتا ہے۔ پشتوں سے استحصال کی چکی میں پستے والا گویا آج اس سماج سے انتقام لے رہا ہے، لیکن استحصال و انتقام کی صورت و نوعیت اور کیفیت وکمیت مختلف ہے۔

جیلانی بانو کے ناول ''ایوانِ غزل'' میں چاند کا سگا ماموں راشد اپنی معاشی ترقی کی اونچائیوں کو چھونے کے لئے اپنی سگی بھانجی چاند کو زینہ بنا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ نواب واحد حسین کی نواسی غزل کا باپ ہمایوں علی شاہ اپنا خاندانی اور موروثی خانقاہی اقتدار چھن جانے کے بعد ڈرامے میں ہیرو بن کے طور پر غزل کے کام کرنے پر معترض نہیں ہوتا، یہاں تک کہ اپنی بیٹی کی فیس طے کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ دو قدم آگے بڑھ کر خود ہی اٹھا لیتا ہے، لیکن یہاں مفلسی و ناداری غیرت کا گلا گھونٹتی نظر آتی ہے۔ احساس کمتری یہاں بھی ہے، لیکن اس کی نوعیت و کیفیت مختلف ہے۔ ''لمبی ریس کا گھوڑا'' میں اکبر احساس کمتری کے علاوہ ہوس پرستی کا بھی شکار ہے اور یہ ہوس پرستی بھی اکہری نہیں ہے۔

اس افسانے میں اکبر کی سیرت و شخصیت میں مختلف النوع عناصر کی کارفرمائی ہے جس سے وہ منفرد کردار بن جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس میں کمتری کا احساس اس وجہ سے بیدار ہوتا ہے کہ وہ بنکروں کے خاندان کا فرد ہے۔ پھر یہ بھی کہ بیشتی طور پر اس کا خاندان استحصال کا شکار ہوتا رہا ہے۔ اس کا باپ بھی احساس کمتری کا شکار رہا تھا، اسی لئے اس نے اس کا نام اکبر کی بجائے اصغر رکھ دیا، اس لئے اسے باپ کے دئے ہوئے اس نام سے بھی نفرت ہو جاتی ہے اور وہ خود ساختہ نام اکبر اختیار کر لیتا ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو اپنا نطفہ بھی تبدیل کر لیتا، لیکن یہ اس کے

اختیار میں نہیں، البتہ اونچے خاندان کے لوگوں سے وہ انتقام لے سکتا ہے۔ اسی جذبۂ انتقام کے تحت وہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو پروفیسر خان اور ان کی بیٹی۔ سلمٰی زد میں آجاتے ہیں۔

اکبر ایک ذہین طالب علم تھا، اس کی ذہانت سے پروفیسر خان متاثر تھے۔ ذہین طلبہ کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ان کے معلمانہ مزاج کا خاصہ تھی، اس لئے تعلیم و تدریس کے سلسلے میں وہ اکبر کے معاون و مددگار تھے۔ اکبر کی مالی پوزیشن بھی بہتر نہ تھی چنانچہ اسے مالی منفعت پہنچانے کی غرض سے انہوں نے اپنی بیٹی سلمٰی کا اسے ٹیوٹر مقرر کر لیا۔ سلمٰی میٹرک کی طالبہ تھی۔ اس دوران انہوں نے اونچی ذات والوں کے تئیں اکبر کی نفرت و حقارت ہی کو محسوس نہیں کیا بلکہ انہیں اس کے اندر انتقامی جذبے کی آنچ بھی محسوس ہوئی، جس کی وجہ سے وہ متفکر اور متردد بھی رہنے لگے، لیکن اکبر کے ساتھ ان کے پرخلوص تعاون میں کمی نہیں آئی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اس کا صلہ انہیں اکبر سے ایسا ملے گا جو تہذیب و اخلاق اور اقدار کے شیرازے کو منتشر کر کے رکھ دے گا، لیکن انہیں ڈر اس بات کا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ لڑکا ایسا گل ضرور کھلائے گا جس کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی:

> ''اور ایسا ہی ہوا، اس نے واقعی ایسا گل کھلایا جس کی توقع کسی اور سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک رات چپکے سے وہ پروفیسر خان کی لڑکی کو لے کر بھاگ گیا۔ لڑکی نے بس ابھی ابھی میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ عمر یہی کوئی پندرہ سولہ کے آس پاس رہی ہوگی۔ ان کی لڑکی کو پڑھانے کے چکر میں وہ خود اس کو پڑھتا رہا اور جب پڑھتے پڑھتے اس نے پوری کتاب ہی چاٹ ڈالی تو آخری ورق پلٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی۔''

ایمائی طرز اظہار سے پیدا ہونے والی پرکاری اور تہدار معنویت، اسلوب کی ندرت اور نشتریت، بلاغت کے درجھی وا کرتی ہے اور فنکاری کے معیار کا بھی پتہ دیتی ہے۔

بہر حال کہانی آگے بڑھتی ہے اور ایک روایتی ماحول اور خاص طور سے مسلم معاشرے میں ایسے باغیانہ رویے پر جو ردِعمل ظاہر ہو سکتا ہے، وہ ہوتا ہے یعنی ''پورے شہر میں بھونچال آ گیا'' لیکن ایسے مواقع پر طبقہ اشرافیہ جس بزدلی کا شکار ہو جاتا ہے، وہی کیفیت پروفیسر خان کے کردار میں ابھرتی ہے۔ انہوں نے ''تھانے میں رپورٹ درج کرانے سے انکار کر دیا کہ رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' لیکن لڑکی کے ماموں لڑکی کی تلاش میں راجدھانی پہنچ جاتے ہیں اور انہیں اس کا سراغ مل جاتا ہے ''لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خبر بھی ملی کہ لڑکی تین مہینے کے پیٹ سے ہے'' اور ''یہ خبر سن کر خان صاحب روپیٹ کر رہ گئے۔ لڑکی لے جا کر بھی کیا کرتے؟ کون کرتا شادی؟ اس جگ ہنسائی کے بعد مزید جگ ہنسائی۔ انہیں درد اس

بات کا نہیں تھا کہ بیٹی بھاگ گئی، ''انہیں تو درد یہ تھا کہ وہ آستین میں سانپ پالتے رہے اور اس نے موقع ملتے ہی ڈس لیا۔ اکبر کی کمینگی کی وجہ سے پوری انسانیت ہی سے ان کا یقین اٹھ گیا تھا۔''

لڑکی کی عمر پندرہ سولہ ہونے کی وجہ سے قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی تھی اور اکبر کو ریپ کیس کا ملزم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا تھا، اگر اسے بھگائے جانے یا اغوا کئے جانے کی رپورٹ تھانے میں درج کرائی گئی ہوتی، لیکن جگ ہنسائی کا ڈر جو پروفیسر خان کے دل میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے یہ نہ ہونے دیا اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو کہانی کا ڈراپ سین کوٹ کچہری میں ہی ہو جاتا، پھر وہ بات بھی نہ بنتی جو افسانہ نگار کا اصل مقصود تھی۔ نوری نے بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پروفیسر خان کے دل میں جگ ہنسائی کا ڈر بٹھلا کر تھانہ پولیس، کوٹ کچہری اور کیس مقدمہ کو کہانی کی ارتقائی سمت و رفتار میں خلل ڈالنے سے روک دیا ہے۔ علاوہ ازیں انفرادی اور اجتماعی معاشرتی میلان کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ ان کے واقعیت شعارانہ شعور کا عکاس ہے۔ مزید یہ کہ انہوں نے جو مقامی بولیوں اور محاوروں کو کھپایا ہے، اس سے لفظوں کے برتاؤ کا ہنرمندانہ شعور بھی پوری طرح واضح ہے۔ بیانیہ کا حسن بھی اپنی نکھری ہوئی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ماجرا نگاری کا انداز آگے چل کر ہوتا ہے جب اس کی بیٹی اسے مخاطب کرتی ہے:

> ''پاپا آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

یہاں پتہ چلتا ہے کہ کہانی فلیش بیک کی تکنیک میں چل رہی تھی اور اس کی نوعیت پس منظر کی تھی۔ اصل قصے کا آغاز شکلا جی کی آمد سے ہوتا ہے۔ اکبر اور شکلا جی کے مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلمٰی ڈراما کے اسٹیج سے متعلق ہے۔ فنکشنس ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی شرما جی سے پروگرام کے سلسلے میں سلمٰی بات کر رہی ہوتی ہے، کبھی اشوک جی کے ساتھ ڈسکشن کا مرحلہ طے ہوتا ہے۔ کبھی اوگھاٹن سمارو ہ کے لئے کسی اہم شخص یا شخصیت سے بات طے ہوتی ہے، کبھی شک پیدا ہوتا ہے کہ اوگھاٹن کرتا آئیں کہ نہ آئیں، لیکن اکبر ان اندیشوں کو اس یقین کے بل بوتے پر رد کر دیتا ہے کہ ان کا پروگرام سلمٰی نے طے کیا ہے، اس لئے وہ ضرور آئیں گے۔ اس سے سلمٰی کی حیثیت و اہمیت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اب وہ بھی وی آئی پی کی صف میں کھڑی ہے اور وہ ہر اکردار ادا کرتی ہے۔ اکبر کے جواب سے مطمئن ہو کر شکلا جی چلے جاتے ہیں تو اکبر خود ہی سوچنے لگتا ہے:

> ''یہ ڈرامہ والے بھی خوب ہوتے ہیں۔ اسٹیج پر کوئی اور ڈراما ہوتا ہے اور پردہ کے پیچھے کوئی اور ڈراما کھیلا جاتا ہے۔'' اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اسی کا نام راجنیتی ہے..... جو سامنے ہے وہ نہیں ہے اور جو نظر نہیں آتا وہی سچ ہوتا ہے۔''

یہاں ایک ہی حمام میں فرد، معاشرہ اور سیاست تک کو ننگا دکھایا گیا ہے۔ یعنی ایک ہی ڈراما کئی معنوی جہتوں اور پہلوؤں کو روشن کرتا ہے اور اس کی ہر جہت یا اس کا ہر پہلو گہنا ؤ ناد کھائی دیتا ہے، لیکن اس کھیل میں اکبر کا چہرہ سب سے زیادہ گھناؤنا اور مکروہ نظر آتا ہے، جس کا احساس خود سلمٰی کو بھی ہو جاتا ہے اور یہ احساس ردِعمل کے طور پر شدت کے ساتھ ابھرتا ہے:

> ''اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اکبر اسے کہیں کا بھی نہیں رکھے گا۔ اس نے جب ڈرتے ڈرتے عاصم کی شکایت کی تھی کہ کس طرح اس نے اس کی غیر موجودگی میں.....''

تو اکبر نے اس پر اپنے ردِعمل کا اظہار اس طرح کیا تھا:

> ''بھول جاؤ ان باتوں کو۔ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ پھر اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا: 'تم فکر کیوں کرتی ہو، تمہارے پاس اب کھونے کے لئے بچا ہی کیا ہے۔''

اکبر کے خیال میں سلمٰی کے پاس کھونے کے لئے بھلے ہی کچھ نہ بچا ہو، لیکن نوری نے عاصم کے متعلق سلمٰی کے جملے کو ادھورا چھوڑ کر ایک طرف تو یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ اس میں ابھی نسوانی حیا باقی ہے اور دوسری طرف انہیں قاری کی ذہانت پر بھروسا ہے اور اپنے پیرایہ اظہار و ابلاغ پر بھی اعتماد ہے کہ یہ ادھورا جملہ بھی پورے معنی بلکہ اس کی گہرائی تک قاری کو اتار دے گا۔ اگر غلطی سے اس جملے کو پورا کر دیا جاتا تو برہنہ گفتاری کا عیب فنکاری کے حسن کو زائل کر دیتا۔ اس کے ساتھ ہی اکبر کے ردِعمل سے فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ مکالمہ جس شخص کے لئے تھا، وہ اس ادھورے جملے کا پورا پورا مفہوم سمجھ گیا۔

مکالمہ یا مخاطبہ دراصل خطیب اور مخاطب کے درمیان کا معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں اشارے، کنائے استفسار، اختصار اور تفصیل سب کی ضرورت تناسب اور توازن کے ساتھ موقع و محل کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اسلوب بیان کی اہمیت اور اس کا حسن ان ہی باتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لذت بیان اور لطف زبان اپنی تاثیر کھو دے۔ اکبر چونکہ سلمٰی کا شوہر ہے اور دونوں ایک دوسرے کے مزاج، میلان اور عملی سرگرمیوں کے منظر و پس منظر سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے سلمٰی کا زیر بحث جملے کو ادھورا چھوڑنا ہی بیان کے اسلوب کو لذت تاثیر سے روشناس کراتا ہے اور بیان کی قوت کو زوردار بناتا ہے۔ اگر اس جملے کو پورا کر دیا جاتا تو لفظوں کے استعمال کی زیادتی فنی سلیقے کے بھی خلاف ہوتی۔

ان نکات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ یہاں نوری نے مکالمہ نگاری میں فنی سلیقہ شعاری کا مظاہرہ کیا ہے اور کردار سازی اور کردار نگاری میں کرداروں کی مجرد شخصیت کی تجسیم فنی مہارت کے ساتھ کی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، اس افسانے میں فلیش بیک کی تکنیک کا بھی سہارا لیا گیا ہے اور اس سے ڈرامائیت کے ساتھ ساتھ تجسس اور تحیر کے عناصر بھی بروئے کار لائے گئے ہیں۔

اکبر کے رویے سے سلمیٰ جس کرب و اذیت میں مبتلا ہوتی ہے، وہ غیر فطری نہیں۔ اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اکبر کی نظر میں اس کی حیثیت و اہمیت کیا رہ گئی ہے۔ یہ احساس جب شدت اختیار کرتا ہے تو یہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے:

> ''یا اللہ..... میں کیا سے کیا ہو گئی..... وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی، لیکن اس کے آنسو دیکھنے کے لئے اکبر اس کے سامنے نہیں تھا۔''

فنکار کے ذہن میں جو کردار ہوتا ہے، اس کو وہ اپنے آئینہ ادراک میں الٹ پلٹ کر دیکھتا اور پرکھتا ہے کہ وہ اس کے تصور و تخیل یا فکر کی ترسیل میں کس حد تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے فنکار فطرت شناس ہوتا ہے۔ اگر اس افسانے میں کرداروں کے رویے، عمل اور ردعمل پر نظر رکھی جائے تو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ نوری نے اکبر اور سلمیٰ کی فطرت شناسی کا ہی ثبوت فراہم نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے کرداروں کی بھی تحلیل نفسی کسی حد تک کامیابی کے ساتھ کی ہے۔

اس افسانے کا بیانیہ طول طویل اور پر جھول نہیں۔ اس میں رعایت لفظی سے بھی کام لیا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں تو تنبیہی پیرایہ بیان بھی اختیار کیا گیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے یہ طریقہ کار غیر ضروری نہیں، لیکن بعض عبارتوں میں یہ صرف غیر ضروری ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ جامعیت یا Compactness میں خلل ڈالتا ہے۔ مثلاً:

> ''اکبر صرف سامنے دیکھنے کا عادی تھا۔ اسی دوران اس کی ملاقات سیاست کے گلیارے کے ایک ماہر کھلاڑی اشوک کمار رائے جی سے ہو گئی۔ ان کے دوست انہیں بگا بھگت کہتے تھے۔ رائے جی باہر سے بہت معصوم لگتے، لیکن اندر سے ماہر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے اکبر کو ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ یہ لمبی ریس کا گھوڑا ثابت ہو سکتا ہے۔''

یہاں ''بگا بھگت'' میں مضمر معنی و مفہوم کی وضاحت یعنی ''رائے جی باہر سے بہت معصوم لگتے، لیکن اندر سے ماہر کھلاڑی تھے۔'' غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہوتا دراصل یہ ہے کہ بعض الفاظ،

اصطلاحات یا محاورات جو فنکار کے مزاج و مذاق سے ہم آہنگ ہوتے ہیں، کبھی کبھی وہ اس کی کمزوری بن جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی کمزوری نے ''ماہر کھلاڑی'' کو عبارت آرائی میں کھپانے کی مجبوری پیدا کر دی، ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اس افسانے میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔ زیادہ تر چست فقرے اور برمحل جملے استعمال کئے گئے ہیں۔ روزمرہ اور محاورہ کا استعمال حالات و واقعات کی مناسبت سے خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے واقعیت شعاری کا پہلو بھی مترشح ہوتا ہے۔ کہیں کہیں زبان و بیان کی سطح پر پھسلن کی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس پیش نظر رکھا جا سکتا ہے:

> ''اکبر اپنی کامیابی کے لئے کسی نہ کسی زینے کا استعمال کرتا تھا۔ پہلا زینہ تو خان صاحب ثابت ہوئے تھے جن کی چوکھٹ ہی اکھاڑ آیا تھا اکبر۔ اب رائے جی اس کی ترقی کے لئے دوسرا زینہ تھے۔ رائے جی نے اس کی دھار میں اور سان چڑھایا اور اسے کامیابی کے داؤ پیچ سکھائے۔''

مجھے اس عبارت میں جہاں کوئی خلا محسوس ہوتا ہے یا کوئی کمی نظر آتی ہے، اس کو دور کرنے کی میں اپنی سی کوشش کروں تو یوں کر سکتا ہوں:

- ☆ پہلا زینہ تو خان صاحب ہی ثابت ہوئے تھے جن کی چوکھٹ ہی اکھاڑ لایا تھا اکبر۔
- ☆ رائے جی نے اس کی دھار پر اور سان چڑھایا۔

ایک دوسرا اقتباس بھی دیکھیں:

> ''چار پانچ ماہ بیت گئے، اسی دوران وہ ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا۔ سلمیٰ نے جب پہلی بار اپنی بیٹی کا منھ دیکھا تو وہ اپنے سارے دکھ درد بھول گئی، اس کے سامنے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ سلمیٰ ماں بن کر ایک مکمل عورت بن گئی تھی۔ کچھ دنوں میں اس کے چہرے میں ایک عجیب سا نکھار بھی پیدا ہو گیا۔ اس تبدیلی کو اکبر نے بھی محسوس کیا، پھر اس نے اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے سلمیٰ کو اور رنگین بنانا شروع کر دیا۔ ادھر سلمیٰ کا رنگ اتر تا رہا اور ادھر اس کے خواب سرزمین پر اترنے لگے۔''

پہلے اقتباس کا پہلا جملہ ''چار پانچ ماہ بیت گئے۔'' توجہ طلب ہے، اس جملے کے لفظی ماحول میں لفظ ''ماہ'' اجنبی یا غریب سا لگتا ہے۔ میرے خیال میں ''ماہ'' کی بجائے ''مہینے'' زیادہ مناسب ہوتا۔ دوسرے

اقتباس میں ''چہرے میں نکھار'' کی بجائے ''چہرے پر نکھار''، ''ادھراس کے خواب سرزمین پراترنے لگے۔'' کی بجائے ''ادھراس کے خواب میں رنگ بھرنے لگا'' یا ''ادھراس کے خوابوں میں رنگ بھرتے گئے۔''

بہرحال نوری رعایت لفظی سے بھی کام لیتے ہیں اوراس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ اکبر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''جہاں بھی اس کا کام اٹکتاوہ سلمٰی کی سیڑھی لگادیتا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ 'جس کے پاس خوبصورت بیوی سازینہ ہووہ دنیا کی کوئی بھی بلندی طے کرسکتا ہے۔ وہ اس زینہ کے سہارے ایک سے ایک کامیابی حاصل کرتا رہا۔''

اس عبارت میں باریکیاں، پرکاریاں اورتہداریاں تو ہیں، لیکن جودعوٰی ہے یعنی ''وہ اس زینہ کے سہارے ایک سے ایک کامیابی حاصل کرتا رہا، اس کی کوئی تفصیل، کوئی دلیل یا کوئی جواز اس افسانے کے قصہ میں موجود نہیں سوائے اس کے کہ:

''اشوک کماررائے بھی سلمٰی پر بہت مہربان تھے، پھر کیا تھا۔ اکبر نے ایم۔ اے کیا۔ نوکری ملنی مشکل تھی اس لئے اس نے ایک این جی او کا رجسٹریشن کروایا۔ اب اس کے ذریعہ سرکاری اعانت حاصل کرتا۔ ایک این جی اواس نے سلمٰی کے نام سے بھی رجسٹرڈ کروایا۔ اب یہ دونوں ادارے اس کے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے کافی تھے۔''

اب پہلے والے بیان پر کہ ''وہ اس زینہ کے سہارے زندگی کی ایک سے ایک کامیابی حاصل کرتا رہا۔'' غور کرنے سے دکھائی کیادیتا ہے؟ الا اس کے کہ اکبر نے ایم اے کرلیا۔ نوکری ملنی مشکل تھی اس لئے دواین جی اوقائم کرلئے۔ چنانچہ ایک سے ایک کامیابی کے زور بیان پر ضرب لگتی ہے۔

این جی او کے ذریعے مالی آسودگی یا خوش حالی قرین قیاس ہے اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اکبر مستی سے زندگی گزارنے لگا ہو، لیکن یہ اس کی آخری منزل نہیں تھی، اس لئے یہ کہنا حسب حال ہے کہ ''اب وہ منزل کی تلاش میں دوڑنے لگا۔'' لیکن غورطلب امر یہ ہے کہ اس کی منزل کیا تھی جس کو پانے کے لئے وہ سرگرداں تھا اور:

''اس کے اندرکانٹوں کا بن اُگ آیا تھا جس سے وہ اندرہی اندرلہولہان ہورہا تھا۔''

اس سوال کا جواب اس تفصیل سے فراہم ہوجاتا ہے کہ:

''اکبرکوسماج کے اعلٰی طبقے کے افراد سے شدید نفرت تھی......وہ اعلٰی سماج کے ہرفرد

سے انتقام لینا چاہتا تھا۔''

لیکن اس اقتباس کا یہ آخری جملہ توجہ طلب ہے:

''وہ حالات کو بدلنا نہیں بلکہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا تھا کہ جوخوداس کے لئے گھاتک ثابت ہورہے تھے۔''

یعنی اکبر کے سینے میں انتقام کی جو آگ لگی تھی وہ ابھی تک بجھی نہیں تھی، اس کی ساری سرگرمیوں کا اصل محرک اورمرکز ومحور یہی انتقام کی آگ تھی، اس کا اصل مقصود و منتہا یہی انتقام تھا اور یہی اس کی آخری منزل تھی۔

اکبر کے کردار پرافسانہ نگار نے کئی زاویے سے روشنی ڈالی ہے اوراس کی شخصیت کو پرت در پرت کھولنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً:

''وہ ایک عجیب سے احساس کمتری کا شکار تھا۔ محفلوں میں کسی بات پر بحث کرنا تو دور کی بات، وہ لوگوں سے آنکھ ملا کرگفتگو بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اپنی بات منوانے کی بھی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔ وہ صرف دوسروں کوگالیاں دے سکتا تھا، ان کا مذاق اڑا سکتا تھا اوراس کی منفی سوچ جس ڈگر پر ڈالتی وہ چلنے لگتا۔ یہ اس کی منفی سوچ ہی تھی کہ اس نے اپنے سب سے بڑے محسن پروفیسر خان کے ساتھ سب سے بڑا دھوکہ کیا تھا۔ دراصل اس نے اونچے طبقے سے انتقام لیا تھا، کس بات کا؟ یہ تو اسے بھی معلوم نہیں تھا۔''

اکبر سلمٰی کو جس راہ پر ڈال دیتا ہے، سلمٰی اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہتی اوراکبر کی یہ حرکت اسے ناقابل برداشت معلوم ہونے لگتی ہے۔ رنج وملال سے اس کے دل ودماغ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ الجھنیں اسے نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا کرتی ہیں۔ چنانچہ جوقدم اسے اٹپٹا سا لگتا تھا، اسی سے اسے ایک عجیب سا لطف بھی آنے لگتا ہے، جس کا نتیجہ بقول راوی اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ:

''کبھی کبھی تو وہ خود ہی بڑھ کراس کے لئے ترقی کا زینہ بن جاتی تھی۔''

اس کہانی میں جو ''ان کہی'' کا حصہ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر دولت کو ایک بڑی قوت سمجھنے لگا تھا۔ سماج میں عزت ووقار حاصل کرنے کے لئے ہی دولت کی ضرورت نہیں تھی بلکہ زمانے سے ٹکرانے اور ناپسندیدہ سماج کوٹھکانے لگانے کے لئے بھی دولت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ دولت حاصل کرنے کے لئے کسی بھی حد تک جانے میں اسے کوئی تامل نہ تھا کیونکہ عزت ووقار کا معیار نجابت

وشرافت نہیں بلکہ صرف اورصرف دولت ہی تھی۔ یہاں محسوس کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں یہ سوچ کسی ایک فرد کی سوچ نہیں بلکہ معاشرے کا عمومی رجحان یہی ہے، حالانکہ روایتی اقداری نظام سے بندھے ہوئے لوگ آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں جو ناداری اور مفلسی میں بھی اپنی دولت وجائداد عزت ہی کو سمجھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں فرسودہ ذہنیت کا حامل سمجھنے والے ایک بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ گویا سماجی حقیقت اورمعاشرتی واقعیت یک رخی نہیں ہے۔ جہاں بظاہر خلوص نظر آتا ہے، وہاں بھی سیاست کے رنگ کی آمیزش جھلک جاتی ہے۔ وفاداریاں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اشوک کمار کی مہربانیاں سلمٰی اوراکبر پر بےلوث نہیں ہیں۔ سلمٰی پر رائے جی کی مہربانیاں جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہیں، اس پر اکبر کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے اوراکبر سلمٰی کے بدلتے ہوئے رویے کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے، لیکن سلمٰی بھی اب کوئی بھولی بھالی اورمعصوم لڑکی نہیں۔ ماہرکھلاڑیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہ بھی اس فن میں مہارت حاصل کرچکی ہے، اس لئے نہایت ہی بےباکانہ انداز میں اکبر کے ردعمل کا منھ توڑ جواب دیتی ہے:

''دیکھو اکبر، میں تو نسیم سحری کی طرح معصوم تھی۔ تم نے میری معصومیت کی ردا کوخود ہی تارتار کردیا، اب تو تم نے مجھے بادِسموم بنادیا ہے اور میں اس ڈگر پر چل پڑی۔ اس ڈگر پر میں اپنی مرضی سے نہیں آئی بلکہ تم نے اپنے فائدے کے لئے مجھے یہاں پہنچادیا۔ میں جب رکی تو تم نے دھکے مارکرآگے بڑھایا اور جب کہ میں اس ڈگر پر بڑھ ہی آئی ہوں تو اس کی بھی کچھ اپنی پرمپرائیں ہیں، کچھ سیمائیں ہیں اور کچھ مجبوریاں بھی ہیں، اس لئے میں اس کا الّنگھن کیسے کرسکتی ہوں۔ تمہارے آکروش کرنے سے کیا ہوگا۔''

زبان وبیان کی سطح پرغیرمتوازن اسلوب کا جواز نوری اس طرح پیش کرتے ہیں:

''وہ جب سے ہندی ڈرامے میں کام کرنے لگی تھی، تب سے اس کی گفتگو میں ہندی کے الفاظ کثرت سے درآئے تھے۔ وہ بات بات میں آکروش، سنگھرش، نِپنسکتا جیسے الفاظ استعمال کرتی تھی۔''

سلمٰی کے رویے سے اکبر تلملاتا ہی نہیں، اس کے اندر کانٹوں کا بن پھیل جاتا ہے اور جی میں آتا ہے کہ وہ سارے زمانے کولہولہان کردے، لیکن وہ جو کچھ چاہتا ہے، وہ سب اس کے اختیار میں نہیں۔ زمانہ تو کیا، وہ سلمٰی کے مخالف سمتوں میں بڑھتے قدم اور راستے کو بھی روک نہیں پاتا۔

سلمٰی کی سمت ورفتار کو نمایاں کرنے کے لئے اس ماجرے میں ایک اور پیوند لگایا گیا ہے اور اس

خوبصورتی سے لگایا گیا ہے کہ لنگر تو کیا بخیہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ بیان واقعہ کے مطابق بنگال میں ایک یوتھ فیسٹیول کا انعقاد کیا جاتا ہے اوراس میں سلمٰی بطورِخاص مدعو کی جاتی ہے۔ بنگال کا یہ پہلا سفر ہی سلمٰی کو بہت راس آتا ہے۔ وہاں کا کھلاپن اسے بہت بھاتا ہے۔ اسی فیسٹیول میں اس کی ملاقات دلیپ گانگولی سے ہوتی ہے اوروہ سلمٰی کے دل ودماغ پر چھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ صرف بانکا جوان ہی نہیں تھا:

''......اس کی آواز میں تو ایک جادو تھا۔ سلمٰی گانگولی کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ اسے اکبر کے ساتھ دوسروں نے بھی محسوس کیا۔ خصوصاً شرماجی جو سلمٰی کے ساتھ ہی آئے تھے۔ انہیں لگا کہ اب سلمٰی ان کے ہاتھ سے پھسل جائے گی۔''

یعنی ایک اوررقیب روسیاہ پیدا ہوگیا۔ شرماجی اکبر کے کان بھرنے لگے۔ چنانچہ اکبر اسی رات ہوٹل میں سلمٰی کو کھری کھوٹی سناتا ہے، لیکن سلمٰی نہیں دبتی، وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔ اس کا بیباک لہجہ صورت حال سے میل کھاتا ہے، جس سے نوری کے اسلوب بیان کی خوبی ظاہر ہوتی ہے۔

بہرحال اکبر کے لئے یہ صبر کے امتحان کا موقع ہوتا ہے اور وہ ضبط سے کام لیتا ہے، لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے۔ سلمٰی کا تیور اور بھی باغیانہ ہوجاتا ہے۔ اس کی زبان برہنہ گفتار ہوجاتی ہے اس پرمستزاد اس کی بیبا کی اکبر کو اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے باوجود سلمٰی کی بھڑاس نکل نہیں پاتی۔ وہ اپنے نسوانی جذبات سے مغلوب ہوتی ہے، پھر اس کے اندر دبی کچلی غیرت نسوانی کا اظہار اس طور ہوتا ہے کہ وہ یک مشت ڈھیر ساری نیند کی گولیاں گھونٹ جاتی ہے۔ اکبر حواس باختہ ہوجاتا ہے، لیکن راوی کا خیال ہے کہ اس وجہ سے اکبر حواس باختہ نہیں ہوتا کہ سلمٰی کی زندگی خطرے میں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اکبر کو خود اپنے منصوبوں اور خوابوں کا شیرازہ بکھرتا نظر آتا ہے، لیکن بقول راوی:

''ایسے لوگوں کو اتنی آسانی سے موت کب ملتی ہے۔ جو اس طرح پل پل مرنا سیکھ جاتے ہیں ان کی زندگی بہت لمبی ہوجاتی ہے۔ سلمٰی کو بھی بچالیا گیا اوراکبر میاں کی جان میں جان آئی کیونکہ ایک جھٹکے میں انہیں لگا تھا کہ جس زینے پر وہ کھڑے تھے کسی نے اچانک پاؤں کے نیچے سے کھینچ لیا ہو۔''

ایسی گھٹن بھری زندگی کا احساس زندگی کی معنویت کو ہی ختم کردیتا ہے۔ جو انسان اپنی زندگی سے بیزار ہو، وہ نفرت کی دیواروں کو پھلانگ کر پیار کے رشتے کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ کہانی کار نے یہاں سلمٰی کے رویے کو جس طرح پیش کیا ہے، اس میں حقیقی صورت واقعہ کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی گرہ لگی تھی کہ وہ غیرمعمولی طور پر سنجیدگی اختیار کرچکی تھی، اس کا باہر نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی کم ہوگیا تھا، یہاں

تک کہ شرما جی بھی آتے تو وہ ملنے سے انکار کر دیتی حالانکہ اس کی برباد جوانی پر موسم بہار کا نکھار ابھی بھی برقرار تھا۔ وہ مطمئن بھی تھی کہ اس کی بیٹی کسی اچھے مقامی کالج میں پڑھتی تھی اور بیٹا کسی دوسرے شہر میں میڈیکل سائنس کی تعلیم پا رہا تھا۔ اس کا داخلہ بھی۔ ایم کوٹہ سے میڈیکل کالج میں ہوا تھا۔ یہ کام اشوک کمار رائے جی نے کرایا تھا اور اگلے سال بیٹی کا بھی داخلہ میڈیکل کالج میں کرا دینے کا وعدہ کیا تھا، اس لئے اس کا زیادہ تر وقت اب بیٹی کے ساتھ ہی گزرتا جو آئی۔ ایس۔ سی کا امتحان دینے والی تھی۔

نوری نے اپنے بیانیہ کو واقعات و واردات اور حالات سے ہم آہنگ رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ واقعات و واردات اور افسانے کے کردار حقیقی نہیں فرضی ہیں، کیونکہ انہوں نے محمد حسن کی طرح سچی جھوٹی کہانیاں تو لکھی نہیں ہیں، لیکن یہاں جو انہوں نے افسانوی کردار گڑھے ہیں اور ان کے ذریعے اخلاق باختگی کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے، وہ واحوال واقعی سے بعید بھی نہیں۔ بنگال کے سفر کے دوران اکبر اور سلمٰی کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں سلمٰی کی سرد مہری ردعمل کے طور پر ظاہر ہونے لگی، اس کی تفصیل بیانیہ میں حسب حال معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اکبر کے ساتھ اس کے تعلقات رسمی گفتگو تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور اکبر نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے دل میں کون سی گانٹھ پڑ گئی ہے جو کھلنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کے باوجود اسے کسی قدر اطمینان تھا کہ ہفتہ عشرہ میں وہ نارمل ہو جائے گی۔ وقت کے ساتھ سب کا کس بل نکل جاتا ہے۔ سلمٰی کی اینفھن بھی دور ہو جائے گی۔ وہ یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ سلمٰی کے ہی تعاون سے اس نے شہر میں فلیٹ بھی خرید لیا تھا اور کار بھی آ گئی تھی۔ اب کافی بڑے لوگوں میں اس کی پہنچ ہونے لگی تھی اور مزید ترقی کے امکانات روشن تھے کیونکہ ترقی کا زینہ ابھی اس کے پاؤں کے نیچے سے کھسکا نہیں تھا، حالانکہ دونوں کے درمیان سرد جنگ جاری تھی اور:

> ''ادھر ایک بڑے نیتا نے اسے ایک ادارے کا چیئرمین بنوانے کی پیش کش کرتے ہوئے کہا تھا: 'آپ تو بہت مصروف رہتے ہیں۔ آپ سلمٰی جی کو کل شام بھیج دیجئے گا۔ میں انہیں سارا پلان سمجھا دوں گا اور پھر انہیں بھی مہیلا آیوگ کا سدسیہ بنانا ہے۔ چیئرمین بننے کے بعد تو آپ کا ایم۔ ایل۔ سی بننا طے ہے اکبر جی۔ اب تو آپ کے راج ہی راج ہیں۔''

نوری نے کرداروں کے منہ میں اپنی زبان ڈالنے سے پرہیز کیا ہے۔ وہ انہیں کی زبان میں ان کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور یہ بات مکالمات سے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس کے علاوہ جس کردار سے جو مکالمات ادا کرائے گئے ہیں، وہ اس کی نفسیاتی گرہوں کو بھی کھول دیتے ہیں۔ مثلاً نیتا کی زبان

آہنگ کیسی ہوتی ہے، اس کا احساس شدت کے ساتھ محولہ بالا مکالمے سے ہو جاتا ہے۔ مثلاً سلمٰی کے بارے میں نیتا جی کا یہ کہنا کہ: ''انہیں بھی تو مہیلا آیوگ کا سدسیہ بنانا ہے۔'' ظاہر ہے کہ یہ زبان کسی ادیب کی نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ کہ: ''آپ تو بہت مصروف رہتے ہیں۔ آپ سلمٰی جی کو کل شام بھیج دیجئے گا۔ میں انہیں سارا پلان سمجھا دوں گا اور پھر انہیں بھی مہیلا آیوگ کا سدسیہ بنانا ہے۔'' یہاں یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ سیاست کے گلیارے میں رسوخ حاصل کرنے اور مانگی مراد پانے کے لئے اکثر ایسے ہی اوچھے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں کیونکہ یہاں جو سبز باغ دکھایا جاتا ہے اس میں رنگ برنگے پھول بھی ہوتے ہیں اور ان کی خوشبوئیں بھی ہوتی ہیں۔ کانٹے بھی ضرور ہوتے ہیں، لیکن دکھائی نہیں دیتے۔ دراصل پھولوں کا رنگ اور خوشبوؤں کا آہنگ دل و دماغ میں وہ نشہ گھول دیتا ہے جس کا سرور دیر تک قائم رہتا ہے اور آنکھوں کو وہ نور عطا کرتا ہے جس میں ہر خواب حقیقت کے رنگ میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نیتا جی کی یقین دہانی کے بعد اکبر کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے:

> ''گھر لوٹ کر اس نے سارا پلان سلمٰی کو سمجھا دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ رات بھر رنگین سپنے دیکھتا رہا۔ کبھی وہ خود کو لال بتی گلی کار میں گھومتا ہوا دیکھتا اور کبھی ایوان بالا میں اپوزیشن کو گالیاں دیتا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن وزارت کی کرسی بھی حاصل کرے گا۔''

لیکن وہ جب صبح میں بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ بغل کا بستر خالی تھا۔ سلمٰی نے اس پر ایک سلپ چھوڑا تھا اور اس کا مضمون یہ تھا:

> ''اکبر علی صاحب..... آپ نے مجھے ہمیشہ ایک زینے کی طرح استعمال کیا اور میں آپ کی ہر بات مانتی رہتی۔ اپنی دنیا کو بے رنگ کر کے آپ کی دنیا رنگین بناتی رہی۔ اب تو میں ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہوں جس پر واپسی کے نشان نہیں ہوتے، ایسی حالت میں جب واپسی ممکن نہیں تو میں نے فیصلہ کیا ہے جب یہی سب کرنا ہے تو پھر اپنے ہی لئے کیوں نہ کروں؟..... زندگی بھر میری آب اتری اور آبدار آپ ہوتے گئے..... آپ کو جو بننا تھا آپ بن چکے، اب جو بننا ہے، وہ میں بنوں گی۔ چاہے چیئرمین ہو یا ایوان بالا کی ممبری..... آیوگ کی ممبری ہو یا وزارت کی کرسی..... آپ کی مرضی سے بہت جی چکی، اب اپنی مرضی سے جینے کے لئے آپ کا یہ گھر چھوڑ رہی ہوں۔''

اس صورت حال میں اکبر کی حالت و کیفیت کیا ہو سکتی ہے؟ قاری کے لئے یہ قیاس کرنا مشکل

نہیں۔ یہ کہانی یہاں تکمیل کو پہنچ جاتی ہے اور ایک قطعی انجام سے قاری کو واقف کرا دیتی ہے، لیکن نوری کی فنکاری کے تقاضے کچھ اور ہیں اور اسی تقاضے کی تکمیل سے کہانی میں ایک نئی جان پڑتی ہے، ایک نئی روح بیدار ہوتی ہے اور یہ افسانہ کلائمکس کی انتہا کو پہنچ کر ایک گہرا تاثر قائم کر دیتا ہے۔ بعد کی کیفیت کا اندازہ راوی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ:

> ''اس کے ہاتھ میں کاغذ کا سلپ تھرتھرانے لگا، اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ خوابوں کی فلک بوس عمارت آن واحد میں زمیں بوس ہو گئی۔ اس سے قبل کہ اس کی آنکھوں میں مکمل اندھیرا چھاتا دروازے سے آواز آئی۔ 'پاپا چائے.....' اس کی بیٹی دو کپ چائے لئے پوچھ رہی تھی۔ 'امی کدھر ہیں پاپا.....؟''
>
> ''اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا دروازے پر ہوا کا تیز جھونکا آیا اور اس کے ہاتھوں میں تھرتھراتے کاغذ کو اڑا کر کھڑکی سے باہر لے گیا، اس نے گھور کر اپنی جوان بیٹی کو دیکھا اور اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی اور اس کی آنکھوں میں پھیلتا ہوا اندھیرا غائب ہونے لگا۔''

افسانہ اپنے فطری ارتقائی مرحلے سے گزرتا ہوا بہت ہی سہل انداز میں قاری کے دل و دماغ میں اترتا ہے، لیکن انجام کو پہنچ کر جب تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے تو ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ تہذیب و اخلاق اور اقدار کی پامالی کا یہ منظر رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ انسان ہوس زر میں مبتلا ہو کر دولت اور ظاہری نام و نمود اور شہرت کے لئے اس حد تک بھی گر سکتا ہے۔ اکبر کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تہدار معنویت ایک ان کہی کہانی کی تشکیل کا پیش خیمہ بن جاتی ہے اور کہانی کے تاثرات کو بیحد گہرا اور معیار کو نہایت بلند بنا دیتی ہے۔

P.G. Head, Deptt, of Urdu & Persian
A.N.College Patna 800013
Mob: +91 9431840245

- **انتخاب۔ ۲**
- **غضنفر**

مسنگ مین

ہمارے اپنے مکان کی دیواروں پر میری پسند کا رنگ ابھی چڑھنا شروع ہی ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر میرے بچوں کی ناک بھوں سکڑ گئی۔

بیٹا بولا، ''پاپا! یہ کیسا رنگ کرا رہے ہیں؟ پلیز اسے روک دیجیے۔''

''ہاں، پاپا! یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ مٹیا کوئی اور نیا کلر کرائیے۔''

بیٹی بھی بول پڑی۔

''کیوں؟'' اس رنگ میں کیا خرابی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

پاپا، یہ بہت ڈل اور بھدا لگ رہا ہے۔ اس سے تو مکان کی بیوٹی ہی خراب ہو جائے گی۔'' بیٹے نے خرابیاں گنوائیں۔

''ہاں پاپا! سنی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بہت ہی بے کار کلر ہے۔'' بیٹی نے تائید کی۔

''نہیں، نہیں یہ رنگ اچھا ہے۔ یہی ٹھیک رہے گا۔''

''کیا پاپا! آپ کا ٹیسٹ کیسا ہے؟ دیکھئے یہ بالکل نہیں جچ رہا ہے۔ پلیز اسے روک دیجیے۔'' بیٹا زور دینے لگا۔

''فار گوڈ سیک پاپا۔ اسے نہ کرائیے۔'' بیٹی بھی دباؤ ڈالنے لگی۔

''نہیں، یہی ٹھیک رہے گا۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' میں اپنے فیصلے پر اڑنے لگا۔

''پاپا آپ تو ضد کرنے لگے۔'' بیٹا بولا۔

''yes، آپ ضد کر رہے ہیں پاپا!'' بہن نے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں، میں ضد کر رہا ہوں، میں ضدی ہوں اور اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔''

میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

بچے مایوس ہو کر اندر چلے گئے۔

''آپ ضد کر رہے ہیں۔''

یہ جملہ زہر میں بجھے تیر کی طرح میرے احساس میں پیوست ہو گیا۔ مرا وجود جھنجھنا اُٹھا۔

یکا یک بہت سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنی حیثیت کے مطابق مکان کا پلاٹ اقرار کالونی میں لینا چاہا مگر اسے سرسید نگر جیسے مہنگے علاقے میں خریدنا پڑا۔

میں نے سفید رنگ کی ماروتی پسند کی مگر گھر میں سٹیل گرے کلر کی سنٹرو آ گئی۔

میں بچوں کو یونیورسٹی کے اسکول میں داخل کرنا چاہتا تھا مگر وہ لیڈی فاطمہ میں داخل ہو گئے۔

ان سب میں ان کی مرضی موجود تھی۔ یہی نہیں بلکہ ٹی وی، فرج، صوفہ، پلنگ ایک ایک چیز میں ان کی مرضی شامل تھی اُن کی ضد چھپی ہوئی تھی۔

پھر بھی کہتے ہے، میں ضد کرتا ہوں، کہاں ہے میری ضد؟ کدھر ہے میری مرضی؟''

میں اپنی ضد اور اپنی مرضی تلاش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ان کی ماں گھر سے باہر نکلی اور میرے پاس آ کر آہستہ سے بولی۔

''کیوں بچوں کا موڈ خراب کر رہے ہیں؟ ان کی بات کیوں نہیں مان لیتے؟ آخر اس مکان میں رہنا تو انہیں کو ہے۔ ہم اب اور کتنے دنوں کے مہمان ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنی پسند ان پر لادیں۔ دونوں نئے مکان کو لے کر کتنے پرجوش تھے، مگر آپ کی ضد نے ان کے جوش وخروش، ان کی خوشی و مسرت سب پر پانی پھیر دیا۔ بے چارے اُداس و ملول بیٹھے ہیں۔ آپ نے یہ بھی سوچا کہ ان کی پڑھائی پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ یہ رنگ کا چکر ان کی پڑھائی میں ضرور بھنگ ڈال دے گا۔ خدا کے لیے مان جائیے۔ مہربانی کر کے کام کو رکوا دیجیے۔

بیوی نے ہمیشہ کی طرح والدین کا فرض اور بال ہٹ کا فلسفہ سمجھا کر اور ان کی پڑھائی کا واسطہ دے کر مجھے خاموش کر دیا۔

میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میرے بچے اُداس ہو جائیں۔ ان کے چہرے کا رنگ اُڑ جائے۔ اُن کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ جائے۔ ان کے دلوں میں یاس بھر جائے۔

اُن کی اُداسی کا ذکر سنتے ہی اُن کے اُداس چہرے میری آنکھوں میں آ بسے۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کی جو مرضی ہو، کرو، اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

ہمیشہ کی طرح یہ جملہ دہرا کر میں خاموش ہو گیا۔

بیوی خوش اور مطمئن ہو کر بچوں کو خوشخبری سُنانے چلی گئی اور میں حسبِ عادت اپنے ماضی میں پہنچ گیا۔ مجھے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔

''ابا! ابا!۔''

''کیا ابا ابا کی رَٹ لگا رکھی ہے، کچھ بولتا کیوں نہیں؟''

''ابا میں گاؤں کے مدرسے میں نہیں پڑھوں گا۔ میں شہر کے مشن اسکول میں جاؤں گا۔''

''کیا کہا! تو تم مدرسے میں نہیں پڑھے گا۔ مشن اسکول میں جا کر کرسٹان بنے گا!'' خبردار جو دوبارہ وہاں جانے کی بات کی تو.....

یکا یک میرے ہونٹ سل گئے۔ میرا منہ لٹک گیا۔ میری آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔

''ابا! ابا!۔''

''پھر ابا! ابا! تجھ سے کتنی بار کہا کہ تو تو تا یا مت کر۔ سیدھی بات کیا کر۔''

''جی ابا۔''

''بول کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''ابا میں رنگین سائیکل لوں گا۔ نیلی ہینڈل اور اال فریم والی، جس کے پہیے پتلے پتلے ہوتے ہیں۔''

''نہیں ہرکلس ٹھیک رہے گی۔ وہ مضبوط ہوتی ہے۔''

''نہیں، میں تو وہی لوں گا۔''

''میں نے کہہ دیا نا کہ ہرکلس سائیکل آئے گی۔

''نہیں، میں ہرکلس نہیں لوں گا۔ مجھے تو رنگین سائیکل چاہیے۔''

چٹاخ۔

''لے یہ رہی رنگین سائیکل۔ دوبارہ ضد کی تو یہ تیرے گال مار مار کر اورا ال کر دوں گا۔''

میں روتا ہوا وہاں سے اُٹھ کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور دیر تک لکھوری اینٹوں والی کوٹھری میں سسکتا رہا۔

رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیال آتا رہا کہ ابا میرے پاس آئیں گے اور میرے آنسو پونچھیں گے۔ مجھے پچکاریں گے۔ مگر ابا نہیں آئے۔ یہ خیال شاید اس لیے آتا رہا کہ ایک بار جب میں بیمار پڑا تھا تو ابا ساری رات میرے پاس بیٹھے رہے۔ میرے ماتھے پر پانی کی پٹی رکھتے رہے، مجھے تسلی دیتے رہے۔

میں کچھ بڑا ہوا تب بھی میری بات نہیں سنی گئی۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھنا چاہا مگر

ابا نے مجھے بہار یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔

میں نے اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو جواب میں ابا کا چنگیزی لب و لہجے میں نادر نامہ آدھمکا۔

ماضی کی یاد نے مجھے اور رنجیدہ کر دیا۔ میری اُداسی اور گہری ہو گئی، میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ بچوں کی خواہش کو پورا کرنا تو ماں باپ کا فرض ہوتا ہے۔ ان کی ضد کے آگے تو والدین کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ آخر اولاد کی خوشی میں ہی تو ماں باپ کی خوشی ہے۔ اس میں بھلا پریشان اور اُداس ہونے کی کیا بات ہے.....''

مجھے محسوس ہوا جیسے میری بیوی میرے سرہانے کھڑی مجھے سمجھا رہی ہو مگر وہ تو کچن کے کام میں مصروف تھی۔

میرے جی میں آیا کہ میں دیکھوں کی میری اُداسی کا کوئی اثر میرے بچوں پر ہے یا نہیں اور میں اپنے کمرے سے اُٹھ کر اُن کے کمرے میں چلا گیا۔

دونوں بچے ٹیلی ویژن پر کوئی مزاحیہ سیریل دیکھنے میں محو تھے۔ میرے آنے کا انہوں نے نوٹس بھی نہیں لیا۔

میں اکثر اپنے بچوں کو خوش کرنے میں اُداس ہوا۔ اُن کی ضد پوری کرنے میں میرا دل دُکھا۔ میری انا مجروح ہوئی۔ میرے اندر شدید خواہش جاگی کہ بچوں کو میرے اندر کی کیفیت کا احساس ہو۔ وہ مجھ سے میری اُداسی کا سبب پوچھیں۔ افسوس کا اظہار کریں مگر وہ ہر بار اپنی ضد کی کامیابی کی خوشی میں مجھے بھول گئے۔

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ کچھ دیر تک میں چپ چاپ کمرے کی چھت کو گھورتا رہا، پھر کمرے سے نکل کر باہر چلا گیا۔

رنگائی کا رکا ہوا کام پھر سے شروع ہو چکا تھا۔ دیوار پر کوئی اور رنگ چڑھ رہا تھا اور وہ نیا رنگ پہلے والے رنگ کو مدھم کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک میں ایک رنگ کو ہلکا اور دوسرے کو گاڑھا ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔

پھر باہر سے اندر آ گیا۔ بچے حسبِ معمول سیریل میں مصروف تھے۔ بیوی کچن میں مگن تھی۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔

دیوار سے دونوں رنگ اُتر کر میری آنکھوں میں داخل ہو گئے۔

دونوں رنگ جگنوؤں کی طرح آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ اچانک میرے دیدوں میں میرا مکان

اُبھرنے لگا۔

پہلے نیو اُبھری۔

نیو سے میری ضرورتیں بھی اُبھریں جنھیں دفن کر کے نیو کھودی گئی تھی۔ نیو کے بعد دیواریں اُبھریں۔

دیواروں سے میری وہ خواہشیں بھی اُبھریں جنھیں دبا کر دیواریں اُٹھائی گئی تھیں۔

پھر چھت اُبھری۔

چھت سے وہ قرض بھی اُبھرا جسے چھت تعمیر کرنے میں میں نے اپنے جسم و جان پر لاد لیا تھا۔

اور آخر میں وہ رنگ اُبھرا جسے دیواروں کے لیے میں نے پسند کیا تھا اور اسی کے ساتھ وہ رنگ بھی اُبھر آیا جسے بچوں کی ضد نے اُبھارا تھا اور جو دیوار سے اُتر کر میری آنکھوں میں داخل ہو کر اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔

نیو، دیواریں، چھت، تینوں کھسک کر کہیں اور چلی گئیں۔ آنکھوں میں صرف رنگ رہ گئے۔

رفتہ رفتہ ایک رنگ اُڑتا گیا پیکا پڑتا گیا۔ اور دوسرا جمتا گیا اور گاڑھا ہوتا گیا۔

گاڑھے رنگ پر میری نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔

یہ میرے بچوں کا رنگ تھا جسے اُن کے بچپن کی ضد نے اُبھارا تھا، اس رنگ نے ایک بار پھر سے مجھے اپنے بچپن میں پہنچا دیا۔ میں اپنے اردگرد اسے تلاش کرنے لگا مگر مجھ میں وہ کہیں نہیں ملا، مجھے تو وہ رنگ میرے ابا کے پاس نظر آیا۔

میں مایوس اور اُداس ہو کر اپنے بچپن سے باہر نکل آیا۔ پھر وہیں آ گیا جہاں میں خود ابا بنا بیٹھا تھا مگر یہاں بھی ابا والا رنگ مجھ میں نہیں تھا۔ وہ رنگ تو میرے بچوں کے پاس تھا۔

میں نہ وہاں تھا اور نہ یہاں۔

میں اپنے لیے بے چین ہو گیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے زمانہ مجھے چھوڑ کر گزر گیا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Academy of Professional Development
of Urdu Medium Teacher
Nomchomski Complex,
Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025
Mob: 09990237388

- **تجزیہ**
- **ڈاکٹر تسلیم عارف**

مسنگ مین: ایک تجزیہ

عہد حاضر کے معتبر لکھنے والوں میں غضنفر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ناول، افسانہ، شاعری، تنقید وغیرہ اصناف میں اپنی صلاحیت کا اعتراف پچھلی دو دہائیوں سے بہ حسن خوبی کرا رہے ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت کی رفتار بھی کافی تیز ہے لہٰذا اُن کی تخلیقات یا مضامین بغیر کسی بڑے وقفے کے شایع ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان کے بھی وہ اچھے ہنرور ہیں اور ان کے قلم نے کئی اہم افسانے بھی خلق کیے ہیں۔ 'کڑوا تیل'، 'سانڈ'، 'خالد کا ختنہ'، 'بھیڑ چال'، 'پرزہ'، 'مسنگ مین'، 'ملبے پر کھڑی عمارت'، 'رمی کا جوکر'، 'اصلاح الاوحشیان'، 'تانا بانا'، 'اتم چند والیا' وغیرہ ان کے اہم افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہم عصر عہد میں جو generation gap کا طوفان اُبھرا ہے اور ہماری خاندانی زندگی کے جو اقدار مجروح ہوئے ہیں، اسی المیے کا بیان ہمیں غضنفر کے 'مسنگ مین' میں ملتا ہے۔ ہم عصر سماج کے خاندانی رشتوں کی زبوں حالی پر یہ افسانہ بے حد جذباتی انداز میں طنز کرتا ہے۔

افسانے میں کوئی بہت بڑی بات سرسری طور پر دیکھنے میں نظر نہیں آتی لیکن غور کرنے پر پتا چلتا ہے کہ غضنفر نے یہاں بڑی چابک دستی سے عہد حاضر کے ایک بڑے المیے کو پیش کیا ہے۔ غضنفر نے اپنی باتوں کو پُر اثر طور پر پیش کرنے کے لیے ایک ایسا کردار خلق کیا ہے جو دو نسلوں کے بیچ کھڑا ہے۔ غضنفر اس کا نام تو نہیں لیتے ہیں لیکن یہ بتاتے ہیں کہ جب وہ بچہ تھا، اس وقت ماں باپ نے اس کی خواہشات اور جذبات کو نظر انداز کر دیا۔ چاہے وہ شہر کے مشن اسکول میں پڑھنے کا معاملہ ہو یا رنگین سائیکل لینے کا، چاہے علی گڑھ میں پڑھنے کا معاملہ ہو یا اپنی پسند سے لڑکی شادی کرنے کا۔ ہر جگہ اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ یہ اس دور کے واقعات ہیں جب ماں باپ بچوں کے لیے سب کچھ ہوا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا تقریباً ہر اہم فیصلہ وہ ہی کرتے اور وہ جو فیصلہ کر دیتے بچوں کو اس کی تعمیل ضروری ہوتی۔ بچوں کی تربیت کا نظام ایسا تھا کہ وہ ماں باپ کے فیصلوں سے الگ خود مختار طور پر اپنے فیصلے نہیں لے سکتے لیکن رفتہ رفتہ سماج میں تبدیلیاں رونما ہوئی۔ دنیا

بدلی، سوچ بدلی۔ ہر شخص اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے اپنی زندگی کا فیصلہ بھی خود ہی کرنا چاہیے، ایسا ماحول بن گیا۔ بات بالکل صحیح تھی لیکن پھر بھی ماں باپ کی ضرورت تو باقی تھی ہی۔ آپسی پیار و محبت کی ضرورت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن زمانے کی بھاگ دوڑ نے ہم سب کو محض اپنے بارے میں سوچنے میں ایسا مبتلا کیا کہ ہم خود میں سمٹ کر رہ گئے۔ فکر رہی تو صرف اپنی۔ اپنی پسند و ناپسند، اپنی عزت، اپنا مرتبہ، اپنی راحت، اپنا آرام یعنی دھیرے دھیرے ہم خود غرض ہوتے گئے۔ ہر انسان، یہاں تک کہ ماں باپ اور اولاد کے درمیان بھی یہ خود غرضی حائل ہو گئی۔ ایک دوسرے کا پاس و لحاظ اور اُن کے جذبات کی قدر کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ اسی پُر فتن دور کے پس منظر میں دو نسلوں کے بیچ پستا ہوا 'مسنگ مین' کا مرکزی کردار خلق ہوا ہے۔

بچپن میں اسے جو مایوسی ملنی تھی وہ تو ملی ہی لیکن اب جب کہ وہ اپنے کنبے کا مالک ہے، یہاں بھی اس کی خواہشات کی تکمیل ممکن نہیں ہو پاتی۔ بچپن میں جہاں باپ اس کی مایوسی کا سبب بنا، یہاں نئی نسل سے تعلق رکھنے والے اس کے اپنے ہی بچے بھی اسے سمجھ نہیں پائے۔ وہ اپنے بچوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا اور ماضی میں اُس کے ساتھ جو ہوا اپنی اولاد کو اس سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس بات کا الٹا اثر ہو گیا۔ اب اسے اولاد کی ہر بات کو (ہر ضد کو) قبول کرنا پڑتا تھا۔ حد تو اس وقت ہو جاتی ہے جب یہ کردار اپنے گھر کے رنگ و روغن میں مشغول ہوتا ہے اور اپنی پسند کے رنگ سے گھر کو کلر (Colour) کرانا چاہتا ہے تو اس کے بچوں کو یہ رنگ پسند نہیں آتا اور وہ ضد کرتے ہیں کہ یہ رنگ تبدیل کر دیے جائیں۔ لیکن وہ نہیں مانتا اور کہتا ہے ''کہ یہی رنگ ٹھیک ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے'' بچے باپ کو ضدی قرار دیتے ہوئے ناراض ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اُن کی ماں آ کر شوہر کو سمجھاتی ہے اور بچوں کی پڑھائی کا حوالہ دے کر میاں کو دوسرا رنگ کرانے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ لہٰذا وہ ایک بار پھر اپنی خواہشات قربان کر کے بچوں کی بات مان لیتا ہے۔

اس واقعے کے بعد غضنفر نے جس طرح مرکزی کردار کو باطنی طور پر ٹوٹتے اور بکھرتے دکھایا ہے، وہ کافی کرب ناک ہے۔ وہ باپ جس نے بچوں کی خوشی کے لیے ہر موقعے پر اپنی خوشیاں قربان کیں، نہ تو بیوی کو اس کی کوئی خاص پرواہ تھی اور نہ ہی اس کے بچوں نے والد کی ناراضگی کا کوئی نوٹس (Notice) لیا۔ وہ تو ٹی۔ وی پر آنے والے مزاحیہ سیریل میں مست تھے۔ یہ وہ بچے تھے جن کی ضد پورا کرنے میں باپ کا سینہ ہر بار چھلنی ہوا تھا۔ جن کی ہر خوشی کے لیے اس کو اپنی کئی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑا تھا۔ غضنفر نے اس پُر سوز انداز میں مرکزی کردار کے کرب اور داخلی کیفیت کو بیان کیا ہے کہ قاری کی پوری ہمدردی اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔

افسانے میں بڑے ہی سفاک انداز میں عہد حاضر کی ایک بڑی برائی کو اجاگر کیا ہے۔ آج کے

مشینی دور میں ہم نے اپنی سہولیات کے لیے بہت سے ایجادات کر تو لیے لیکن ان میں الجھ کر ہم خود بھی مشینی انسان ہی بن گئے۔ یہ وہ دور ہے جب ماں باپ دونوں کو ملازمت کرنی پڑتی ہے، تب جا کر کہیں گھر کا خرچ ٹھیک طریقے سے چل پاتا ہے۔ ایسے میں اولاد کو ماں باپ کا ساتھ کیسے میسر ہو؟ بچے ان کے پیار کو کس ذریعے سے سمجھیں؟ بچوں پر بھی ہم نے بچپن میں ہی کتابوں اور پڑھائی کا ایسا بوجھ ڈالا کہ ان کا بچپن اس میں بالکل کھو گیا یا یوں کہیں کہ کتابوں کے بوجھ سے دب گیا۔ دنیا حاصل کرنے کی اندھی دوڑ میں ہم جس طرح لگے تھے اسی طرح اپنے بچوں کو بھی اس ریس (Race) کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں ان بچوں کو اس بات کا مکمل ملزم قرار دینا کتنا صحیح ہے کہ انھوں نے اپنے والدین کے حقوق یا جذبات کو نہیں سمجھا؟ دراصل آج کا معاشرہ ہی ایسا ہو گیا کہ اس میں ایک دوسرے کے لیے وقت نکالنا محال ہو گیا ہے۔ 'مسنگ مین' کا مرکزی کردار ان دونوں ادوار کے بیچ ایک کڑی ہے جو نہ تو ماضی ہی میں اپنے حصے کی خوشی حاصل کر سکا اور نہ ہی حال میں اسے اپنے جذبے پورے کرنے کا موقع ملا۔ ان دونوں ادوار میں اس کی اپنی کوئی زندگی نظر نہیں آتی۔ اسی لیے غضنفر نے اس افسانے کا عنوان بے حد غور و فکر کر کے 'مسنگ مین' تجویز کیا ہے جو مرکزی کردار کے لیے 'اسم با مسمّیٰ' ثابت ہوا ہے۔

بچپن میں والد نے اس کی خوشیوں کا گلا گھونٹا تو اب بچے اس کی خواہشات کے پورا ہونے میں دیوار بن گئے۔ غضنفر نے اس کی خواہشات کی قربانی اور بچوں کی ضد کے پورا ہونے کو کافی پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے:

> ''نیند، دیواریں، چھت تینوں کھسک کر کہیں اور چلی گئیں، آنکھوں میں صرف رنگ رہ گئے۔ رفتہ رفتہ ایک رنگ اڑتا گیا، پھیکا پڑتا گیا اور دوسرا رنگ جمتا گیا اور گاڑھا ہوتا گیا۔ گاڑھے رنگ پر میری نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔ یہ میرے بچوں کا رنگ تھا جسے ان کے بچپن نے اُبھارا تھا۔ اس رنگ نے ایک بار پھر سے مجھے اپنے بچپن میں پہنچا دیا۔ میں اپنے اردگرد اُسے تلاش کرنے لگا مگر مجھ میں وہ کہیں نہیں ملا۔''

مرکزی کردار جو رنگ تلاش کر رہا تھا وہ اصل میں رنگ نہیں بلکہ اس کا نامکمل اور ادھورا شعور میں دبی ہوئی خواہشات ہیں۔ جسے اس کا باپ بچپن میں سمجھ پایا اور نہ ہی اس کے جگر گوشے اور بیوی ہی سمجھ پائی۔ اسی لیے اسے اپنے بچپن میں یہ رنگ اپنے ابّا کے پاس ملا اور جوانی میں وہ رنگ بچوں کے پاس چلا گیا۔ اسی لیے وہ اس کرب کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے ''میں نہ وہاں تھا اور نہ یہاں'' بجا طور پر اس یہ کردار اس دور کے انسانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے اس قبیل کے لوگوں کی علامت بن جاتا ہے۔ افسانے میں مرکزی

کردار کی پیش کش غضنفر نے اس طرح کی ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ میں اپنا گہرا نقش قائم کرتا ہے اور اس کو متاثر کر کے اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

حالاں کہ اس کردار کا تجزیہ کرنے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار خود عتادی کی کمی کا شکار ہے۔ کہانی کے پہلے سین میں جب بچے اس سے ضد کر رہے تھے تو وہ انھیں ڈانٹ دیتا ہے جس سے وہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ضدی کہہ کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد وہ اپنے ماضی میں غوطے لگانے لگتا ہے۔ افسانے کے اس مقام پر غضنفر نے فلیش بیک کا سہارا لے کر بتایا ہے کہ ماضی میں مرکزی کردار کو اپنے بچوں کی ہر بات کو، ان کی ضد کی وجہ سے قبول کرنا پڑا ہے اور جس طرح سے وہ اُن سے کہتا ہے کہ: ''ہاں میں ضد کر رہا ہوں، میں ضدی ہوں اور وہی کروں گا جو میں چاہتا ہوں۔'' اس سے لگتا ہے کہ اب وہ دیوار کا رنگ نہیں بدلے گا اور اس بار اُس کی خواہش پوری ہو گی۔ لیکن جس آسانی سے بیوی کے کہنے پر ایک مرتبہ سوچ کر وہ اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے، یہ بات عجیب لگتی ہے۔ بیوی نے اس بات پر اتنا زیادہ زور نہیں دیا تھا اور نہ ہی بچوں کے بارے میں کوئی تفصیل ہے کہ وہ کس حد تک ناراض ہوئے؟ اور کیا واقعی اس چھوٹی سی بات سے ان کی پڑھائی میں کوئی خلل آتا؟ کیوں کہ جب ان کے پسند کے رنگ سے دیواروں کی رنگائی شروع ہوئی تو اس پر اُن کا کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ جب مرکزی کردار اُن کے پاس گیا کہ دیکھوں انھیں میری اُداسی کی کوئی فکر ہے یا نہیں، اس وقت وہ مزاحیہ سیریل میں محو تھے۔ جیسے انھیں اس معاملے کی خبر ہی نہیں۔ بیوی بھی دلاسہ دے رہی ہے تو ایسے بہلانے ڈھنگ سے کہ کوئی زبردستی ڈیوٹی پوری کرتا ہے۔ اس لیے اتنی آسانی سے مرکزی کردار نے اپنا فیصلہ کیسے بدل دیا؟ یہ چوکانے والی بات ہے جو اس کردار کی خود اعتمادی پر سوال کھڑا کرتی ہے کہ وہ پہلے تو ایک فیصلہ لیتا ہے اور اس پر مصر ہوتا ہے کہ وہ اسے پورا کر کے رہے گا۔ شروع میں اس نے جس طرح کہا تھا کہ ''اب وہی ہو گا جو میں چاہوں گا'' وہ جوش بعد میں اس کردار میں رتی بھر بھی دکھائی نہیں دیتا۔

غضنفر نے اس افسانے میں ایک لطیف سا اشارہ اس بات کی طرف بھی کیا ہے کہ انسان گھر کی تعمیر میں کس طرح اپنا خون پسینہ لگاتا ہے، تب جا کر ایک مکان وجود میں آتا ہے۔ بشیر بدر کا شعر ہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

غضنفر مرکزی کردار کی سوچ سے ایسے جملے ادا کراتے ہیں جو دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"......اچانک میرے دیدوں میں میرا مکان ابھرنے لگا

پہلے نیو اُبھری۔

نیو سے میری ضرورتیں جنھیں دفن کر کے نیو کھودی گئی تھی۔

دیواروں سے میری وہ خواہشیں بھی ابھریں جنھیں دبا کر وہ دیواریں اٹھائیں گئی تھیں۔

پھر چھت ابھری۔

چھت سے وہ قرض بھی اُبھرا جسے چھت تعمیر کرنے میں میں نے اپنے اوپر لادلیا تھا۔"

اس اقتباس کا بہ غور مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ غضنفر نے یہاں جو نقشہ کھینچا ہے، موجودہ عہد میں متوسط طبقے کے لوگوں کو ذاتی مکان تعمیر کرنے میں لاحق دشواریاں اپنی تمام کرب ناکی کے ساتھ اس کے ذریعے ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ یہاں ایسا کوئی پہلو نہیں، جسے وہ اشاروں میں بیان نہیں کر جاتے ہیں۔ آج جس طرح مہنگائی آسمان چھو رہی ہے۔ اس میں اپنا مکان تعمیر کر لینا، ایک مشکل معرکہ سر کرنے جیسا ہی ہے۔ انسان کیسی کیسی قربانیاں دے کر اُسے تعمیر کرتا ہے کہ "نیو گھدتی ہے" یعنی زمین خریدی جاتی تو ضرورتیں دفن کی جاتی ہیں۔ "دیوار اُٹھائی جاتی ہیں" تو خواہشیں دبا کر دیواریں اُٹھتی ہیں اور چھت تعمیر کرنے میں جسم و جان پر قرض کا بوجھ لد جاتا ہے۔ آج متوسط طبقے کا لگ بھگ ہر انسان اسی کیفیت سے دوچار ہے۔

ایک اور بات جس کی طرف افسانے میں غضنفر نے بے حد لطیف سا اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ مرکزی کردار جب اُداس ہوتا ہے اور اپنے بچوں کے تاثرات معلوم کرنے ان کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو بچے اُس وقت مزاحیہ سیریل دیکھ رہے ہوتے ہیں اور والد کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتے۔ غضنفر یہاں پر اپنی بات کسی بھی سیریل کو دیکھنے سے پورا کر سکتے تھے لیکن یہاں بچوں کو "مزاحیہ سیریل" میں محو دکھانا بس یوں ہی نہیں ہے۔ آج چوں کہ ٹی۔ وی تفریح کا ایک بہت بڑا اور اہم ذریعہ ہے، اس لیے اسے گھر کی ایک اہم ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں سے اس کی حیثیت میں زبردست طریقے سے بدلاو آیا ہے اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف پہلے سے زیادہ ہوئی ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں تو دیکھتے ہی دیکھتے نئے چینلوں کی بھیڑ تیار ہوگئی اور ٹی۔ آر۔ پی (T.R.P) بڑھانے کے لیے نئے نئے قسم کے ایسے پروگرام وجود میں آنے لگے جن سے ناظرین اُنھی کا چینل دیکھیں۔ لوگوں کو عدیم الفرصتی کی وجہ سے اِن تمام چیزوں سے محظوظ ہونے کا موقع بھی پہلے کی طرح نہیں رہا۔ ایسے میں کئی چینلوں نے مزاحیہ پروگرام اور 'لافٹر چیلینج' کے مقابلے شروع کر دیے جن کو دیکھ کر لوگ اپنے غم یا پریشانیاں کچھ دیر کے لیے بھول کر دل کو خوش کر لیں۔ عام طور پر

ایسے پروگرام زیادہ دیکھنے والے لوگ سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو بھی ہنسی اور ٹھٹھا سمجھ کر اُڑا دیتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی آج جذبات و احساسات کی قدر ویسی نہیں رہی جیسی پہلے یعنی تیس چالیس برس قبل ہوا کرتی تھی۔ غضنفر نے یہاں پر بھی اپنی بات پیش کرنے میں مزاحیہ سیریل کا استعمال کرا کے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

غضنفر کی نگاہ بے حد تیز ہے اور وہ اپنے عہد کی ہر چھوٹی بڑی تبدیلی پر نگاہ جمائے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کا اظہار بھی افسانے کے لیے موزوں اِشاراتی زبان اور رمزیہ انداز میں کرتے ہیں۔ زیر بحث افسانہ عہد حاضر کے عمومی رجحان کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور ایسا محسوس ہوتا کہ غضنفر نے اس سماج اور نسل کی جو حالت دیکھی، اس سے جو اثر لیا، اسے ہو بہو صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا۔ آج مکان تو ہے لیکن وہ گھر نہیں، رشتے تو ہیں لیکن اُن میں جذباتی لگاؤ نہیں، ایک دوسرے سے تعلقات محبت نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے ہے۔ رشتوں کی حقیقت دھیرے دھیرے اغراض پر مبنی ہوتی جارہی ہے۔ اسی حقیقت کے پس منظر میں ہی افتخار عارف نے یہ دعا کی ہے:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں، اس کو گھر کر دے

اور مکان کو گھر کرنے کی دعا کیوں مانگی گئی ہے، یہ سمجھنے کے لیے میرے خیال میں غضنفر کا 'مسنگ مین' کا پڑھنا کافی ہے۔

☆☆☆

Department of Urdu, Ranchi University, Ranchi
Mob: 09990391251, 07870275969
Email: tasleem171@gmail.com

نام رسالہ: سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز (ناول نمبر)
مدیر : ڈاکٹر منصور خوشتر
اشاعت: مئی تا جولائی ۲۰۱۶ء
قیمت: ۲۰۰ روپے
صفحات: ۴۴۸
ملنے کا پتہ: شوکت علی ہاؤس پرانی منصفی لال باغ، دربھنگہ

نام رسالہ: آبشار کتابی سلسلہ ۳
مدیر اعزازی: محمد سلیم فواد کندی
قیمت: ۱۲۵ روپے
صفحات: ۱۶۰
ملنے کا پتہ: ڈاکخانہ نیو کالونی، چشمہ بیراج، ضلع میانوالی، پاکستان

● ہندی افسانہ

● کملیشور/ترجمہ: علی نثار

لاش

سارا شہر سجا ہوا تھا. خاص خاص سڑکوں پر جگہ جگہ دروازے بنائے گئے تھے۔ بجلی کے کھمبوں پر پرچم، دیواروں پر پوسٹر۔ والنٹیر کئی دنوں سے شہر میں پرچے تقسیم کر رہے تھے۔ محاذ کی سرگرمیاں تیزی پڑتی جارہی تھیں. خیال تو یہاں تک تھا کہ شاید ریلیں، بسیں اور ہوائی ٹریفک بھی ٹھپ ہو جائے گا۔ شہر بھر میں بھاری ہڑتال ہوگی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ جلوس میں حصہ لیں گے۔

شہر سے باہر ایک میدان میں مکمل شہر ہی بس گیا تھا۔ دور دور سے لوگوں کی ٹولیاں آ رہی تھیں۔ کچھ ٹولیاں ٹھیکے کی بسوں میں آئی تھیں۔ بسوں پر بھی پرچم تھے۔ کپڑے کی پٹیوں پر تحصیل کا نام تھا۔ کچھ ٹکڑیوں میں عورتیں بھی تھیں، بچے بھی۔ عورتیں خالی وقت میں ابھیان گیت گاتی رہتی۔

مرکزی کمیٹی نے کچھ نئے نعرے بنائے تھے۔ ضلع کی سطح کے کچھ لوگ ان نعروں کا ریاض کر رہے تھے۔ لنگر میں بھاگ دوڑ تھی۔ شہر کے سب راستے، ہوٹل، دھرمشالائے، سرائے اور معمولی رشتہ داروں کے گھر مظاہرین سے بھرے ہوئے تھے۔

دو مہینے پہلے درزیوں کو پرچم اور ٹوپی سینے کا ٹھیکہ دے دیا گیا تھا۔ پرچے اور پوسٹروں کا کام سات چھاپخانوں کے پاس تھا جن پرچوں پر مانگیں اور نعرے چھپے تھے، وہ سب کے سب مظاہرین کو تقسیم کر دیے گئے تھے۔ پولیس کی سرگرمی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ ٹریفک پولیس نے شہریوں کی سہولت کے لئے اعلان کرنا شروع کر دیا تھا...... کہ جلوس والے دن شہری شہر کی کن کن سڑکوں کو استعمال نہ کریں...... کہ شہری اپنی گاڑیاں وغیرہ محفوظ مقامات پر رکھیں۔

جلوس کی طاقت کا اندازہ لگا کر پولیس کمشنر نے پی۔ اے۔ سی کو بلالیا تھا۔ جن جن سڑکوں سے جلوس کو گزرنا تھا، ان کی عمارتوں پر جگہ جگہ مسلح پولیس تعینات کر دی تھی۔ سڑکوں کے دونوں جانب صرف وہ پولیس تھی، جس کے پاس ڈنڈے تھے...... تاکہ مظاہرین کو تاؤ نہ آئے۔ یہ سب انتظام پولیس کمشنر نے خود ہی کر لیا تھا۔

اپنے اس خاص انتظام کی خبر دینے کے لئے جب پولیس کمشنر وزیر اعلی کے پاس پہنچا تو اس کا سارا تسیوں خود ہی ختم ہوگیا۔ وزیر اعلی کے چہرے پر کوئی فکر یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوش و خرم تھے۔ وزیر داخلہ آہستہ آہستہ مسکرا رہے تھے۔ وزیر اعلی نے کچھ کہا تو پولیس کمشنر نے تفصیل دینی شروع کی دو ہزار لوکل فورس ہیں، پانچ سو پی اے سی، چار سو ڈسٹرکٹ سے آیا ہے، تین سو ریلوے کا ہے، اسی جوان جیل سے اٹھا لئے ہیں، دو سو ہوم گارڈ! ان میں سے آٹھ سو آرمڈ ہیں۔ ہر پولیس چوکی پر آنسو گیس کا انتظام ہے۔ سولہ سو لاٹھیاں گزشتہ ہفتے آ گئی تھیں۔ ساڑھے چار سو کا فورس بنا وردی کے ہے۔

پولیس کمشنر سب بتاتا جا رہا تھا، پر وزیر اعلی خاص تجسس سے نہیں سن رہے تھے۔ وزیر داخلہ بھی بہت دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ کمشنر کچھ حیران ہوا۔ اس نے ایک لمحے رک کر ان دونوں کی طرف دیکھا تو وزیر اعلی نے اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے کہا،

"خوامخواہ آپ نے اتنی طوالت کی۔"

"ان کے مخالف جماعتوں کا کچھ بھروسہ نہیں...... اگر ہم انتظام نہ کریں تو......" کمشنر کہہ رہا تھا۔

"مورچہ پرسکون رہے گا۔" وزیر داخلہ نے کہا.

"کیا پتہ۔ کمشنر بولا، "مجھے تو......"

وزیر اعلی نے بات کاٹ دی "بہت اودھم نہیں مچے گا. بس ذرا غنڈوں پر نظر رکھئے گا......"

"غنڈے تو تین چوتھائی سے زیادہ پکڑ لئے گئے ہیں...... یہ تو تین دن پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ کچھ آج دوپہر بند کر دیے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تو میں اجازت لوں؟" کمشنر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے"، وزیر اعلی نے کہا کہ، "عقل سے کام لیجیے گا۔ میرے خیال سے آپ جلوس کے کرتا دھرتاؤں سے ملتے ہوئے نکل جائیے۔ تینوں یہیں ایم ایل اے ہاسٹل میں ٹکے ہوئے ہیں......۔"

"جی مجھے معلوم ہے، پر شاید اب تک وہ اپنے پنڈال میں چلے گئے ہوں گے......" کمشنر نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا، "اور وہاں جا کر ملنا...... میرے خیال سے ٹھیک نہیں ہوگا......"

"وہ یہیں ہوں گے...... ارے بھئی، آپ کو معلوم نہیں، ان میں سے کئی تو میرے ساتھ جیل میں رہے ہیں۔ بڑے آدرشوادی آدمی ہیں...... تیز اور بیلاگ۔ ایسے مخالف کو تو میں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں۔ ان کی بس ایک ہی کمزوری ہے، نیند! آپ ان کے سر پر نگاڑا بجائیے، پر وہ نہیں اٹھ سکتے۔ جیل میں بھی یہی

عادت تھی۔ ستیہ گرہ کی تحریک کے دنوں میں بھی! انہیں نیند پوری چاہئے..... اب وہیں ہوں گے....." وزیر اعلیٰ نے تعریف کرتے ہوئے مزید کہا، "اب محاذ کا معاملہ ہے، اس لئے شاید وہ ملنے نہ آئیں، نہیں تو ہمیشہ آتے ہیں..... انتہائی عمدہ آدمی ہے۔ بھئی، میں تو ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔"

"اس پارٹی بازی اور سیاست کو کیا کہا جائے..... کانتی لال جی کو تو حکومت میں ہونا چاہئے تھا۔" وزیر داخلہ نے بڑے دکھ سے کہا۔

"بالکل... وزیر اعلیٰ بولے، "دیکھتے جایئے، مل جائے تو ٹھیک ہے..... میرا سلام کہئے گا۔ نہ ہوں تو پنڈال جانے کی ضرورت نہیں ہے....."

پولیس کمشنر نیا تھا۔ بہت ہچکچاتے ہوئے بولا، "مورچہ والے شاید آپ کا پتا ابھی جلا دینگے، اس کے بارے میں....."

"ارے ٹھیک ہے، جلانے دیجئے..... اس سے آپ قانون کہاں تحلیل ہوتا ہے۔ جوان کے دل میں آئے کرنے دیجئے، آپ اپنی نگرانی رکھیں بصرف، آپ کی یہی ذمہ داری ہے۔" وزیر اعلیٰ نے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

چار بجے چوک میدان سے جلوس چل پڑا۔ مورچہ زبردست تھا۔ سب سے آگے پرچم اور بگل تھے۔ ان کے پیچھے ابھیان گیت گانے والوں کی ٹولی تھی۔ اس کے پیچھے مطالبات کی تختیاں پکڑے عورتوں کی ٹولی تھی۔ اس کے پیچھے ہزاروں کی تعداد میں مظاہرین تھے۔ جگہ جگہ سے آئے ہوئے لوگ سب ٹولیاں لگائے تھے۔ ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پرچم یا مطالبات کی تختی پکڑے تھے۔ مورچہ بہت شان سے چل رہا تھا۔ قطاروں کے دونوں طرف کندھوں سے لاؤڈ اسپیکر لٹکائے نعرے دینے والے رضا کار تھے۔ بیچوں بیچ جھنڈوں سے آراستہ جیپ پر کانتی لال، ان کے ساتھی رہنما اور چند اہم لوگ تھے۔

مورچہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر کوئی حیران تھا۔ پتہ نہیں، اتنے لوگ اچانک کہاں سے نکل پڑے تھے۔ تماش بین شہریوں کی قطاریں جھنڈے والے پولیس کے پیچھے سے حیرت سے جھانک رہی تھیں۔

سچ مچ یقین نہیں ہوتا تھا کہ اتنی تعداد میں لوگ ابھی زندہ ہوں گے کہ وہ اب بھی ان طریقوں پر انھصار کرتے ہوں گے۔ شاندار اور امنڈتا ہوا پر جوش جلوس اپنی پوری طاقت سے بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑے اخباروں کے فوٹو گرافر عمارتوں پر چڑھ چڑھ کر ہر موڑ پر جلوس کی تصاویر کھینچ رہے تھے۔ چند غیر ملکی فوٹو گرافرس اس تاریخی محاذ کو دیکھ کر حیران تھے۔ وہ جمہوریت کی طاقت کے بارے میں ایک آدھ فقرا بول کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے تھے۔ وہ زیادہ تر قبائلیوں والی ٹولی کی تصاویر اتار رہے تھے۔ سرکاری فلمز

ڈویژن کے کیمرہ مین اپنا کام کر رہے تھے۔

لمبی سڑک پر جاتے ہوئے جلوس کا منظر پوشیدہ تھا۔ لاکھوں پیر ہی پیر..... لاکھوں سر ہی سر..... ہزاروں پرچم اور جوش سے بھرے نعرے..... بچھرتا ہوا جم غفیر اور انسانی سروں کا سمندر۔ کہیں اس کا پتا نہیں چل رہا تھا کی یہ جلوس شروع کہاں سے ہے اور کہاں پر ختم۔ میلوں تک پھیلا ہوا یہ جلوس..... تبھی اچانک گڑبڑ شروع ہو گئی..... جلوس کے اگلے حصے میں بھگدڑ مچ گئی۔ اور ساتھ ہی لوٹ مار شروع ہو گئی۔ چاروں طرف بدحواسی کا عالم۔ عمارتوں کی کھڑکیوں اور دکانوں کے دروازے پر پتھر برسانے کی آوازیں آنے لگیں۔ جلوس دوڑتی، بھاگتی، چیختی، چلاتی بدحواس اور اندھی بھیڑ میں بدل گیا۔ اردگرد شدید بدامنی پھیل گئی۔ پھر دھوئیں کے بادل اٹھے..... کچھ آگ کی لپٹیں دکھائی دیں۔ توڑ پھوڑ کی گونجتی ہوئی آوازیں اور گھبراہٹ بھری چیخیں آئیں اور گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ سے ماحول میں سنسنی پھیل گئی۔ دھوئیں کے سمندر میں جیسے لاکھوں لوگ ڈوب رہے ہوں اور ابھر رہے ہوں۔ گرتے پڑتے اور بھاگتے ہوئے لوگ۔ کچلے اور گریدے ہوئے لوگ..... ہنکارے، چیخیں، دھماکے، شور اور تڑتڑاہٹ۔

دیکھتے دیکھتے سب کچھ ہو گیا۔ سڑکوں پر صرف جوتے چپلیں، جھنڈے اور مطالبات کی تختیاں رہ گئیں۔ پھٹے کپڑے، ٹوپیاں، ٹوٹے ڈنڈے اور پھٹی ہوئی جھنڈیاں۔

کچھ پتہ نہیں چلا کہ یہ سب کیسے ہوا۔ کیوں ہوا؟ پولیس کی گاڑیوں میں فسادی اور زخمی بھرے گئے۔ زخمیوں کو ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ فسادیوں کو دس میل لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ وہ غنڈے نہیں تھے، غنڈے پہلے سے بند تھے۔ چوٹیں بہتوں کو آئی تھیں۔ وہ آپس میں کچل گئے تھے۔ پولیس نے گولی چلائی ضرور تھی، پر ہوائی فائر کیے تھے۔ اس گولی سے ایک بھی آدمی زخمی نہیں ہوا تھا۔ اعضاء کی صرف ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔

سارا شہر حیران رہ گیا تھا۔ غنیمت تھی کہ اتنے بڑے حادثے میں صرف ایک لاش گری تھی۔ وہ لاش بھی بالکل سالم تھی۔ اس کو نہ گولی لگی تھی، نہ وہ کہیں سے زخمی تھی۔

پولیس نے لاش کے اردگرد ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ لاش کانتی لال کی ہے۔ کانتی لال نے یہ سنا تو حیران رہ گئے۔ بھگدڑ اور اس شدید بھیانک حادثے سے خوفزدہ ہو کر کچھ دیر بعد وہ لاش کو دیکھنے پہنچے۔ اسے دیکھتے ہی کانتی لال نے جوش سے بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ وزیر اعلیٰ کی لاش ہے۔"

واقع ہوئے حادثے کا معائنہ کرنے کے لئے وزیر اعلیٰ بھی نکل چکے تھے۔ انہوں نے یہ سنا تو سہمے ہوئے پہنچے۔ انہوں نے غور سے لاش کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ میری نہیں ہے۔"

◂◂ ● ▸▸

715 McKay Ave Windsor
Ontario N9B 1Z9 CANADA

● هندی افسانه

● کشن کالجئی/ ترجمه : ڈاکٹر تسلیم عارف

والد

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور جیسے جیسے باہر روشنی کم ہوتی جا رہی تھی، میرے اندر کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ میں اس اندھیرے میں کبھی ماضی میں غوطے لگاتا اور کبھی حال سے الجھتا ہوں۔ ماضی کے کارناموں سے میں حال کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن یہ گتھیاں الجھتی جا رہی ہیں۔ ایک طرف والدِ محترم ہیں تو دوسری طرف منجو۔ بیٹے کے فرض اور شوہر کے فرض کے آپسی ٹکراو میں میری اپنی زندگی تار تار ہو رہی ہے۔ میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ میری زندگی ایسے دوراہے پر آ کر کھڑی ہو جائے گی جب اپنے والد اور بیوی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا میری مجبوری بن جائے گی۔

زندگی کے اس دوراہے پر مجھے اپنے والد کی جدو جہد کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات یاد آ رہی ہیں۔ جمال پور ریل کارخانے کے ایک عام مزدور کی اہمیت ہی کیا ہوتی ہے لیکن انھوں نے بچوں کی سہولت کے لیے اپنی حیثیت سے زیادہ محنت میں دن رات ایک کر دیے۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ خاندانی کاشت کاری بالکل ختم ہو جائے بلکہ اس لیے بھی کہ بڑھاپے میں ان کی بہتر خدمت ہو سکے۔ والد نے ماں کو گھر پر رکھا اور خود اکیلے شہر میں رہ کر بچوں کو تعلیم دلائی۔ بچوں کے لیے دونوں وقت کھانا پکانا، ان کے کپڑے دھونا اور اس کے ساتھ مالی تنگی کو دور کرنے کے لیے کارخانے میں اُووَر ٹائم کرنا اپنے آپ میں ایک بڑا چیلنج تھا، جس کا انھوں نے مسکراتے ہوئے سامنا کیا۔ یہ سوچ کر میری روح تڑپ اُٹھتی ہے کہ میرے والد جو کہ ایک مزدور تھے، انھوں نے اپنے خاندان میں ایک توازن قائم رکھا تھا اور ایک میں ہوں جو پڑھا لکھا بینک افسر ہو کر اپنے خاندان کی ذمہ داریوں میں پچھڑ رہا ہوں۔

میں اپنے خاندان کے ڈھانچے میں بابو جی کو شامل کر کے پوری طرح سے مطمئن ہونا چاہتا ہوں جب کہ میری بیوی منجو انھیں گھر سے الگ کر کے خوش رہنا چاہتی ہے۔ اپنے اپنے ارمانوں کا ٹکراو بیچ بیچ میں ہوئی چھوٹی لڑائیوں میں شامل تھا لیکن مجھے اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن یہ لڑائیاں

میری زندگی کا ناسور بن جائیں گی۔

اپنی پچھلی زندگی میں جھانک کر میں یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ مجھ سے کہاں اور کیا غلطی ہوئی ہے جس کی بنا پر میری زندگی سے خوشیاں معدوم ہو گئیں۔ لاکھ کوششوں کے باوجود مجھے اس کا کوئی سُراغ نہیں مل پایا لیکن اس کوشش میں ماضی کے چند اوراق میرے سامنے آنے لگتے ہیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اپنے والد کو ایک محنت کش مزدور کی شکل میں ہی دیکھا۔ وہ صبح چار بجے بستر سے اُٹھ کر ایک ماہر خاتونِ خانہ کی طرح گھریلو کام انجام دیتے۔ جھاڑو پوچھا کرنے کے بعد وہ کھانا بنانے میں لگ جاتے۔ تقریباً ساڑھے چھے بجے تک اُن کا کھانا تیار ہو جاتا تھا۔ جلدی جلدی ہلکا ناشتہ کر کے وہ اپنا ٹفن لے کر کارخانے کے لیے نکل جاتے۔ ہر لمحے کا استعمال کیسے کرنا ہے، والد صاحب کو یہ بات بہت اچھی طرح پتا تھی۔ اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ کارخانہ جاتے تو بچوں کا گندا کپڑا ساتھ لے کر جاتے تھے۔ لنچ کے وقت گیارہ سے بارہ بجے تک جو چھٹی ملتی، اُسی میں وہ اُن کپڑوں کو دھو لیتے اور سکھا کر آئرن بھی کر لیتے۔ شام کو بابو جی جب گھر آتے تو پھر رات کا کھانا پکانے میں لگ جاتے۔ ہم لوگ جب شام کی پڑھائی ختم کر لیتے تو وہ سب کو بڑے پیار سے کھانا کھلاتے۔ سبھی کا بچھاون اور مچھر دانی لگا کر خود رات کے وقت اُووَر ٹائم کرنے کارخانے چلے جاتے یا پھر سائیکل سے سولہ سترہ کیلومیٹر دور گانو جاتے اور صبح پھر اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہتے۔ برسوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔

بھیا نے جب ٹسکو (TISCO) میں پی۔ آر۔ او کی نوکری حاصل کر لی تو والد کو لگا کہ ان کی محنت رنگ لے آئے گی۔ دو برس بعد میری بھی نوکری ہو گئی جو میرے والد کے خواب کے سچ ہونے جیسا تھا۔ پھر باری باری سے دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی۔ دونوں کو اچھا شوہر اور گھر نصیب ہوا۔ بابو جی زندگی میں جدو جہد اور توکل پسندی کا زبردست امتزاج تھا لیکن ریل کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اُن کی خوشیوں میں جیسے گرہن لگ گیا۔ ماں گھر میں کام کرتے ہوئے سیڑھی سے گری تو پھر اُٹھ ہی نہ سکی۔ ماں کی موت نے انھیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا اور گانو سے ان کا دل اُچٹ گیا۔ ایک ریٹائرڈ ریل ملازم کا دل اگر اپنے گھر اور گانو سے اُچٹ جائے تو اُس کے لیے عرصۂ حیات کس قدر تنگ ہو جاتا ہے اس کی زندہ مثال میرے والد تھے۔ درگا پوجا میں سبھی بھائی بہن گھر آئے ہوئے تھے۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ بابو جی بھیا کے ساتھ جمشید پور میں رہیں گے۔ اس کے بعد بھیا انھیں جمشید پور لے گئے۔

شروع کے کچھ ماہ تو بھیا بھابھی کا سلوک بابو جی کے ساتھ ایسا رہا کہ انھیں یہ احساس ہونے لگا کہ زندگی میں دوبارہ نمی واپس آ گئی ہے لیکن یہ احساس بالکل لمحاتی ثابت ہوا۔ دھیرے دھیرے بھابھی کو

بابو جی کا ساتھ رہنا بوجھ معلوم ہونے لگا۔ انھوں نے ایسی کھٹ پٹ شروع کر دی کہ وہ واپس گانو آ گئے۔ تب تک میرا تبادلہ مدھوپور سے جمال پور کے ایک بینک میں ہو چکا تھا۔ والد کی تکلیف اور اُن کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں انھیں اپنے ساتھ جمال پور میں ہی رکھنا چاہتا تھا لیکن انھوں نے منع کر دیا۔ ایک دن سنیچر کے روز بینک سے آنے کے بعد میں منجو کے ساتھ پھر گانو گیا اور کافی منت سماجت کے بعد آخر کار بابو جی کو ہمارے ساتھ رہنے کے لیے راضی کر لیا۔

تب ہم لوگ کرائے کے ایک چھوٹے مکان میں رہتے تھے۔ بابو جی نے ہی ہمیں اس بات کی ترغیب دی کہ شہر میں اپنا ایک مکان ہونا چاہیے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت ملے ہوئے پیسوں سے انھوں نے زمین خرید دی۔ مکان بنانے کے لیے ہمیں بینک سے قرض آسانی سے مل گیا لیکن مکان بنوانا اپنے آپ میں ایک مشکل کام تھا۔ بینک کی ملازمت اس کی مہلت ہی نہیں دیتی تھی کہ مکان بنانے کے کام کی دیکھ ریکھ کی جا سکے۔ یہ بابو جی ہی تھے جنھوں نے دن رات اپنا خون پسینہ لگا کر اس مکان کو کھڑا کیا۔ مزدوروں کے ساتھ مزدوری کر کے جس باپ نے یہ مکان بنوایا، آج وہی بے گھر ہو رہا ہے۔

کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ بابو جی جب گھر سے نکلنے لگیں گے تو منجو کھڑی ہو جائے گی ___ ''بابو جی جو ہُوا اُسے بھول جایئے، میں نے جو غلطی کی ہے، اس کے لیے چاہے جو سزا آپ دینا چاہیں دے دیں لیکن گھر چھوڑ کر مت جایئے'' اور بابا مان جائیں گے۔ پہلے بھی تو ایک مرتبہ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ بابا جب گھر سے نکل رہے تھے تو بھولو انھیں پکڑ کر رونے لگا تھا--- ''دادو آپ چلے جائیں گے تو مجھے اسکول کون پہنچائے گا؟''

پھر بھولو کو گود میں لے کر بابو جی گھنٹوں روئے تھے اور اپنے آنسوؤں سے ساری شکایتوں کو دھو دیا تھا۔ وہ بھولو تو آج بڑا ہو چکا ہے۔ کیا وہ بھی اپنے دادو کو نہیں روکے گا؟ کیا ٹھکانا، منجو نے اُسے بھی کوئی پٹی پڑھا کر اپنی طرح بے حس بنا دیا ہو؟

کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ منجو میرے لیے چائے لے کر کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا - ''بابو جی کو چائے دی؟''

''میں نے سارے گھر کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے، جس کو پینا ہے، خود سے بنا لے۔''

یہ بات بابو جی نے سُن لی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے انھوں نے کہا- ''بہو! میری فکر مت کرو، میں نے چائے چھوڑ دی ہے۔''

لیکن میں نے منجو سے کہا۔ ''اگر تم بابا کے لیے چائے نہیں بنا سکتی تو میرے لیے بنانے کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بنا لوں گا۔'' یہ سنتے ہی منجو نے کپ پلیٹ کو زور سے پٹکا۔ چائے سمیت کانچ کے ٹکڑے کمرے میں بکھر گئے۔

کانچ کے بکھرے ٹکڑوں میں جو عکس مجھے نظر آیا، وہ ہماری حسرتوں کا ہی گھر تھا۔ میں کانچ کے بکھرے ٹکڑے سمیٹنے کے لیے جھکا، تب تک بابو جی نے بھی اُن ٹکڑوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ بھولو بھی اسی کام میں لگ گیا۔ ایک گھر کی تین پشتیں ٹوٹے کانچ کو سمیٹنے میں لگی تھیں۔ بابو جی میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگے اور میں بھولو کی آنکھوں میں وہی چیز ڈھونڈنے لگا۔

◄◄ ● ►►

Department of Urdu, Ranchi University, Ranchi
Mob: 09990391251, 07870275969
Email: tasleem171@gmail.com

نام رسالہ: ادب وثقافت ۳ (ششماہی) مدیر : پروفیسر محمد ظفرالدین اشاعت: ستمبر ۲۰۱۶ء صفحات: ۲۴۸ ملنے کا پتہ: ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد		نام رسالہ: تمثیل نو (ماہنامہ) دربھنگہ مدیر اعزازی: ڈاکٹر امام اعظم اشاعت: جون ۲۰۱۶ء صفحات: ۴۱۶ قیمت: ۱۵۰ روپے ملنے کا پتہ: محلہ گنگوارہ، سارا موہن پور، دربھنگہ
نام رسالہ: انشاء (مختصر تخلیقات نمبر) مدیر : ف۔س۔اعجاز اشاعت: جنوری/فروری ۲۰۱۶ء قیمت: ۲۰۰ روپے صفحات: ۲۱۴ ملنے کا پتہ انشاء پبلی کیشنز، زکریا اسٹریٹ، کولکاتہ		نام رسالہ: سہ ماہی کاوش مدیر : فہیم بسمل اشاعت: اپریل تا ستمبر ۲۰۱۶ء قیمت: ۵۰ روپے صفحات: ۸۸ ملنے کا پتہ: ایمن زئی جلال نگر، شاہ جہاں پور

● مائکرو فکشن

● نیلم احمد بشیر

شام ڈھلے

اب تو عادت سی بن گئی ہے۔ میں شام ڈھلتے ہی لارنس باغ کی سیر کو نکل جاتا ہوں۔ لارنس مجھے سحر زدہ کر دیتا ہے۔ تازہ ہوا، خوشگوار فضا، قدیم، سرسبز، خوبصورت، شاہانہ انداز میں ایستادہ وہ درخت مجھے ہر شام متوجہ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور پھر درختوں پر لٹکی ہوئی بڑی بڑی سیاہ چمگادڑیں بہت عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ یوں جیسے یہ پراسرار مخلوق اپنے بنانے والے سے سوالوں کے جواب پانے کے لیے اُلٹی لٹکی ہوں۔ ان کو گتھا لپھا ہوتے دیکھ کر مجھے بہت سی ہارر فلمیں یاد آ جاتی ہیں، جو میں نے بار بار دیکھ رکھی تھیں۔ آخر ان چمگادڑوں کا راز کیا ہے؟ میں سوچنے لگتا تو مجھے اُن سے ڈر محسوس ہونے لگتا، کہیں مجھ سے آ کر چمٹ نہ جائیں۔ یہ سوچتے ہی میں اپنی سپیڈ بڑھا دیتا اور اُن سے دور بہت دور نکل جانے کی کوشش کرنے لگتا۔

کل شام بھی میں معمول کے مطابق اپنی سیر اور خیالوں میں مگن چلتا جا رہا تھا۔ اردگرد کی جھاڑیوں میں چھپے جوڑوں کی نزدیکیاں اور کھسر پھسر دیکھ کر میرے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

''بھلا محبت کرنے والوں کو کوئی کیسے روک سکتا ہے؟'' میں نے زیر لب کہا۔

تھوڑا سا آگے گیا تو ایک جھاڑی کے قریب بیٹھی دو خواتین نظر آ گئیں۔ میری رفتار خود بخود دھیمی ہو گئی۔ عجیب بات ہے وہ دونوں اپنے گھریلو اخراجات پر بحث کر رہی تھیں۔ بھلا لارنس باغ میں کوئی ایسی باتیں کرنے آتا ہے...... ایک عورت کچھ عمر رسیدہ تھی اور دوسری جوان۔ اُن کے چہرے یہی بتا رہے تھے۔

''رکشے کے پیسے بھی نہیں بچیں گے...... گھر واپس کیسے جائیں گے؟'' بڑی نے اُداس لہجے میں کہا۔

''مجھ سے کیا کہتی ہو؟ بچا لیے ہوتے نا۔'' چھوٹی تنک کر بولی۔

''منے کی فیس کی کل آخری تاریخ ہے...... اور پھر تیرے ابا کی دوا بھی لانا ہے......'' بڑی بولی۔

''میں نے تو بس موبائل فون کے ایزی لوڈ کے لیے دو سو رکھے ہیں...... وہ تو ضروری ہیں، وہ تو

نہیں دوں گی۔'' چھوٹی جھنجھلا کر بولی۔

میرے دل میں رحم کا سمندر موجیں مارنے لگا۔ بے چاری مجبور، مظلوم عورتیں۔ کیوں نہ ان کی کچھ مدد کر دوں، مگر پھر سوچا...... کہیں وہ اس کا کوئی غلط مطلب ہی نہ نکال لیں...... نہیں نہیں...... مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ مگر انہیں چاہیے ایسی باتیں گھر جا کر کریں...... اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے...... ہاں مگر میرا کیا لینا دینا...... جو مرضی کریں۔ مجھے چاہیے سیر ختم کر کے جلدی جلدی گھر پہنچوں۔ شام کو میرا اپنے دوستوں کے ساتھ ڈنر اور فلم دیکھنے کا پروگرام ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ چند ہی قدم بڑھا تھا کہ کانوں میں ایک آواز آئی......

''سنیے''۔ میں چونکا اور گردن گھما کر دیکھا......

دو چمگادڑیں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ مجھے رُکتے دیکھ کر جوان والی نے اپنا برقعہ تن سے نیچے گرا دیا۔ میری نظر اُس کے خوبصورت، پرکشش وجود پر پھسلتی چلی گئی۔

بڑی والی نپے تلے قدم اُٹھاتی میرے قریب آئی اور جوان والی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''سر جی...... کچھ موڈ ووڈ ہے؟''

◀◀ ● ▶▶

28/B Lane V. Cavalry Ground
Lahore Cantt. 54180 (Pakistan)

● سلمیٰ جیلانی

تتلی کے پر

اس نے تتلیوں کے پر نوچ ڈالے جس رات آخری تتلی اس کا نشانہ بنی سمندر کی اونچی لہروں نے اس کا قیمتی کانیج بہا ڈالا۔

وہاں سے کئی ہزار میل کے فاصلے پر ایک تتلی اب بھی پر پھڑ پھڑاتی باغ میں پھولوں کا رس چوس رہی تھی۔

☆☆☆

طوفان

اس کا دعویٰ تھا وہ اپنے زور خطابت سے سمندروں میں طغیانی لا سکتا ہے۔

اور واقعی ایسا ہو گیا تھا۔

چائے کی پیالی میں طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

☆☆☆

برانڈ نیم

وہ پتوں کو کھاتا جا رہا تھا یہاں تک کہ درخت ٹنڈ منڈ تنا رہ گیا مگر وہ خود پھول کر کپا بن گیا اتنا موٹا کیڑا ریشم کیسے کاتے گا اس کو لڑکی نے باغ سے نکال کر پیچھے بہنے والی بدرو میں پھینک دیا گندے پانی کی باس اور اس میں اگنے والی کائی کھا کھا کر اس نے جو کھدر بنایا وہ مارکیٹ میں ریشم سے کئی گنا مہنگا تھا اس پر لگی برانڈ نیم کی ٹیگ دیکھ کر لڑکی اپنے سوئمبر میں پہننے کو لے گئی۔

☆☆☆

انتظار

نیند سے بوجھل آنکھیں جیسے خواب کی کیفیت میں اسے جاتے دیکھ رہی تھیں دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

اس کا عکس سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا بارش کے قطرے اب بھی اس کے لباس سے موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔

اس نے موتی اپنی آنکھوں پر چن لئے اور دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

☆☆☆

حلال

دیکھا...... میں نہ کہتا تھا حرام نوکری چھوڑتے ہی مجھ پر رحمتوں کی بارش ہو جائے گی۔

کتنے جلدی اکاونٹنٹ کی جاب مل گئی وہ بھی سیٹھ حبیب کے خالص اسلامی کاروباری ادارے میں

......ایک تم تھیں ہمیشہ مجھے روکتی ہی رہیں۔

آپ کے ذہن میں جانے کیوں یہ بات بیٹھ گئی ہے...... آپ نے ایک پیسا بھی بے ایمانی سے نہیں کمایا...... برابر والی آئی تھیں آپ کی تعریف کر رہی تھیں...... ان کے بیٹے کو جو قرضہ دلوایا تھا اس نے اپنا ورکشاپ کھول لیا ہے...... بے چارہ...... کب سے بے روزگار تھا۔

وہ سب ٹھیک ہے...... مگر اللہ کو ناراض تو نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا صاحب کہہ رہے تھے بینک کی نوکری اللہ سے جنگ ہے۔

میں مزید ضمیر کا بوجھ نہیں سہ سکتا۔

تربیتی نشست کے دوران اکاونٹ کنٹرولر نے خفیہ لاکر سے یو ایس بی نکالی اور لیپ ٹاپ میں فٹ کرتے ہوئے بولا ''یہ کوڈز خاص طور پر نوٹ کر لیجئے۔''

جن فائلز پر آئسی کا کوڈ ہے وہ انکم ٹیکس والوں کے لئے ہیں...... ان میں بڑے کنٹریکٹس کی آمدنی کی تفصیل درج نہیں کرنا۔

ان کے لئے الگ کوڈ ہیں۔

وہ کیا؟

''حلال''

☆☆☆

کمرشل کلچر

سفید یونیفارم میں ملبوس لڑکی نے جہازی سائز ان کیوبیٹرز میں مرغی کے انڈے ترتیب سے

سجائے۔تھوڑی دیر میں سینکڑوں کی تعداد میں ننھے منے چوزے چوں چوں کرتے ٹریز میں سے جھانکنے لگےاس نے ناامیدی سے سوچاان کی بھی کیازندگی ہے۔

اگلے چینل پر دوسری ویڈیو میں بھاری بھرکم گائے دردزہ سے تڑپ رہی تھی بغیر کسی طبی مدد کے بچہ پھٹ سے باہرآ گیا گائے ابھی اسے چوم چاٹ کر دودھ پلانے ہی کوتھی کہ مالک کے بھیجے ہوئے قصائی اسے چھین کر لے گئے اور ایک دیوہیکل کھلے ہوئے ٹرک میں ڈال دیا جو پہلے ہی سے اس جیسے درجنوں نو زوائدہ بچھڑوں سے بھرا ہوا تھا ٹرک کے پیچھے بھاگتی گئیں مائیں دیکھ کراس کے دل میں بے رحم کمرشل کلچر کے خلاف شدید نفرت کی لہر اٹھی

آہ......درد کی زبردست لہر اس کی کمر سے بھی آٹھ رہی تھی............

نرس نے گل گوتھنا سا بچہ تولیہ میں لپیٹا اور اس کے بستر کی طرف بڑھی......اس کے ہاتھ بے اختیار اسے گود میں لینے کوآٹھ گئے مگر سرہانے کھڑے امیر وکبیر جوڑے نے لپک کر اسے تھام لیا......

اس نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چپکے سے انگلی کی پوروں سے صاف کیا اور معاہدے کی رسید پر حتمی دستخط کردیئے۔

وہ خود بھی تو کرائے کی کوکھ تھی۔

« ● »

147-Whitney Street
Block House
Post Code-0600
Auckland, Newzeland

● مہ جبین آصف

دکان آئینہ ساز

مقامی آرٹ گیلری میں پینٹنگ کی نمائش تھی۔آرٹ گیلری کیا تھی گویا مجموعہ شاہکار۔اعلی حس لطیف کے حامل......سرمئی دھوئیں اڑاتے......صندلی سگار منہ میں دبائے مخمورزدہ ساحر ماحول میں اپنے ذوق اعلی کی بولیاں لگانے......روحانی تعیش جینے کی خواہش سے چور۔لوگ موجود تھے......مصور کے آلات ہنرخون دل سے بنے شہہ پارے......تخلیق کے کرب سے کشید لمحے۔سب ہی خرید وفروخت کے عمل سے گزارے جارہے تھے......کچھ ہی دیر کے بعد سرمئی سوٹ میں ملبوس صندلی سگار منہ میں دبائے۔سیٹھ نے اک شہکار پینٹنگ گاڑی میں رکھوائی......لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اک اور تخلیق کا نمونہ......اک حسین شہہ پارہ......ذوق جمال کو......حس لطیف وجسمانی تعیش کو مہمیز کرتا......قدرت کے برش سے پینٹ شدہ رنگوں میں ڈھلی خاکی وقوسی تخلیق......اجنتا کی مورت......مریم کے تقدس......نور سے ڈھلے معطر پیکر کی بھی ،آج رات،،کے لئے بکنگ کرانا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

آگ کے پھول

شاداں کچی پکی پگڈنڈیوں کے خار......تپتے جلتے آبلے اس امید پر سہلا لیتی تھی کہ آج نہیں تو کل اپنے گھر کی چھاوں ان آبلوں کو پھول بنادے گی......انہی میٹھے نرم ونازک جذبوں کی طلب لال دہکتے جوڑے میں لپٹی شاداں کو شہر لے آئی......اور آج محض خرچہ طلب کرنے کا جرم......فضا میں چیخوں کی صورت گونجا......اس کے چہرے پر پھول ہی پھول تھے......آگ کے......!!!

« ● »

4227/A Metrovile 3 Block 1
Gulshan-e-Iqbal Karachi Pakistan 7500

● سبین علی

ہمجولی چڑیا

سنہرے پروں والی چڑیا پکڑنے کی دھن میں اک ننھی بچی بستی سے بہت دور نکل گئی۔شام ہونے کوآئی فلک پر بادل چھا گئے. ہوا سرد ہوئی تو جنگل کی باڑ پر اداس بیٹھی سوچنے لگی اب واپس کیسے جاؤں۔

چلتے چلتے جب پاؤں تھک گئے تو اسے اپنے ماں باپ بہت یاد آئے۔

اُس کی یہ بیچارگی دیکھ کرسنہرے پروں والی چڑیا دلاسہ دینے آئی،

''اداس مت ہو پیاری ہمجولی۔''

اس چڑیا کو اپنے سامنے پاکرننھی بچی کے دل میں اسے پکڑ لینے کی خواہش نے دم توڑ دیا۔

تب جا کر احساس ہوا کہ اتنی دور نکلنے کی......اسے پکڑنے کی کیا ضرورت تھی......

یہ چوں چوں کرتی سنہری چڑیا تو روز اس کی کھڑکی پر آکر سریلے نغمے سناتی ہے۔

« ● »

Al-Safa Distt. Jeddah
Saudi Arabia
Cell : 00966564274322

● اقبال حسن آزاد

وقت

اس کے گھر میں چار کمرے تھے اور ہر کمرے میں ایک دیوار گھڑی تھی۔علاوہ ازیں اس کے پاس ایک کلائی گھڑی بھی تھی اور پانچ موبائل بھی تھے اور چونکہ آجکل ہر موبائل میں گھڑی بھی ہوتی ہے اس طرح کل ملا کر اس کے یہاں دس گھڑیاں تھیں۔ان تمام گھڑیوں کا وقت اس نے پانچ منٹ آگے کار کھا ہوا تھا۔ ایک دفعہ ان دیوار گھڑیوں میں سے ایک خراب ہوگئی اور کافی عرصہ تک خراب ہی پڑی رہی۔پھر ایک دن اسے اس گھڑی کی مرمت کا خیال آیا اور وہ اسے لے کر ایک گھڑی ساز کے پاس گیا۔گھڑی کا ایک پُرزہ خراب ہوگیا تھا جسے بدل دیا گیا۔گھڑی پھر سے چلنے لگی۔گھڑی ساز نے اس میں وقت درست کیا اور وہ اسے لے کر واپس آ گیا اور اسے اس کی مقررہ جگہ پر ٹانگ دیا۔اور اس پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی۔اسے ایسا لگا جیسے کچھ غلط ہوگیا ہے۔پھر نے پھر گھر کی دوسری گھڑیوں پر نظر ڈالی۔ہر گھڑی وقت سے پانچ منٹ آگے تھی۔اس نے اس مرمت شدہ گھڑی کو یونہی رہنے دیا کیونکہ یہ صحیح وقت بتا رہی تھی۔چند روز گزر گئے۔ہر گھڑی اپنی اپنی رفتار سے چل رہی تھی اور ایک گھڑی پانچ منٹ پیچھے تھے۔اسے کچھ عجیب سا لگنے لگا جیسے یہ گھڑی سب سے پھسڈی ہے۔کسی غبی اور کند ذہن لڑکے کی طرح۔آخر ایک دن اس نے اس کا وقت بھی پانچ منٹ بڑھا دیا اور اب وہ مطمئن تھا۔

« ● »

Shah Zubair Road
Shah Colony, Munger811201
Mobile: 9430667003

● ابن آس محمد

سولفظی کہانیاں

بدلہ

توہین کیسے برداشت کرتا۔
بپھر کر آگے بڑھا.....اور بدتمیز باس کی گردن پکڑ لی۔
''سمجھتے کیا ہو خود کو.....؟''
''کوئی عزت نہیں کیا ہماری .....انسان نہیں ہیں.....؟
اُس نے باس کو دو چار جڑ دیے۔
ملازم ہوں .....غلام نہیں.....سمجھے.....''
پچھلی تمام بے عزتیوں کا بدلہ چکا لیا۔
''اب کرو گے اسلٹ.....؟''
باس معافیاں مانگنے لگا۔
غصہ کنٹرول کرتے ہوئے اُس نے باس کو چھوڑ دیا.....اور ہانپنے لگا۔
''کتے کی طرح منہ لٹکا کر کیوں کھڑے ہو، دفع ہو جاؤ.....گیٹ آوٹ'' باس اچانک دہاڑا۔
وہ جھرجھری لے کر چونکا۔
اور اپنے تصور سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

بھائی بہن

راجا گلی میں بیٹھتا تھا.....ساجدہ کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔
ساجدہ کو غصہ بہت تھا اس بات پر۔

وہ ایک دن اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
''کیوں رے.....مجھے کیوں چھیڑا تم نے.....؟''
راجا سٹ پٹا گیا۔'' کب چھیڑا.....میں نے تو دیکھا تک نہیں.....''
''بکواس مت کر.....'' ساجدہ چلائی.....پھر شور مچا دیا۔
لوگ جمع ہو گئے.....راجا کی خوب دھلائی ہوئی۔
راجا نے سب کے سامنے.....ساجدہ کو بہن کہہ کر جان بچائی۔
کچھ ماہ بعد.....
راجا اور ساجدہ کی شادی ہو گئی۔
دونوں بہن، بھائی.....ایک دوسرے سے پیار بھی تو بہت کرتے تھے۔

☆☆☆

ذلیل

اُس کی کابینہ میں شریف کم ہی تھے.....ایک دو کو چھوڑ کر۔
اور سالے سب کے سب.....کرپٹ، چور، لٹیرے۔
جو بہ ظاہر شریف تھے.....وہ بھی اپنی ماں کے یار نکلے۔
لوگ تو غلام تھے.....یا بے وقوف.....
جب موقع آتا.....اُنہیں کو ووٹ دیتے۔
اور وہ مزے کرتے.....مگر کب تک.....؟
بھانڈا پھوٹا.....تو کئی لوگ رگڑے میں آئے۔
سارے چینلز.....میڈیا.....اور دنیا بھر میں ذلیل ہوئے۔
کرپٹ تو ویسے بھی ذلیل ہی ہوتا ہے۔
سارے کرپٹ لوگ ذلیل ہوتے ہیں۔
مگر سارے ذلیل کرپٹ نہیں ہوتے۔
کچھ لوگ اپوزیشن میں بھی تو ہوتے ہیں۔

☆☆☆

غیرت مند

پیار کرنے والی بہن کا زخمی جسم تڑپ رہا تھا۔
بھائی نے پیار کرنے والی بہن کو نفرت سے سات چھریاں ماری تھیں۔
زخمی لڑکی سب کے سامنے سسکتی رہی.....
زندگی کی بھیک مانگتی رہی.....
دردِ نزع سے کانپتی رہی۔
لوگ اُس کی موت کا live منظر دیکھتے رہے۔
قاتل بھائی کی غیرت پر آفرین کہتے رہے۔
اُس نے اپنی غیرت کا ثبوت دے دیا تھا۔
سب کے سامنے وہ غیرت مند بھائی.....
اپنی تڑپتی، سسکتی.....مرتی ہوئی بہن کے قریب بیٹھا.....
کسی اور غیرت مند بھائی کی بے غیرت بہن کو آئی لو یو کا میسج بھیج رہا تھا۔

☆☆☆

روبوٹ

ابن آدم کو بنت حوا سے پیار ہو گیا.....
مگر وہ مانتی نہیں تھی۔
ابن آدم نے سوچا۔
بنت حوا جب اُسے اچھی طرح جان جائے گی.....تب ہی محبت کر سکے گی۔
اُس نے ایک روبوٹ بنایا۔
ہو بہو.....اپنے جیسا.....
پھر بنت حوا کو گفٹ کر دیا۔
روبوٹ بہت تابع دار.....اور فرماں بردار تھا۔
بنت حوا جلد ہی روبوٹ کی عادی ہو گئی۔
اُس کے بغیر جینا مشکل لگنے لگا۔

تب ابن آدم نے روبوٹ کی جگہ لے لی.....وہ روبوٹ جیسا بن گیا.....
مگر نا کام ہو گیا.....بنت حوا کو تو روبوٹ ہی چاہیے تھا۔

☆☆☆

انسان

فاقے کا تیسرا دن تھا.....
اُس کے شوہر کو پولیس لے گئی تھی.....
خود وہ.....شدید بخار میں پھنک رہی تھی۔
بچے بھوک سے بلبلا رہے تھے۔
تیسرے روز.....دروازہ بجا۔
اُس نے.....کسی نہ کسی طور جا کر دروازہ کھولا۔
دروازے پر اُس کا پڑوسی.....ڈیوڈ کھڑا تھا.....
''بھابھی.....کھانا لایا ہوں.....بچوں کے لیے.....''
اُس نے حیرت سے دیکھا.....وہ کہہ رہا تھا۔
''میں نے سُنا ہے.....وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا.....جس کا پڑوسی بھوکا ہو.....''
''مم.....مگر ڈیوڈ.....تم تو.....تم تو.....؟'' وہ ہکلائی۔
''مومن نہیں ہوں میں.....'' ڈیوڈ مسکرایا۔''مگر بھابھی.....انسان تو ہوں.....''

☆☆☆

ریموٹ

اُس کے پاس جادوئی ریموٹ تھا۔
اُس کا شوہر.....اُس ریموٹ سے چلتا تھا۔
بٹن دبائی.....تو اُٹھتا.....بٹن دبائی تو بیٹھ جاتا۔
بٹن پر سوتا.....بٹن پر روتا.....بٹن پر کھاتا.....بٹن پر پیتا.....
بٹن سے اظہار.....بٹن سے پیار.....
شوہر ریموٹ سے چلے تو زندگی میں سکون ہوتا ہے.....وہ بھی بہت پرسکون تھی۔

مگر ایک رات جب..... بٹن دبایا..... تو شوہر نے غرا کر دیکھا۔
اَب وہ جب بٹن دباتی..... شوہر گھور کر دیکھتا.....
وہ سمجھ گئی کہ ریموٹ خراب ہوگیا.....
ناسمجھ عورت..... جانتی نہیں تھی..... کہ ریموٹ نہیں..... شوہر خراب ہوگیا تھا۔''

☆☆☆

فن کار نہیں مرتا

نارگٹ کلرز کی میٹنگ تھی۔ نامی گرامی قاتل جمع تھے۔ سب کو فہرستیں دے دی گئیں۔
ڈاکٹرز، انجینئرز، سیاست دان..... علما، پولیس افسران.....
دولت مند، بااثر، فن کار..... سب کے نام تھے۔
''جتنے بڑے لوگ ہیں.....'' باس نے کہا۔
''ایک ایک کر کے مارنا ہے سب کو.....''
''لیکن باس..... ان کو مار کر کیا ملے گا۔؟'' ایک نے پوچھا۔
''دہشت پھیلے گی.....'' جواب دیا گیا۔
''جب بڑے لوگ مرتے ہیں.....
تو چھوٹے لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔''
'' پھر اس میں سے فن کاروں کے نام نکال دو.....''
''کیوں.....؟''
''کیوں کہ فن کار تو مرتا ہی نہیں ہے باس.....''

☆☆☆

حرام کا بچہ

نماز کے بعد چاروں مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے.....
پگڑی والا پیش امام..... ٹوپی والا..... ننگے سر اور ایک گنجا۔
''امدھی کی بخشش نہیں ہوگی.....'' ٹوپی والا بولا۔
''وجہ.....؟'' ننگے سر نے پوچھا۔

''حرام کے بچوں کو پالتا تھا.....''
''توبہ توبہ..... شرم کی بات ہے۔''
''جہنم کی آگ میں جلے گا.....''
''کون..... حرام کا بچہ.....؟''
''نہیں..... انسانیت کا کچھ لگتا..... جہنمی.....''
کچھ دیر..... جہنمی کے لیے خاموشی اختیار کی گئی۔
''تم بھی تو کچھ بولو مولوی صاحب..... جہنمی کے بارے میں۔''
''میں کیا بولوں..... میں تو وہ حرام کا بچہ ہوں.....
جو اس جہنمی کو جھولے میں ملا تھا.....''

☆☆☆

مزہ

ویران سڑک پر دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔
خاموش..... بغیر کلام کیے..... سڑک ختم ہوگئی.....
تب پیچھے والے نے آگے والے کو روک کر پتا پوچھا.....
آگے والے نے نظریں اٹھائیں..... پیچھے والا، اُس کے شہر کا نہیں تھا۔
''تم کیا کر رہے ہو میرے شہر میں.....؟
جاؤ..... اپنے شہر میں جا کر مرو.....''
وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''تم..... تم مجھ سے نفرت کرتے ہو.....؟
''نہیں.....'' پہلا بولا۔ ''تو پھر تم نے ایسا کیوں کہا.....؟''
''بات یہ ہے دوست..... دوسرے شہر سے آنے والے سے نفرت کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے
..... اور میں مزہ لے رہا تھا۔''

Flat No. : A-12 1st Floor,
Blaze Towers Main Rashid Minhas Road
Gulshan-e-Iqbal, Karanchi 0321-2043587

● ناولٹ
● م.ص.ایمن

دلبرداشتہ

ریڈیو، ٹی وی پر اور اخبارات میں مسلسل خبریں آرہی تھیں کہ حکومت نے عوام کی دلچسپی کی خاطر چڑیا گھر کے لیے مختلف ممالک سے نئے نئے جانور منگوائے ہیں اور لوگ اپنے بچوں سمیت چڑیا گھر کی سیر کے لیے جوق در جوق آرہے ہیں۔ ایسی خبریں سن سن کر بچے اپنے والدین سے فرمائش کرتے کہ ہم بھی نئے نئے جانور دیکھیں گے اور والدین ان کی فرمائش پوری کر دیتے۔ جو بچے چڑیا گھر کی سیر کر آئے تھے وہ اپنے ہم جماعتوں سے اس موضوع پر ذکر کرتے چڑیا گھر کی سیر کا آنکھوں دیکھا احوال اپنی زبانی سناتے تو دیگر بچوں کا جی بھی چاہتا کہ ''ہم بھی دیکھیں گے۔'' لاڈلے بچے اپنے ماں باپ سے فرمائش کرتے تو ان کے والدین انہیں اسی دن، شام کے اوقات میں لے جا کر ان کی فرمائش پوری کر دیتے یا قریب ترین 'چھٹی کے دن' کا وعدہ کر لیتے۔

عدنان! ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کی جماعت کے تقریباً تمام لڑکے چڑیا گھر کی سیر کر آئے تھے۔ وقفے کے دوران اپنے ہم جماعتوں کو مزے مزے سے اس تفریح کا احوال سناتے۔ سکول میں، کلاس میں تقریباً روزانہ ہی چڑیا گھر میں آئے ہوئے نئے جانوروں کا تذکرہ ہوتا۔ عدنان کوئی للو پنجو گھرانے سے تعلق نہ رکھتا تھا کہ چڑیا گھر کی سیر نہ کر سکتا! دراصل جب بھی وہ اپنی امی سے کہتا، امی کہہ دیتیں کہ ''چھٹی کے دن چلیں گے جب ابو کی بھی چھٹی ہوگی۔''

اشفاق صاحب! ایک پرنٹنگ پریس کے مالک تھے۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزرتا۔ اتنا بھی کہ بیوی بچوں کے لیے وقت نکالنا بہت ہی مشکل ہو جاتا تھا۔ جس قدر رابطے زیادہ تھے اسی قدر مصروفیت بھی زیادہ تھی۔ جب چھٹی کا دن آتا تو ان کا کسی نہ کسی دعوت میں بلاوا بھی موجود ہوتا بلکہ بعض چھٹی کے دن تو ایسے بھی ہوتے کہ دو سے بھی زیادہ دعوتی کارڈ آئے ہوئے ہوتے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ کسے اولیت دی جائے اور کس سے معذرت کی جائے۔ آخر کار یہی ہوتا کہ ایک ہی

دن دو دو اور تین تین جگہ حاضری دی جاتی جبکہ کھانا کسی ایک ہی تقریب سے کھایا جا سکتا تھا۔ تقریبات میں جانا گرچہ رات کو ہوتا لیکن دن بھر کا بیشتر وقت تیاری میں ہی گزر جاتا۔

آج بھی اتوار ہی تھا۔ عدنان جب سو کر اٹھا تو سورج کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ باقی گھر والے اس سے پہلے بیدار ہو چکے تھے اور ناشتے کی تیاری کر رہے تھے۔ انتظار یہی تھا کہ عدنان بھی اٹھ کر آجائے تو سب مل کر ناشتہ کریں گے۔ عدنان اٹھ کر بھی نہیں اٹھا تھا یعنی جاگنے کے باوجود بستر سے باہر نہیں آرہا تھا۔ سب باری باری کہہ چکے تھے اور اب ابو ہی رہ گئے تھے کہ وہ بھی اپنی باری پوری کرتے۔

''عدنان بیٹا! آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ کب سے ناشتہ تیار ہے۔ بستر چھوڑیں منہ ہاتھ دھو لیں۔ آئیں سب کے ساتھ ناشتہ کر لیں۔'' کہتے کہتے ابو اس کے پاس پہنچ گئے

عدنان نے ابو کی بات کا جواب دینے کی بجائے ان کی جانب سے کروٹ بدل لی۔

''ارے یہ کیا ہوا؟'' ابو حیران ہو گئے۔ پھر گھر والوں کو ڈانٹتے ہوئے بولے۔

''کسی نے کچھ کہا ہے میرے چاند کو؟'' انہوں نے عدنان کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس نے کسمسا کر کندھا چھڑا لیا۔

''کیوں بیٹا! آپ کسی سے ناراض ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟'' ابو نے کمالِ محبت سے کہا لیکن عدنان کچھ نہ بولا۔ اب اشفاق صاحب کو فکر ہوئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اپنی بیگم سے پوچھا۔

''عدنان! ..... مجھ سے ناراض ہے؟..... یا سب سے؟''

''مجھے تو پتا بھی نہیں کہ کس سے ناراض ہے اور کیوں ناراض ہے۔'' بیگم اشفاق بولیں۔ ''آپ خود ہی پوچھ لیں۔''

ماں کی بات سن کر عدنان نے اپنا سر جھٹک دیا۔

''امی! کوسب پتا ہے کہ میں کیوں ناراض ہوں لیکن اس وقت یوں کہہ رہی ہیں جیسے انہیں کچھ بھی نہیں معلوم!'' وہ چلا کر کہنا چاہتا تھا لیکن صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔

''عدنان! بیٹا اٹھو!..... ناشتہ کر لیں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ناشتے کے بعد بات کر لیں گے پہلے تازہ دم ہو جائیں۔'' اشفاق صاحب نے لہجے میں شگفتگی پیدا کی لیکن عدنان نے کسی بھی بات کا کوئی بھی جواب نہ دینے کا گویا تہیہ کر رکھا تھا۔

''لگتا ہے ناشتے میں کوئی ایسی چیز بنائی گئی ہے جو عدنان کو پسند نہیں ہے'' اشفاق صاحب پر خیال انداز میں بولے۔

''نہیں ایسا بھی نہیں ہے!'' امی بولیں۔ ''گھر میں جو کچھ بنتا ہے میرا بیٹا کھالیتا ہے۔ بات کچھ اور ہی ہے۔''

اشفاق صاحب عدنان کے پلنگ کے ساتھ فرش پر بچوں کے بل بیٹھ گئے اور اس کا رخ اپنی جانب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

''ابو کو کان میں بتاؤ بیٹا کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں! ہوا..... آپ ناشتہ کریں۔'' وہ سخت ناراض معلوم ہو رہا تھا۔ کروٹ بدلتے ہوئے بے حد رکھائی سے بولا۔

''ہم تو ناشتہ کریں گے اور ضرور کریں گے لیکن.....'' انہوں نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بغیر نہیں کریں گے۔''

''میں نہیں کروں گا۔''

''وجہ تو بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیوں ناراض ہو؟''

''ابو اس نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا۔'' اس کی بہن صغریٰ نے کہا تو اس کی ماں تڑپ اٹھی۔ اسے بھی یاد آ گیا کہ واقعی رات بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ جلدی سے عدنان کے قریب آئی اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

''کیوں بیٹا! رات کو بھی تم نے کھانا نہیں کھایا۔ کیا ہو گیا میرے لال!''

عدنان پھر بھی چپ ہی رہا تو ابو نے صغریٰ کو ڈانٹا۔

''تم نے رات کو کیوں نہیں بتایا۔ میرا بچہ بھوکا سو گیا رات کو؟'' وہ عدنان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ صغریٰ ڈانٹ کھا کر سہم گئی تھی۔

''کیا ہوا بیٹا؟ کیا ابو کو بھی نہیں بتاؤ گے؟'' وہ عدنان کے پلنگ کے قریب بچوں کے بل ہی بیٹھے بار بار کہتے رہے لیکن عدنان کی جانب سے ایک ہی جواب تھا! ..... چپ!!

''تم نے رات کو کیوں نہیں بتایا۔'' اشفاق صاحب نے کھڑے ہوتے ہوئے صغریٰ سے پھر پوچھا۔ اس بار لہجے میں نرمی تھی۔

''وہ..... ابو! یہ کہہ رہا تھا..... بھوک نہیں ہے میں سبھی پاپڑ وغیرہ کھا لیے ہوں گے اس لیے بھوک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد بھوک لگے گی تو کھالے گا لیکن یہ رات کو یونہی سو گیا۔ پھر میں بھی سو گئی تھی اب یاد آیا ہے کہ رات کو بھی اس نے کھانا نہیں کھایا بلکہ سکول سے آنے کے بعد اس نے چائے بھی نہیں پی۔ ہوم

ورک بھی نہیں کیا۔ ٹی وی بھی نہیں دیکھا.....'' ایک ایک کر کے صغریٰ کو ساری باتیں یاد آنے لگیں۔

''ٹھہرو! میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔'' ابو فون کی جانب بڑھتے ہوئے بولے۔ بیگم اشفاق عدنان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے بولیں۔

''بیٹا!..... امی کو بتاؤ..... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!''

''میرے سارے کلاس فیلوز چڑیا گھر کی سیر کر آئے ہیں۔'' وہ روہانسا ہو کر اتنا ہی کہہ سکا۔

بیگم اشفاق ساری بات سمجھ گئیں۔ انہیں تسلی ہو گئی کہ میرے بیٹے کو کوئی بیماری نہیں صرف ابو سے ناراض ہے کہ بار بار کہنے کے باوجود وہ اسے چڑیا گھر نہیں لے گئے۔ انہوں نے بلند آواز میں اشفاق صاحب سے کہا۔

''میرا بیٹا بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر کو نہ بلوائیں۔''

اشفاق صاحب ڈاکٹر کا نمبر ملا چکے تھے تاہم بیگم کی بات سن کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ قریب آئے اور بیگم کو خوش خوش دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولے۔

''کیا ہو گیا تھا اسے؟''

''کچھ نہیں ہوا..... پہلے ناشتہ کریں گے..... پھر فوراً ہی تیاری کریں گے۔ آج کوئی کام نہیں ہو گا، صرف پکنک ہو گی اور وہ بھی چڑیا گھر کی سیر۔ سارا دن آج چڑیا گھر میں گزاریں گے۔'' بیگم اشفاق نے فیصلہ کن لہجے میں کہا گویا اشفاق صاحب کچھ بھی کہہ لیں ان کی آج نہیں سنی جائے گی۔

''بس اتنی سی بات۔'' اشفاق صاحب کو بھی یاد آیا کہ وہ کئی بار چڑیا گھر جانے کی فرمائش کر چکا ہے لیکن وہ اپنی مصروفیات کے سبب اس کی فرمائش پوری نہیں کر سکے تھے۔ دراصل پورا ہفتہ کام کر کر کے اس قدر تھکے ہوتے تھے کہ اتوار کا آدھا دن تو سو کر ہی گزر جاتا، ناشتے سے فارغ ہوتے ہوتے ظہر کی اذان سنائی دے جاتی تھی۔ یہ سن کر کہ ان کا بیٹا اس وجہ سے ان سے ناراض ہے کہ وہ اسے چڑیا گھر کی سیر نہیں کروا سکے، انہیں تأسف سا ہوا تھا۔ آج فرصت ہی تھی۔ نہ کسی تقریب میں جانا تھا نہ کوئی اور کام تھا، چنانچہ انہوں نے کوئی تعرض نہ کیا اور عدنان کو پچکارتے ہوئے بولے۔

''یہ بات تو تم ویسے بھی کہہ سکتے تھے اس کے لیے بھوک ہڑتال کی کیا ضرورت تھی۔'' ان کا لہجہ شگفتہ ہو گیا تھا۔

سب نے مل کر ناشتہ کیا اور ہنگامی بنیادوں پر زور و شور سے پکنک کی تیاری شروع ہو گئی بریانی کباب، تنجن بنائے گئے۔ کوئی کپڑے استری کرنے لگا، کوئی غسل خانے میں گھس گیا۔

سہ پہر کا وقت ہو ہی گیا تھا جب وہ گھر سے چڑیا گھر کی سیر کو نکلے۔اشفاق صاحب نے ایک اشارے پر گاڑی روکی۔سڑک کنارے کھڑا ہوا ایک نوجوان ان کے قریب آیا اور سلام کر کے نہایت عاجزی سے بولا۔

"صاحب آپ سے درخواست ہے کہ میری ایک چھوٹی سی عرض سن لیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"بولو! کیا بات ہے؟" اشفاق صاحب نے کہا تو وہ بولا۔

"یہاں نہیں کہہ سکوں گا۔ ابھی اشارہ کھلے گا تو میری بات ادھوری رہ جائے گی۔ آپ ذرا اس کنارے گاڑی روکیں اور میری ایک عرض سن لیں۔" اس نے اشارے سے آگے سڑک کنارے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔اس کے انداز میں کوئی ایسی لجاجت تھی کہ اشفاق صاحب متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے اور کہہ دیا۔

"چوراہے کے اس پار فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی کھڑی کرتا ہوں تم وہاں آجاؤ۔"

اشارے کی بتی زرد ہوئی اور پھر سبز۔ اشفاق صاحب نے دھیرے دھیرے اشارہ پار کیا اور چوک سے آگے فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی لگا دی۔اس دوران وہ نوجوان بھی سڑک پار کر چکا تھا اور تقریباً ان کے ساتھ ساتھ ہی چلتا ہوا گاڑی کے رکتے رکتے ان کے قریب آ گیا تھا۔نوجوان جھکتے ہوئے بولا۔

"جناب میرا نام سرفراز ہے میں ایک مالی کا بیٹا ہوں، میرے والد نے کھاد، مٹی میں، دھوپ میں کام کر کر کے مجھے تعلیم دلائی ہے۔ میں نے بھی اپنے بوڑھے والد کی محنت کی کمائی ضائع نہیں ہونے دی۔خوب دل لگا کر پڑھا۔ انجینئرنگ میں ٹاپ کیا ہے۔اب چاہتا ہوں کہ میں کما کر اپنے بوڑھے والدین کو آرام پہنچاؤں۔ اخبار میں ایک اسامی کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ میں نے قسمت آزمانے کے لیے وہاں درخواست دے دی۔میرا انتخاب ہوگیا ہے جناب! لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے پاس رقم نہیں ہے۔ آپ اللہ کے واسطے میری مدد فرمائیں۔ اگر میری مدد کر سکتے ہوں تو انکار نہ کیجئے گا۔ میں خدا کو گواہ بنا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا احسان تو زندگی بھر نہیں اتار سکوں گا لیکن زندگی رہی تو انشاءاللہ آپ کی رقم آپ کو ضرور واپس کر دوں گا۔ مر گیا تو معاف کر دیجئے گا۔"

سرفراز کا لہجہ اس قدر مستحکم اور پر اثر تھا کہ گویا اشفاق صاحب اس کے لہجے کے سحر میں جکڑے گئے تھے بولے۔

"کتنی رقم چاہیے؟"

"پانچ لاکھ روپے۔" سرفراز بولا۔

"پانچ لاکھ روپے؟" اشفاق صاحب حیران ہو گئے۔ "پانچ لاکھ روپے کم نہیں ہوتے!"

"میں جانتا ہوں صاحب! یہ کم رقم نہیں ہے اور میرے لیے تو یہ بہت ہی زیادہ ہے کیونکہ میں خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔اتنی رقم ایک ساتھ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی لیکن اگر آپ کو اللہ نے میری مدد کرنے کے قابل بنایا ہے اور آپ اللہ کے نام پہ مجھے پانچ لاکھ روپے دے سکتے ہیں تو انکار نہ کیجئے۔اللہ ہی سب کو برکت دینے والا ہے۔ اگر آپ کے پاس نہیں ہیں یا مجھے نہیں دے سکتے تو انکار کر دیجئے۔"

پانچ لاکھ روپے! ایک قطعی اجنبی نوجوان ان سے پانچ لاکھ روپے اللہ کے نام پر مانگ رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"جناب اب تک آپ دس بیس سو پچاس روپے کر کے کتنے ہی لوگوں کو اللہ کے نام پر دے چکے ہوں گے لیکن بھیک یا خیرات۔ میں آپ سے بھیک یا خیرات نہیں مانگ رہا قرض مانگ رہا ہوں اپنی ضرورت کے مطابق۔ یہ سوچ کر دیں کہ آپ اللہ کے نام پر قرض دے رہے ہیں۔" اس اجنبی نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی کہ اشفاق صاحب نے فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگائی۔ برابر کی نشست پر بیٹھی ہوئی اپنی بیگم سے بولے۔

"بیگم! آپ پیچھے چلی جائیں۔" ان کی بیگم نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ نشست خالی ہوتے ہی اشفاق صاحب نے سرفراز سے کہا۔

"آؤ، بیٹھو۔" سرفراز شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ اشفاق صاحب نے گھر پہنچ کر اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اپنے بیڈروم سے پانچ لاکھ روپے کی رقم گن کر لائے اس کے حوالے کی۔ اس دوران بیگم اشفاق نے ٹھنڈے مشروب سے سرفراز کی تواضع کر دی تھی۔

"دیکھو سرفراز! یہ پانچ لاکھ روپے ہیں۔ تم نے اللہ کے نام پر مانگے ہیں۔ یہ میں تمہیں اللہ کے نام پر دے رہا ہوں، تم نے صحیح کہا میں اب تک دس بیس روپے، سو پچاس روپے کے حساب سے کتنے ہی لوگوں کو لاکھوں روپے دے چکا ہوں لیکن وہ بھیک ہی تھی۔ اگر پانچ لاکھ روپے سے تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"شکریہ سر! اللہ کے نام پر آپ بروقت میری مدد کر رہے ہیں لیکن میں اسے قرض سمجھوں گا اور آپ کی امانت سمجھ کر رکھوں گا۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکوں گا لیکن انشاءاللہ اپنا مسئلہ ہوتے ہی آپ کی یہ رقم ضرور واپس کروں گا۔ مجھے خود پر اور اپنے اللہ پر پورا یقین ہے کہ میں جلد ہی یہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"چلو ٹھیک ہے! جو بہتر سمجھو! اب کہو تو تمہیں وہیں تک چھوڑ دوں جہاں تم مجھے ملے تھے۔ ہم چڑیا گھر کی سیر کو جا رہے ہیں۔"

"بہتر ہے سر! مجھے اسی چوک پر اتار دیجئے گا۔ وہاں سے میرا گھر قریب ہے۔ میں وہاں سے اپنے گھر آسانی سے جا سکوں گا۔ اللہ آپ کو مزید ترقی دے۔ خوش خوشحال رکھے۔"

پکنک کا سامان ابھی تک گاڑی میں ہی تھا۔ بچے اتر گئے تھے۔ سرفراز کو پانچ لاکھ روپے کی رقم بریف کیس سمیت دے کر اشفاق صاحب بھی فارغ ہو گئے تھے چنانچہ یہ سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ابھی وہ اپنے گھر سے نکل کر گلی کے نکڑ تک ہی پہنچے تھے کہ عدنان کے خالو کی گاڑی انہی کی جانب آتی دکھائی دی۔ سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا۔ گاڑی دوسری بار پھر گھر کی جانب گھمائی گئی۔ ان سب کو گھر کے سامنے اتار کر انہوں نے سرفراز کو ساتھ لیا اور اسی چوک پر پہنچا کر واپس آ گئے۔ عدنان کو بڑی مشکل سے سمجھایا گیا کہ گھر آئے ہوئے مہمان کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ وہ بھی اپنے گھر سے ہمارے گھر آنے کا ارادہ کر کے ہی نکلے ہیں۔ یہ تو اتفاق تھا کہ سرفراز کی وجہ سے ہم واپس آ گئے اور تمہاری خالہ اور خالو سے ملاقات ہو گئی اگر ہم واپس نہ آتے تو یہ گھر کو تالا لگا دیکھ کر واپس ہو جاتے ۔ سب لوگ مہمانوں سے گھل مل گئے تھے لیکن عدنان منہ بسورے پڑا رہا۔

مغرب کا وقت ہو گیا۔ گھر میں ایک ایک کر کے بتیاں جلتی گئیں لیکن اس کے کمرے کی بتی نہیں جلی۔ سب لوگ اپنی خوش گپیوں میں مگن تھے۔ عدنان روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اے اللہ! تو نے میرے ابو کو اتنی دولت دی ہے کہ وہ اپنے بچوں پر توجہ نہیں دے سکتے۔ اے اللہ! تو نے مجھے اس گھر میں کیوں پیدا کیا ہے؟ مجھے کسی غریب کے گھر پیدا کیا ہوتا۔ یہاں میری ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اے اللہ! میرے ابو کو غریب کر دے، میرے ابو کو غریب کر دے۔ میرے ابو کو غریب کر دے۔" وہ روتا جاتا اور کہتا جاتا۔ روتے روتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی ماں کسی کام سے اس کے کمرے کے قریب سے گزری تو اندھیرا دیکھ کر کمرے میں آ گئی۔ بتی جلی تو اس نے دیکھا کہ گھپ اندھیرے میں عدنان سویا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ آج بھی پکنک پر نہ جانے کی وجہ سے وہ ناراض ہے لیکن وہ کیا کر سکتی تھیں؟ گھر آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے وہ کیا کہہ سکتی تھیں۔ ان کے مہمان سمجھیں گے کہ میزبانی سے جان چھڑا رہے ہیں؟ انہوں نے بھی اسے سوتا چھوڑ دیا کہ مہمانوں کے جانے کے بعد اسے راضی کریں گے۔

دوسرے دن عدنان کی منتیں کی گئیں۔ پیار سے کہا گیا۔ ڈانٹا گیا۔ دھمکیاں دی گئیں لیکن اس نے سکول جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ "میری کلاس کے سارے لڑکے چڑیا گھر کی سیر کر آئے ہیں میں سب سے کہہ آیا تھا کل ہم بھی جائیں گے۔ اب میں اپنے کلاس فیلوز کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

مجھ سے تو میری کلاس کے غریب لڑکے ہی اچھے ہیں جن کے پاس دینے کے لیے فیس نہیں ہوتی لیکن وہ سب چڑیا گھر کی سیر کر آئے ہیں۔"

"بیٹا! کیا ہوا جو کل نہیں جا سکے آج جب تم سکول سے واپس آؤ گے تو چلے جائیں گے۔" امی نے دلاسا دیا۔

"ہونہہ! آج چلے جائیں گے!" عدنان نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے سنا نہیں؟ ابو کل فون پر کتنے لوگوں سے آج کے دن کے لیے کتنے وعدے کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے ابو آج بھی وہی کام کریں گے جس میں انہیں کچھ رقم ملے۔ ہمیں چڑیا گھر نہیں لے کر جائیں گے کیونکہ وہاں رقم خرچ ہوتی ہے۔"

"بیٹا! یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تمہارے ابو جو کچھ کماتے ہیں تمہارے مستقبل کے لیے ہی کماتے ہیں۔" امی نے سمجھایا۔

"تمہارے اچھے کل کے لیے وہ اپنا 'آج' مصروفیت میں گزارتے ہیں۔"

"کاش میں کسی ایسے شخص کے گھر پیدا ہوتا جو عام لوگوں کی طرح صبح کام پر جاتا اور شام کو اپنے گھر آتا۔ میرے ابو صبح سوئے رہتے ہیں، میں سکول چلا جاتا ہوں۔ سکول سے واپس آتا ہوں تو وہ دوپہر ایک بجے گھر سے نکلتے ہیں۔ رات دیر سے گھر آتے ہیں۔"

"بیٹا! دوسرے لوگ کسی نہ کسی کی ملازمت کرتے ہیں۔ تمہارے ابو کا اپنا کاروبار ہے، ان کے جانے سے پہلے ان کے پریس میں کام شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ دوسرے لوگوں کا کیا ہوا کام یہ دیکھنے جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی صبح سویرے جائیں تو واپسی ان کی رات گئے ہی ہو گی۔ تم بھی بڑے ہو کر ایسا ہی کرو گے۔"

"میں نہیں کروں گا ایسا کام۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"اچھا! بڑے تو ہو جاؤ جو مرضی ہو کرنا۔ ابھی تو سکول جاؤ۔ ناشتہ بھی کرنا ہے۔ دیکھو! تین چار منٹ رہ گئے ہیں۔ باہر شوکت انتظار کر رہا ہے۔"

شوکت کا نام سن کر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا سات بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے جبکہ وہ ٹھیک پونے آٹھ بجے گاڑی میں ہوتا ہے اور اگلے دس پندرہ منٹ میں سکول۔

وہ پھرتی سے اٹھا۔ جلدی سے غسل خانے میں گھسا اور ان تین چار منٹوں میں ہی یونیفارم تبدیل کر کے گاڑی میں جا بیٹھا۔ ادھر اس کی ماں نے اسے عجلت میں تیاری کرتے دیکھا تو فوراً باورچی خانے کی جانب لپکیں تاکہ اس کے لیے ناشتہ لگانے میں دیر نہ ہو جائے۔ ناشتہ لگا کر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا

۔ناشتہ لگانے میں انہیں بمشکل تین منٹ ہی لگے تھے۔عدنان سکول سے لیٹ ہو رہا تھا۔وہ جلدی سے اس کے کمرے میں گئیں لیکن عدنان بستے سمیت رخصت ہو چکا تھا۔وہ جلدی سے کار پورچ میں آئیں۔گاڑی بھی جا چکی تھی گویا عدنان ناشتہ کیے بغیر ہی جا چکا تھا۔

''چلو شوکت آجائے تو اسے دوبارہ بھیج دوں گی ناشتہ دے کر۔'' انہوں نے سوچا۔

پرسوں،یعنی ہفتے والے روز جب ہاف ٹائم میں چڑیا گھر کا تذکرہ ہوا تھا تو وہ اپنے ہم جماعتوں سے کہہ چکا تھا کہ کل یعنی اتوار کو وہ بھی چڑیا گھر ضرور جائیں گے۔اسے یقین تھا کہ اس کی ضد کے آگے سب گھٹنے ٹیک دیں گے اور ضرور جائیں گے لیکن عین وقت پر سرفراز اور پھر خالہ لوگوں کی آمد نے پروگرام کا ستیاناس کر دیا تھا۔آج وہ لڑکے اس سے ضرور پوچھیں گے کہ وہ چڑیا گھر کیوں نہیں گیا۔اس نے اس سوال کا جواب سوچ لیا تھا۔آج جب ہاف ٹائم میں سب لڑکے اکٹھے ہوئے اور اس سے کل کی کارگزاری معلوم کی تو وہ بڑے عزم سے بولا۔

''کل ہمارے مہمان آگئے تھے۔آج جائیں گے۔''

''آج جاؤ گے؟ کیا واقعی؟'' زاہد بولا۔

''ہاں! آج جائیں گے سکول سے چھٹی کے بعد۔''

''پھر وہیں ملاقات ہوگی۔ہمارے گھر بھی مہمان آئے ہوئے ہیں ہماری خالہ اور خالہ زاد ہیں۔وہ بھی جائیں گے۔ہم ان کے ساتھ ایک بار پھر جائیں گے۔'' زاہد بولا

''یہ دوسری بار جائے گا اور میرا آج کا بھی پکا نہیں ہے۔'' عدنان سوچ کر رہ گیا۔

''ان کے گھر مہمان آئے ہیں تو یہ انہیں بھی ساتھ لے کر جائیں گے اور ہمارے گھر مہمان آئے تھے تو ہم انہیں نہیں کہہ سکے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔'' وہ سوچتا رہ گیا۔

وقفہ ختم ہو گیا۔سب اپنی اپنی جماعت میں جا کر بیٹھ گئے۔عدنان کے خیالات بھٹک بھٹک جاتے تھے۔یہ سوچ سوچ کر اس کا احساس کمتری بڑھتا رہا کہ مجھ سے میرے یہ کلاس فیلوز ہی اچھے ہیں جن کے ابو آدھا دن کام کرتے ہیں اور پھر آدھا دن بچوں کے ساتھ تفریح کرتے ہیں۔ایک میرے ابو ہیں سارا دن گھر پڑے رہتے ہیں۔دن دو تین بجے گھر سے نکلتے ہیں اور آدھی رات کو گھر واپس آتے ہیں۔ایسی ہی باتیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ دکھنے لگا تھا۔بالآخر ایک فیصلے پر آ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

دو بجے اس کی بھی چھٹی ہو جاتی تھی پونے دو بجے اس کا ڈرائیور شوکت! سکول کے گیٹ کے قریب ہی مستعد ہوتا۔

عام بچوں اور عدنان میں ایک واضح فرق تھا۔وہ یہ کہ اس کے ہم جماعت کوئی بائیکل پر آتے۔کوئی پیدل،کوئی سرکاری گاڑیوں پر اور اکثر مختلف وینوں میں ٹھسے ہوئے ہوتے۔بچے اپنی اپنی پریشانی کا احوال اپنے ہم جماعتوں سے کہا کرتے تھے کہ جو بچہ صبح سب سے پہلے وین میں سوار ہوتا ہے وہ ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھا ہی رہتا ہے۔اسی طرح چھٹی کے وقت بھی وہ بچہ پہلے بٹھایا جاتا ہے اور بعد میں بیٹھنے والے بچوں کو ان کے گھر اتار کر،ڈیڑھ گھنٹے بعد اسے اتارا جاتا ہے۔ان کی باتیں سن سن کر عدنان سوچتا کہ وہ ان سے بہتر ہے کہ اس کے لیے اس کی ذاتی گاڑی آتی ہے اور وہ اس میں اکیلا ہی ہوتا ہے۔کبھی دیر سے نہیں آیا۔

آج جب اس کا ڈرائیور شوکت آیا تو اپنا بستہ اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

''آپ جائیں۔میں اپنے دوست کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گا۔'' شوکت ہکا بکا رہ گیا۔

''کیوں شہزادے! صبح تو ایسی کوئی بات نہیں کی آپ نے؟'' وہ اسے شہزادہ کہا کرتا تھا۔

''بس ابھی ارادہ کیا ہے۔آپ بستہ امی کو دے کر بتا دیں کہ میں اپنے دوست زاہد کے گھر جاؤں گا اور ان کے گھر والوں کے ساتھ چڑیا گھر جا رہا ہوں۔''

''اچھا تو آپ کا ارادہ چڑیا گھر جانے کا ہے؟'' شوکت سمجھ گیا۔گزشتہ کل اتوار تھا،اس کی چھٹی تھی اس لیے اسے بالکل بھی معلوم نہ تھا کہ کل کیا ماجرا ہوا تھا۔وہ قطعاً نہیں جانتا تھا کہ گھر کے تمام افراد چڑیا گھر جاتے جاتے رہ گئے تھے۔

''جی ہاں! میں آج چڑیا گھر کی سیر کو جا رہا ہوں آپ مغرب کے وقت آ کر مجھے لے جایئے گا۔''

''شہزادے! پتا ہے! آپ کے ابو مجھے کچا چبا جائیں گے اگر آپ اکیلے چلے گئے تو۔''

''میں اکیلا نہیں ہوں گا،زاہد کے گھر جا رہا ہوں ان کے ساتھ ہی چڑیا گھر جاؤں گا۔''

''نہیں شہزادے نہیں! آپ نے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا۔آپ ابھی گھر چلیں۔یونیفارم تبدیل کر کے گھر سے کھانا وغیرہ کھا کر پھر چڑیا گھر چلیں۔تب تک سائے لمبے ہو جائیں گے۔''

''ہنہ،گھر جا کر میں کبھی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔مجھے معلوم ہے۔'' وہ زہرخند سے بولا۔

'میں خود لے کر جاؤں گا اپنے شہزادے کو۔'' شوکت نے کہا۔وہ عدنان سے بہت محبت رکھتا تھا۔شاید اسے احساس تھا کہ عدنان کی وجہ سے ہی اس کی نوکری بھی لگی ہوئی ہے اور آسان بھی ہے۔

''نہیں! میں ابھی گھر نہیں جاؤں گا،چڑیا گھر سے ہو کر ہی جاؤں گا۔''

''آپ مانیں میری بات! گھر جا کر...... کھا پی کر...... کپڑے بدل کر...... کیمرہ لے کر چڑیا گھر جائیں گے۔میں آپ سے پکا وعدہ کرتا ہوں۔آج مغرب تک میں آپ کے ساتھ ہوں۔آپ کو اکیلے نہیں

چھوڑ سکتا۔آپ میری ذمہ داری میں ہیں۔آپ کو گھر تک پہنچانا ہی میری ڈیوٹی ہے۔''

''آپ امی سے کہہ دینا کہ وہ چڑیا گھر چلا گیا ہے امی کو معلوم ہو جائے گا۔وہ کچھ نہیں کہیں گی۔''

وہ کسی طرح نہیں مان رہا تھا۔

''دیکھیں شہزادے! آپ یونیفارم میں چڑیا گھر گئے ناں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ لڑکا سکول سے بھاگا ہوا ہے،''ٹلا مار کر'' آیا ہے۔بہتر ہے کہ گھر سے کپڑے بدل کر آئیں۔'' شوکت نے کہا تو عدنان کی سمجھ میں یہ بات آگئی چند لمحے کھڑا سوچتا رہا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

اشفاق صاحب کے پرنٹنگ پریس میں چار رنگ کی چھپائی کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ان کے پریس میں بڑے بڑے کام ہوتے تھے،حتیٰ کہ سکولوں کی نصابی کتب بھی تیار ہوتی تھیں۔ان کے پرنٹنگ پریس میں سو سے زیادہ افراد کام کیا کرتے تھے۔اشفاق صاحب مجموعی طور پر لاکھوں روپے ماہانہ انہیں تنخواہ دیا کرتے تھے۔پریس کے کام کے لیے ان کے پاس کئی گاڑیاں تھیں۔کچھ صرف باربرداری کے لیے مخصوص تھیں جبکہ کچھ گاڑیاں ملازمین کو گھر سے پریس اور پریس سے ان کے گھر تک لانے لے جانے کے لیے بھی مخصوص تھیں اور اتنے ہی ان کے ڈرائیور بھی تھے۔ایک کار اور اس کا ایک ڈرائیور شوکت! صرف گھر کے افراد کو خدمات مہیا کرتا تھا۔بچوں کو سکول تک لانا لے جانا یا بیگم اشفاق کو مارکیٹ،ڈاکٹر یا کسی عزیز کے گھر تک لانے لے جانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔پرانا ملازم ہونے کے ناتے اسے یقین تھا کہ اگر وہ عدنان کو اکیلے ہی چڑیا گھر جانے دے گا تو صاحب لوگ ناراض ہوں گے۔دوسری جانب اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ عدنان کو لباس تبدیل کروا کر چڑیا گھر لے جا سکے گا۔یوں اس کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

اس وقت اشفاق صاحب ایک سرکاری دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہے تھے۔دفتر میں ان کے علاوہ کوئی نہ تھا۔سامنے ہی بڑی سی میز تھی جس کے پیچھے خالی کرسی دھری تھی۔دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک افسر دفتر میں داخل ہوا۔اشفاق صاحب کو دیکھ کر وہ بڑی رکھائی سے بولا۔

''آپ گئے نہیں ابھی تک؟''

''سر! مجھے ایک موقع دیں میں سب ٹھیک کرا لوں گا۔''

''بھئی آپ کی وجہ سے پہلے بھی ہماری بہت بے عزتی ہو گئی ہے۔اب ہم اَور بے عزتی نہیں کروانا چاہتے۔میرا خیال ہے کہ آپ اب چلے جائیں۔''

اس افسر کا انداز ایسا ہی تھا کہ اگر اشفاق صاحب نے جانے میں مزید تاخیر کی تو وہ کہیں دھکے دے کر دفتر سے نہ نکلوا دیں۔

''سر ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ٹھیک ہے میں تسلیم کرتا ہوں غلطی ہوئی ہے،غلطی جس سے بھی ہوئی ہے میں خود ہی بھگت لوں گا جو صفحہ غلط ہے اس کی جگہ دوسرا صفحہ پرنٹ کر کے لگا دوں گا لیکن آپ اس طرح تو نہ کریں۔میں بالکل قلاش ہو جاؤں گا۔میں نے قرض لے کر کتابیں چھپوائی ہیں اگر یہ سب کچھ ردی کرنا پڑ گیا تو میں کاغذ کی قیمت بھی نہیں دے سکوں گا۔''

''اشفاق صاحب! آپ کے پاس تو بہت وقت ہے۔آپ اسے کہیں بھی ضائع کر سکتے ہیں لیکن ہمارا وقت نہ ضائع کریں۔آپ کو ایک آرڈر دیا گیا تھا،وہ آپ پورا نہیں کر سکے۔سکولوں میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا ہے،کتابیں ابھی تک مارکیٹ میں نہیں پہنچیں۔اخبارات ہماری مٹی پلید کر رہے ہیں۔آپ کی غلطی کی وجہ سے۔'' افسر نے دانت بھینچ کر کہا۔

''صاحب صرف میری ہی غلطی نہیں ہے۔پروف آپ کے آدمیوں نے بھی چیک کیا تھا۔اگر ہم خود ساری کتابیں پڑھ پڑھ کر چھاپیں تو مہینوں لگ جائیں۔جو مواد آپ کی جانب سے جاری ہوا ہے ہم نے وہی چھاپا ہے۔''

''آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غلطی ہماری ہے؟'' افسر نے بگڑ کر کہا۔

''جس کی بھی ہو سر! میں تسلیم کرتا ہوں کہ غلطی ہو گئی۔اب اسے درست بھی میں ہی کروں گا مجھے ایک موقع تو دیں۔''

''نہیں! اب ہمارے پاس وقت بالکل بھی نہیں ہے۔''

''سر! اتنا ہی کر لیں کہ جس کتاب میں غلطی ہے اس ایک کتاب کو ہی مسترد کریں دیگر کتابیں تو ٹھیک ہیں انہیں تو منظور کر لیں۔ورنہ میں بالکل چینڈے سے لگ جاؤں گا۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑ کر روہانسی آواز میں کہا۔

''اب یہ ہو سکتا ہے اشفاق صاحب کہ ہم دوبارہ ٹینڈر دیں گے۔آپ اخبارات میں ٹینڈر تلاش کریں۔آپ کو حق دیا جائے گا کہ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔اگر ٹینڈر آپ کے نام کھلتا ہے تو آپ نقصان سے بچ جائیں گے ورنہ مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔اخبارات کو کوئی نہیں روک سکتا۔سب نے ہی یہ لکھا ہے کہ ہمارے محکمے نے رشوت لے کر نااہل پبلشر کو کتابیں چھاپنے کا آرڈر دیا ہے۔براہ مہربانی اب آپ تشریف لے جائیں۔باہر دوسرے لوگ بھی منتظر ہیں کافی دیر سے۔''

انہوں نے اپنی نشست چھوڑ دی۔ایک قدم باہر کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ آخری کوشش کے طور پر بولے۔

''آپ ایک بار صاحب سے میری ملاقات تو کروا دیں میں خود ان سے بات کرتا ہوں۔''

''آپ کیا بات کریں گے صاحب سے؟ یہی کہ اس میں غلطی ہماری ہے؟''

''نہیں نہیں!'' وہ جلدی سے بولے۔

''میں ان سے معافی مانگ کر اس غلطی کی تلافی کرنے کی یقین دہانی کروا دیتا ہوں۔''

''اشفاق صاحب! دیکھیے! آپ کی غلطی ناقابل تلافی ہے۔ معاملہ جب اخبارات اور ٹی وی تک پہنچ جائے تو پھر کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ اگر آپ کی سفارش کرتے ہیں تو صاحب کو یقین ہو جائے گا کہ ہم نے آپ سے کوئی رشوت لی ہے جو آپ کی حمایت کر رہے ہیں..... نہیں اشفاق صاحب نہیں! ایک لفظ کی خاطر ہماری نوکری بھی جا سکتی ہے۔ ہماری نوکری کا خیال کریں اور اب چلے جائیں۔''

اشفاق صاحب سخت 'دل برداشتہ' ہوئے۔ دل پر ایک بوجھ لیے دفتر سے باہر نکلے۔ واقعی دفتر کے باہر لوگوں کی ایک طویل قطار تھی جو 'صاحب' سے ملنے کے منتظر تھے۔

اشفاق صاحب کو پورے صوبے کے تمام سکولوں کے لیے نصابی کتابیں چھاپنے کا کام اکثر ملا کرتا تھا اس بار بھی نئی نصابی کتابیں چھاپنے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ حسب معمول ان کے پریس میں کتابوں کی چھپائی کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ جلد بندی جاری تھی۔ دور کے کئی شہروں میں طبع شدہ کتابیں بھیجی بھی جا چکی تھیں کہ اچانک انکشاف ہوا کہ پانچویں جماعت کی درسی کتاب میں ایک فاش غلطی چھپ گئی ہے۔ غلطی پکڑنے والے نے فوراً اخبارات کو خبر کر دی اور اشفاق صاحب تک بات پہنچنے سے پہلے پہلے ہی اخبارات میں خبر چھپ بھی گئی۔ غلطی بھی ایسی نہ تھی کہ اس کی تلافی نہ ہو سکے! لفظ تھا ''دل برداشتہ'' جو کمپیوٹر کمپوزنگ میں ''دلبرداشتہ'' ہو گیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ 'دلبر' طاق صفحے کی آخری سطر میں سب سے نیچے اور 'داشتہ' جفت صفحے کی پہلی سطر میں سب سے اوپر آ گیا۔ پروف ریڈنگ کے دوران بھی کسی کی نظر سے یہ لفظ نہ گزر سکا۔ کسی اخبار کا کالم نگار اپنے بیٹے کی نئی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس کی نظر اس لفظ پر اٹک گئی۔ اس نے اس لفظ کو 'فحش' قرار دے دیا۔ بس پھر کیا تھا؟ تقریباً تمام اخبارات نے اس لفظ کو پٹخارے دار بنا کر کالم شائع کیے۔ پروف ریڈرز کو بھی نہ بخشا گیا۔ اگر اخبارات اس پر توجہ نہ دیتے تو تعلیمی سال بخیر و بخوبی گزر جاتا لیکن میڈیا کی توجہ سے ہنگامہ برپا ہو گیا۔ غلطی صرف ایک کتاب میں تھی لیکن اخبارات میں خبر آ جانے کے بعد تمام افسران اشفاق صاحب کے خلاف ہو گئے تھے۔ اشفاق صاحب نے بہت منتیں کیں لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی اور تمام ٹھیکہ منسوخ کر دیا گیا۔ لاکھوں کتابیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اس مسئلے کا آسان سا حل یہ تھا کہ جس صفحے پر غلطی تھی وہی صفحہ دوبارہ چھاپ کر بدل دیا جاتا لیکن یوں لگتا تھا جیسے اشفاق صاحب کو جان بوجھ کر اس معاملے میں ملوث کیا گیا ہے اور انہیں اس کام سے محروم رکھنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ یہی سوچ کر انہوں

نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے گریز کیا کہ وہ سب اکٹھے ہیں اور وہ اکیلے۔ حالانکہ بہت سے ہمدردوں نے انہیں عدالت سے رجوع کرنے کا کہا تھا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے اس وقت عدالتی چارہ جوئی کی تو رہی سہی ساکھ بھی مٹی میں مل جائے گی۔ رقم بھی خرچ ہو جائے گی وقت بھی ضائع ہو گا اور ہاتھ بھی کچھ نہ آئے گا۔ جب تک کیس چلے گا وہ خود بھی کسی کام کے نہیں رہیں گے اور اس دوران مجاز افسر کسی دوسرے پبلشر سے کام کروا ہی لیں گے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا ان کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔

اشفاق صاحب گھر پہنچے تو جوتوں سمیت ہی صوفے میں دھنس گئے۔

بیگم پوچھتی رہ گئیں۔ بچے پوچھتے رہے لیکن وہ کوئی بھی جواب دینے سے قاصر تھے۔ ان کی بیگم نے ان کے جوتے اتارے۔ موزے اتارے۔ ان کے پاؤں سہلائے۔ اشفاق صاحب نے بمشکل اپنے امڈنے والے آنسوؤں کو روکا اگر وہ خود بھی رو پڑیں گے تو گھر کے دوسرے افراد تو بہت زیادہ اثر لیں گے۔ فی الوقت تو کسی کو معاملے کی شدت کا احساس نہیں ہے لیکن ان کے رونے سے انہیں اس سنگینی کا احساس ہو جائے گا۔ خود وہ کوئی بھی بات کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اگر بات کرنے کی کوشش کرتے تو الفاظ سے پہلے آنسو نکلنے کا اندیشہ تھا۔ بمشکل تمام انہوں نے حوصلہ جمع کیا۔

عدنان کو لے کر شوکت گھر پہنچا تو اشفاق صاحب کی لمحہ بہ لمحہ بگڑتی طبیعت کے بارے میں معلوم ہوا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اشفاق صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے میں تفریح قطعی مناسب نہیں ہے۔ اس نے سرگوشی میں عدنان کو سمجھانے کی کوشش کی اور جلد ہی اپنا وعدہ پورا کرنے کا ایک اور وعدہ کر لیا۔

عدنان بچہ تھا لیکن اتنا بھی بچہ نہیں تھا کہ والد کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے پر بھی تفریح کے لیے جانے کی ضد کرے۔

اشفاق صاحب نے جو کتابیں چھاپی تھیں وہ سب کی سب کباڑی کی نظر ہو گئیں کیونکہ محکمہ تعلیم نے انہیں 'نامنظور' کر دیا تھا۔ وہ اپنی کتابیں مارکیٹ میں فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ اتنا بڑا کام آسان نہیں ہوتا۔ مستقل ملازمین کو تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ ٹنوں ٹرکوں کے حساب سے کاغذ خریدا جاتا ہے جو کچھ نقد کچھ ادھار ہی آتا ہے۔ کتاب بکتی ہے تو کاغذ کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ چنانچہ کاغذ کی ادائیگی باقی تھی کہ یہ سانحہ آن پڑا۔ ردی میں دی جانے والی کتابوں سے اتنی آمدنی نہیں ہوئی کہ کاغذ کے بیوپاری کی رقم ادا کی جا سکتی۔ پہلے تو کچھ ملازمین کو نکالا گیا کہ انہیں تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ پھر کچھ گاڑیاں بیچی گئیں لیکن کاغذ کی رقم پوری نہ ہوئی۔ ایک ایک کر کے تقریباً تمام گاڑیاں فروخت ہو گئیں۔ ان کے ڈرائیور بھی ملازمت سے

سبک دوش ہوتے گئے۔ پھر مشینیں فروخت کی گئیں۔ باقی ماندہ ملازمین کو تنخواہیں دینے کے بعد ان سے معذرت کی گئی کہ وہ کہیں اور ملازمت تلاش کریں اب یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ شوکت بھی بے روزگار ہو کر کسی دوسری کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ اشفاق صاحب کے بچے اچھے اور معیاری سکول سے نکلے، عام سے سکول میں داخل ہو گئے۔ پریس کی عمارت بھی بک گئی اور بالآخر گھر بھی فروخت کرنا پڑ گیا۔

عدنان! پہلے پہل تو ابو کو پریشان دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ مجھے تفریح کے لیے نہیں لے جا سکتے تھے پیسہ بہت تھا ٹائم نہیں تھا۔ اب گھر پڑے سوچتے رہتے ہیں۔ ٹائم بہت ہے لیکن پیسہ نہیں ہے اور جب اسے فیس نہ دے سکنے کی وجہ سے مہنگا سکول چھوڑنا پڑا تو اس کی آنکھوں میں تارے جھلمل کرنے لگے۔ اس سارے سانحے کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتا رہا کہ میں نے ہی اللہ سے ''بددعا'' کی تھی جو قبول ہو گئی۔

اب وہ متوسط علاقے میں کرائے کے گھر میں رہنے لگے تھے۔ معقول روزگار نہ ہونے کی وجہ سے گزر اوقات نہایت مشکل تھی۔ بیگم اشفاق کا زیور تو پہلے ہی بک گیا تھا، گھر کی آرائشی اشیا بکنے کے بعد اب رفتہ رفتہ فالتو سامان بک رہا تھا لوگ 'استعمال شدہ' کی مہر لگا کر اونے پونے خرید رہے تھے۔ اچھے دنوں کی آس پر سب کچھ بکتا جا رہا تھا۔

صغریٰ کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا اس نے سائنس کالج میں داخلہ لیا تھا لیکن اخراجات کی سبیل نہ پا کر اسے پہلے سال میں ہی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ عدنان نے البتہ قریب کے سکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسے اپنے پرانے ہم جماعتوں سے، دوستوں سے بچھڑنے کا بہت ہی دکھ تھا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے اچانک ہی سکول چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اللہ سے دعائیں مانگا کرتا کہ ''اے اللہ! لوگ تجھ سے کتنی کتنی دعائیں مانگتے ہیں ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، میں نے بددعا کی تو نے فوراً قبول کر لی؟ اے اللہ! میں اپنی غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔ میرے ابو کو پھر سے امیر کر دے۔''

لیکن اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ایسی سرسری دعائیں تو لوگ مانگتے ہی رہتے ہیں۔ اللہ اپنے خلاف شکایتیں نہیں! عاجزی اور دل سے نکلی ہوئی دعا قبول کرتا ہے۔

صغریٰ نے پڑوسی بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی جن کی فیسوں سے گھر میں چولہا جل گیا لیکن کروڑ پتی گھرانے میں چند سو روپے کی ماہانہ کی آمدنی؟ عدنان نے بھی کوشش کی کہ کسی دکان پر اسے کچھ دیر کے لیے کوئی نوکری مل جائے تا کہ وہ سکول بھی جا سکے اور کام بھی کرتا رہے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ بیگم اشفاق

معمولی تعلیم کی حامل تھیں۔ کوئی ہنر بھی نہیں آتا تھا۔ وہ گھر میں پڑی کڑھتی رہتی تھیں لیکن یہ سوچ کر کہ 'وہ دن نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں گے' صبر کیے رہیں۔ اشفاق صاحب بھی صبح گھر سے نکلتے اور شام ہوتے ہوتے گھر میں داخل ہوتے۔ انہیں کہیں کوئی ملازمت نہیں مل رہی تھی۔

رمضان المبارک کا مہینہ آنے کو تھا۔ یہ ان کی بے سروسامانی کے عالم میں چھٹا رمضان تھا۔ رمضان المبارک! جس میں مسلمان دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور شام کو افطار کرتے ہیں۔ اس روزے کے لیے بھی سحر کے اوقات میں کچھ نہ کچھ کھانا پڑتا ہے اور افطار کے وقت بھی کچھ نہ کچھ کھا کر ہی روزہ کشائی ہوتی ہے۔ بالکل ہی فاقہ نہیں ہوتا۔ ساڑھے چار پہر کا روزہ ہوتا ہے آٹھ پہر کا نہیں۔ ان کے ہاں تو کھانے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا آخری آخری بڑے برتن انہوں نے کباڑی کو دے کر مکان کا کرایہ ادا کیا تھا تا کہ اس نئے محلے میں کسی کو یہ نہ معلوم ہو پائے کہ وہ گھر کے برتن بیچ کر گزارا کر رہے ہیں۔ کباڑی کو دیتے ہوئے کوئی دیکھ ہی لے تو بظاہر یہ معلوم ہو کہ ان کے پاس یہ برتن 'فالتو' تھے۔

گھر کی حالت دیکھ دیکھ کر عدنان شرمندہ ہوتا رہتا۔ چند سو روپوں کی خاطر بہن کو بچوں سے مغز ماری کرتے دیکھتا تو اس کا احساس جرم شدید تر ہوتا جاتا۔ وہ خود کو ان حالات کا ذمہ دار سمجھتا۔ وہ سوچتا ..... میرے ابو ایک اجنبی کو..... قطعی اجنبی شخص کو اللہ کے نام پر پانچ لاکھ روپے دے سکتے تھے۔ اس سے اس کے گھر کا پتا بھی نہیں پوچھا۔ اس سے اس کے باپ کا نام بھی نہیں پوچھا۔ اس نے اللہ کے نام پر پانچ لاکھ روپے مانگے اور میرے ابو نے دے دیئے۔ اسے سٹاپ تک اپنی گاڑی میں چھوڑ کر آئے۔ اور آج ہم خود کرائے کے گھر میں ہیں۔ اس بار گھر کے بڑے برتن بیچ کر کرایہ دیا ہے۔ اگلی بار کیا کریں گے؟ ابو کو کوئی نوکری نہیں مل رہی۔ خود ہر مہینے سو سے زیادہ افراد کو لاکھوں روپے تنخواہ دیا کرتے تھے۔ آج انہیں کوئی تنخواہ دینے والا نہیں مل رہا۔ کل تک میرے ابو کے کئی نوکر تھے آج میرے ابو خود کسی کی نوکری کے لیے دھکے کھا رہے ہیں۔ اے اللہ! میری غلطی معاف کر! میرے ابو کو پھر سے امیر بنا دے میں آئندہ ایسی دعا نہیں کروں گا میرے مولا! اس نے سوچتے سوچتے ہی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ اس کی بہن اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے بہن کی جانب دیکھا اور پھر اضطراری طور پر اپنے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا تو جلدی سے دونوں ہاتھ چہرے پر مل لیے گویا دعا ختم سمجھو۔ بولا۔

''باجی! میں روزہ مسجد میں افطار کیا کروں گا۔'' پھر سرگوشی میں بولا۔

''مسجد میں جو کچھ بچ جائے گا وہ میں تمہارے لیے لے آیا کروں گا۔''

''نہیں! عدنان! نہیں۔ مسجد میں لوگ روزہ افطار کے لیے بھیجتے ہیں۔ مسجد کی کوئی چیز گھر نہیں

لانا۔ سمجھے!''

''سمجھتا ہوں باجی لیکن ہمارا حق ہے۔ ہم اس وقت ضرورت مند ہیں۔ اللہ کے گھر سے اگر ہماری ضرورت پوری ہوتی ہے تو پھر ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں صرف وہی پھل وغیرہ لایا کروں گا جو روزہ کھولنے کے بعد بچ جاتے ہیں اور مدرسے کے لڑکے اسے کچرے پر پھینک دیتے ہیں میں وہ......'' وہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس کی بہن روتے ہوئے اٹھ کر کمرے کے اندر کی جانب دوڑی۔ کمرے میں بچھی دری پر لیٹ گئی اور روتی رہی۔

عدنان نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس بات نے بہن پر کیا اثر کیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مسجد میں آیا ہوا پھل اور دیگر لوازمات اس قدر ہوتے ہیں کہ نماز مغرب سے پہلے ختم نہیں ہو سکتے۔ گرچہ کھانے والے بھی بہت ہوتے ہیں لیکن پھر بھی بچ جاتے ہیں۔ سب کچھ کچرے پر پھینک دیا جاتا ہے اور ہم اس سے بھی محروم ہیں؟''

مولوی صاحب نے جمعہ کے وعظ میں آخری عشرے میں اعتکاف کی اور شب قدر کی بے حد فضیلت بیان کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ سب سے مظلوم بلکہ 'محروم' مسلمان وہ ہے جو اس رات کو پائے اور اسے عام راتوں کی طرح سو کر گزار دے۔ مولوی صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ شب قدر رمضان المبارک کی کسی بھی طاق رات میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اس رات اللہ زمین کے قریب آ جاتا ہے اور ہر پکارنے والے کی سنتا ہے جسے جو کچھ مانگنا ہے آج کی رات میں مانگ سکتا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ محروم نہیں رہے گا۔

عدنان نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ وہ اس بار آخری عشرے کا اعتکاف کرے گا نہ صرف یہ بلکہ تمام راتیں ہی جاگ کر گزارے گا۔ دن میں سویا کرے گا۔ اچھے دنوں میں جو وہ ساری ساری رات جاگ کر ٹی وی پر فلمیں دیکھا کرتا تھا اور فجر کی اذان کے وقت ٹی وی بند کر کے سو جاتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اسے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں اللہ کو بھولا ہوا تھا لیکن اللہ نے مجھے یاد رکھا۔ اس نے اسی وقت اللہ سے عہد کیا کہ اے اللہ! اب تک کی میری تمام خطائیں معاف فرما۔ جب تیرے گھر سے مؤذن پکارتا تھا کہ آؤ بھلائی کی طرف، آؤ نماز کی طرف اور نماز نیند سے بہتر ہے تو میں اس وقت سو جایا کرتا تھا۔ میں ناسمجھ تھا۔ اے اللہ اب ایسا نہیں کروں گا۔ اب تیرے گھر سے جونہی پکارا جائے گا میں سارے کام چھوڑ کر تیری طرف دوڑوں گا۔ مجھے تیری پناہ میں، تیرے گھر آ کر بہت سکون ملا ہے۔

رمضان کا آخری عشرہ شروع ہو گیا۔ عدنان محلے کی مسجد میں اعتکاف میں بیٹھ گیا۔ اس نے اس نئے محلے میں کوئی دوست نہیں بنایا تھا۔ اس نے ابو سے کہہ دیا تھا اس کے لیے مسجد میں کوئی چیز لے کر نہ آئیں۔ مسجد میں کھانے پینے کی اتنی چیزیں آ جاتی ہیں کہ لوگ کھا نہیں سکتے۔ مغرب کی نماز شروع ہو جاتی

ہے اور لوگ نماز کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ میں وہی کچھ کھا لیا کروں گا اور وہی سحر کے لیے بھی کافی ہوگا۔ اشفاق صاحب سمجھتے تھے کہ وہ یہ بات کیوں کہہ رہا ہے لیکن دل مسوس کر رہ گئے۔

اب گھر میں صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ وہ روزہ رکھتے تھے لیکن شام کو روزہ افطار کے لیے ان کے گھر کچھ نہیں ہوتا تھا۔ کسی پڑوسی سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ اشفاق صاحب نے بھی یہ سوچا کہ مسجد میں جا کر روزہ افطار کریں لیکن بیوی اور بیٹی کا خیال آیا تو اس اقدام سے باز رہے۔ کسی پڑوسی نے کچھ بھیج دیا تو روزہ کھل گیا ورنہ پانی سے یا نمک سے ہی روزہ کھول لیا اور اور اسی وقت ''ماہ رمضان کے کل کے روزے کی نیت '' کر کے فارغ ہو جاتے کہ افطار پارٹی کا رواج تو ہے لیکن کسی ضرورت مند کو ''سحر کے وقت'' کچھ کھلانے کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ کوئی سحر کے وقت روزہ رکھنے کی دعوت نہیں دیتا۔ افطار پارٹی میں اکثر لوگ 'آدھا ثواب حاصل کرنے کے لیے' 'روزہ افطار' کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ کیا ہوا جو وہ روزہ نہیں رکھ سکے؟ روزہ رکھنے کے وقت وہ سو رہے تھے۔ اس وقت تو بیداری کے عالم میں 'کھول تو سکتے ہیں'! اس محلے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ اس خاندان پر کیا گزر رہی ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کروڑ پتی شخص کا گھرانہ ہے جو اس وقت نان شبینہ کے لیے بھی محتاج ہے۔

اس نے جو ارادہ کیا تھا کہ تمام راتیں جاگ کر عبادت کرے گا، اس کا رب اس سے ناراض ہے وہ اپنے اللہ کو راضی کرے گا تو اسی وعدے کے مطابق 21 رمضان سے اب تک تمام راتیں بیداری کے عالم میں قیام میں گزار دیں تھیں۔

آج رمضان المبارک کی ستائیسویں شب تھی عام طور پر اسے ہی ''شب قدر'' کہا جاتا ہے۔ آج تراویح کے بعد بھی بہت سے لوگ موجود تھے لیکن نیا محلہ ہونے کے سبب اس کا کوئی شناسا نہ تھا اور نہ ہی اس نے کسی سے کوئی گفتگو خود ہی کی تھی۔ وہ صرف اور صرف اعتکاف کی نیت سے ہی مسجد میں تھا جبکہ وہ دیکھتا تھا کہ دیگر کئی اس کے ہم عمر لڑکوں کے دوست ان سے ملنے آیا کرتے تھے اور تراویح کے دوران وضو خانے کے پاس بیٹھ کر دیر تک گپیں لگایا کرتے تھے گویا وہ اعتکاف کے لیے نہیں آئے بلکہ مسجد کے قیدی ہیں اور اپنی سزا کے دن کاٹ رہے ہیں۔ ان کے دوست 'ملاقاتی' بن کر آئے ہیں۔ ملاقات کا وقت ختم ہوتا ہے تو وہ چلے جاتے ہیں۔ اور آج تو ان نوعمر لڑکوں کے بہت سارے دوست 'ملاقاتی' آئے ہوئے تھے۔ اس کی یکسوئی میں خلل واقع ہو رہا تھا۔ وہ کچھ اس قسم کی سرگوشی میں بات کر رہے تھے کہ سرگوشیاں ہی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

انتہائے سحر سے گھنٹہ بھر پہلے یہ ملاقاتی رخصت ہوئے تو اسے بھی سکون ملا۔ اس نے دل جمعی سے اپنے رب کو پکارا۔

''اے اللہ! اے رب العالمین! تو تو ہر وقت سنتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ تو کبھی نہیں سوتا تجھے کبھی اونگھ بھی نہیں آتی۔ تو نے آج کی رات کا وعدہ کیا ہے کہ تو معافی مانگنے والے کو معاف کر دے گا۔ دولت مانگنے والے کو دولت مند کر دے گا۔ قرض سے نجات حاصل کرنے کے درخواست گزار کا قرض غیب سے ادا کر دے گا۔ اے اللہ! میں بھی تجھ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہوں! میرے گناہ معاف فرما۔ میں نے نادانی کے عالم میں تجھ سے دعا کی تھی کہ میرے ابو کو غریب کر دے۔ یا اللہ! وہ میرا بچپنا تھا۔۔ میں ناسمجھ تھا۔ لوگ دولت مند ہونے کی دعا کرتے ہیں ان کی دعائیں دیر سے قبول ہوتی ہیں وہ دعائیں قبول نہ ہونے کی شکائتیں ہی کرتے رہتے ہیں۔ اے اللہ! میں نے غریب ہونے کی دعا مانگی تو نے فوراً قبول کر لی۔ اے اللہ! میں نے...... ہم نے...... ہمارے گھرانے نے بہت غربت دیکھ لی۔ لوگ غریبوں کو زکوٰۃ فطرہ خیرات دیتے ہیں۔ ہم ایسے غریب ہوئے ہیں کہ ہمیں کوئی فطرہ بھی نہیں دیتا، کوئی زکوٰۃ کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ ہم خود بھی زکوٰۃ فطرہ نہیں لینا چاہتے۔ ہم خود فطرہ دینے والے لوگ ہیں۔ میرے ابو ہر مہینے لاکھوں روپے اپنے ملازموں کو تنخواہ دیا کرتے تھے۔ اے اللہ! میرے ابو نے تیرے نام پر ایک اجنبی کو پانچ لاکھ روپے دے دیئے تھے۔ اے اللہ تیرے نام پر دیئے تھے۔ تو نے انہیں اس قابل کیا تھا تو نے انہیں اتنی دولت دی تھی تو انہوں نے تیرے نام پر دی۔ اے اللہ! لوگ زکوٰۃ دے رہے ہیں۔ غریب سے غریب شخص بھی فطرہ دے رہا ہے۔ ہم اس وقت اتنے کنگال ہیں کہ فطرہ بھی نہیں ادا کر سکتے۔ اے اللہ! ہمیں پھر سے اس قابل کر دے کہ تیرے نام پر ضرورت مندوں کو لاکھوں روپے دے سکیں۔ اے اللہ! میں نے ناسمجھی میں غریب ہونے کی دعا کی تھی۔ اے اللہ اب میں تجھ سے ہی دوبارہ امیر ہونے کی دعا مانگتا ہوں۔ اے اللہ یہ سب تیرے محتاج ہیں ہمیں اپنے محتاجوں کا محتاج نہ کر۔ اے اللہ! اے اللہ! اے اللہ!'' کہتے ہوئے وہ سجدے میں گر گیا اور دیر تک سجدے میں پڑا روتا رہا۔

عیدالفطر سر پر تھی۔ غریب سے غریب شخص بھی اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ بنا رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ خرید رہا تھا بلکہ بعض گھروں میں تو رمضان شروع ہونے سے پہلے ہی عید کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ رمضان کے فرض روزوں سے زیادہ عید کی واجب نماز کے لیے خصوصی تیاریاں کی جاتی ہیں کہ یہ 'سالانہ نماز' پڑھنا ہے تو نئے کپڑے پہن کر! ورنہ لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ ادھر اشفاق صاحب کے گھر میں ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ جمود ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ آمدنی کا راستہ کچھ ایسا بند ہوا تھا کہ کہیں سے کوئی معمولی سی درز بھی نہیں بن پا رہی تھی۔ صغریٰ! جو ٹیوشن پڑھا رہی تھی اس کے عوض حاصل ہونے والی قلیل سی رقم میں سے کچھ پس انداز کر کے مکان کے کرائے کے لیے رقم جوڑ رہی تھی اور قلیل سا حصہ روزانہ کے اخراجات

کو ''ٹھکانے'' کے لیے مخصوص کیا جاتا جو کہ ہمیشہ ہی ناکافی ہوتا۔ آج کئی دن سے کسی نے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ اشفاق صاحب روزانہ ہی مختلف کمپنیوں میں ملازمت کی آس لگائے داخل ہوتے۔ ہر جگہ سے تقریباً یہی جواب ملتا کہ فی الحال جگہ نہیں ہے، اپنی سری کولم وشے (سی وی) دے جائیں جونہی آپ کے لیے موزوں جگہ نکلی تو مطلع کر دیا جائے گا۔ رمضان کے مہینے میں تو لوگ ویسے بھی نئے ملازم نہیں رکھتے کہ پرانے ملازمین ہی کیا کر لیتے ہیں؟ وہ سی وی دے آتے یا وعدہ کر آتے کہ ''پہنچا دوں گا۔'' اب تو فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ صغریٰ کو ملنے والی فیس سے بمشکل تمام مکان کا کرایہ دیا گیا اور پیٹ کو ٹرخا دیا گیا۔ یہ سب جو کہ خوشحالی کے دنوں میں روزے ٹرخا دیا کرتے تھے۔ اس بار پہلی مرتبہ پورے روزے رکھ رہے تھے بلکہ بسا اوقات تو آٹھوں پہر کا روزہ ہو جاتا۔ عیش کے دنوں میں یہ خدا کو بھولے ہوئے تھے۔ اب (غالباً ان کی دانست میں) خدا انہیں بھولا ہوا تھا۔

آج انتیسواں روزہ تھا۔ چاند دکھائی دیئے جانے کا امکان ظاہر کیا جا چکا تھا کل عید یقینی تھی۔ اشفاق صاحب آج ایک نئے عزم کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ آج کچھ بھی ہو جائے کسی 'سیٹھ' کے پیر پڑنا بھی ضروری ہوا تو یہ بھی کر گزروں گا۔ میرے پاس لوگ ملازمت کے لیے آتے تھے تو ان کے لیئے کوئی نہ کوئی جگہ نکال ہی دیا کرتا تھا۔ یہ میری باری میں کیا ہو گیا ہے لوگوں کو؟ کوئی نوکری میرے لیے نہیں ہے؟ میں آج کسی کو اپنا ماضی بتا کر اس سے اپنے بچوں کے لیے بھیک مانگ لوں گا۔ میرے بچے یہ عید کیسے گزاریں گے؟ میں خود فطرہ دیا کرتا تھا۔ اب میں خود فطرے کا مستحق ہوں۔ میں اس بار لوگوں سے فطرہ لوں گا تا کہ میرے بچے بھی عید کر سکیں۔ یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر اشفاق صاحب شہر کے صنعتی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک وہ پیدل ہی آئے تھے۔ روزہ! وہ بھی فاقے کے مترادف کہ سحر کے وقت کچھ کھائے بنے رکھا گیا تھا اور پھر تیز چلچلاتی دھوپ! حلق سوکھ کر کانٹے کی سی چبھن پیدا کر رہا تھا۔ پیشانی پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے وہ دائیں بائیں کمپنیوں فیکٹریوں کے نام پڑھتے جا رہے تھے۔ معاً ایک کار ان کے قریب سے گزری۔ کچھ فاصلے پر جا کر رکی اور پھر 'ریورس' میں چلتی ہوئی ان کے قرب آ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ کار میں سے شوکت نکلا...... ان کا پرانا ڈرائیور...... گھوم کر کار کی دوسری جانب آیا، دروازہ کھولا جیسا کہ پہلے ان کے لیے دروازہ کھولا کرتا تھا۔ انہیں سلام کہتے ہوئے مصافحہ کیا۔

''صاحب! آئیں...... کہاں جا رہے ہیں...... میں چھوڑ آؤں!''

اپنے پرانے شوفر سے اپنے لیے 'صاحب' کا لفظ سن کر وہ بہت دلگیر ہوئے۔ آج برسوں بعد کسی نے انہیں صاحب کہا تھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتے تھے کہ ''صاحب'' تو تم ہو جو اپنے بچوں کے لیے عید کی

تیاری کر سکتے ہو میں تو اس قابل بھی نہیں رہا۔'' لیکن کہہ نہ سکے۔ اس نے جو مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہوا تھا اسے تھامے وہ سوچتے رہ گئے۔ شوکت بھی ان سے آنکھیں چار کیے خاموش کھڑا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر مزید چند لمحے اسی طرح کھڑے رہے تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا جائیں گی۔ انہوں نے اس کی بچھاتی کار پر نظر ڈالی' کبھی میری بھی اتنی شاندار گاڑی ہوتی تھی..... بلکہ اس سے بھی اعلیٰ.....! وہ سوچتے رہ گئے۔ شوکت نے ان کے لیے اپنے ساتھ والی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسے مزید وا کرتے ہوئے بولا۔

''صاحب! آئیں بیٹھ جائیں! باہر بہت تیز دھوپ ہے۔''

اشفاق صاحب گنگ تھے۔ ان سے کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شوکت بھی گھوم کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

''شکریہ شوکت! تم نے مجھے دیکھ کر گاڑی روکی۔'' وہ اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولے۔

''شرمندہ نہ کریں صاحب! ایک عرصے تک آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کی دی ہوئی تنخواہ سے اپنے بچے پالے ہیں'' وہ خفت سے بولا۔

''ایک بات کہوں شوکت!''

''جی! کہیں صاحب!'' وہ اس لہجے پر حیران ہوا۔

''مجھے صاحب نہ کہو!..... میں صاحب نہیں رہا۔'' انتہائی دلیری کا مظاہرہ کرنے کے باوجود ان کا گلا رندھ گیا تھا۔

''میرے لیے تو آپ ہمیشہ ہی صاحب رہیں گے صاحب! آپ کو صاحب کہنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔''

''تم میرے ملازم تھے۔ میں صاحب تھا۔ تب تک تو ٹھیک تھا لیکن اب نہیں۔''

''آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں صاحب! میرے لیے حکم کریں..... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟''

''یار مجھے صاحب نہ کہو!..... دل جلتا ہے..... اگر کچھ کر سکتے ہو تو میرے لیے کسی نوکری کا بندوبست کرو..... آج..... ابھی۔ لوگ روزے رکھ رہے ہیں..... میرے بچے فاقے کر رہے ہیں.....'' انہوں نے جلدی سے سب کچھ کہہ ڈالا اور اس سے رخ پھیر کر بائیں جانب کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے تھے۔ انہیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے الفاظ کے چناؤ میں وقت لگایا تو کچھ بھی نہ کہہ سکیں گے۔

شوکت کو یہ اندازہ لگانے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ وہ اس سے اپنی آنکھوں کی نمی چھپا رہے تھے۔

اسی حالت میں انہوں نے بازو کی پھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں۔

شوکت کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

''کل عید ہے اور میرے پاس پرانے کپڑے دھونے کے لیے صابن تک نہیں ہے۔''

شوکت کو ان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ آواز..... یہ لہجہ اشفاق صاحب کا نہیں تھا..... یہ کوئی اور ہی بول رہا تھا۔ ایسا گلوگیر لہجہ.....؟

''چاند رات کو صاحب بونس کے نام پر تمام ملازموں کو ہزاروں روپے عیدی بانٹا کرتے تھے۔ آج ان کے پاس صابن کے لیے پیسے نہیں ہیں کہ وہ پرانے کپڑے ہی دھو کر پہن سکیں؟..... اے اللہ! بس تو ہی تو ہے.....'' شوکت نے سوچا۔

گاڑی رکی..... اشفاق صاحب کے خیالات کی ڈور ٹوٹی۔ انہوں نے دیکھا وہ کوئی پلاسٹک کے برتن بنانے کی فیکٹری تھی۔ گارڈ نے کار دیکھ کر بھاری پھاٹک کھول دیا تھا۔ کار اندر داخل ہوتی چلی گئی۔

''صاحب.....!''

''یار شوکت! مجھے صاحب مت کہو..... تمہیں خدا کا واسطہ.....'' وہ کار میں بیٹھے تھے۔ اپنی 'صاحبانہ' فطرت سے مجبور تھے۔ 'حکم عدولی' پر انہوں نے شوکت کو تقریباً ڈانٹ دیا۔

''کیا کروں صاحب! عادت سی پڑ گئی ہے..... معاف کر دیں..... رفتہ رفتہ ہی چھوٹے گی۔'' شوکت بولا۔ واقعی وہ بھی عادت سے مجبور تھا۔

پھاٹک سے متصل انتظار گاہ تھی جس میں ملازمین سے ملنے کے لیے آنے والے ملاقات کیا کرتے تھے۔ شوکت نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ اس کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں صاحب سے بات کر کے آتا ہوں۔ میں ان سے کہوں گا کہ میرے پرانے دوست ہیں۔ انہیں فوری طور پر ملازمت چاہیے۔ مجھے معلوم ہے! صاحب نے ایک نئی فیکٹری بنائی ہے۔ اس کے لیے وہ عید کے بعد افراد بھرتی کریں گے لیکن میں کہوں گا کہ آپ اس کے پہلے کارکن ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صاحب میری بات کا لحاظ ضرور رکھیں گے اور آپ کو اس فیکٹری میں اچھی سی اسامی پر رکھ لیں گے۔''

اشفاق صاحب اس انتظار گاہ میں کھڑے سوچ رہے تھے کہ 'میرا سابقہ ملازم! ڈرائیور! میری سفارش کرے گا تو مجھے ڈرائیور کی نوکری مل جائے گی'۔ قسمت کی اس ستم ظریفی پر ان کا دل رو پڑا تھا۔

شوکت اپنے 'صاحب' کے کمرے میں گیا اور جاتے ہی اس کی میز پر ہزار ہزار روپے کے پانچ

نوٹ رکھ دیئے۔

''صاحب! ایک عرض ہے قبول کیجئے!'' کہتے ہوئے شوکت کا دل پھٹا جا رہا تھا۔

''کیا ہوا شوکت؟ یہ کیا ہے؟''

''صاحب! میرا ایک دوست ہے..... بہت مجبور! میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ بہت خوددار ہے..... بھوکا رہ لے گا لیکن میری مدد قبول نہیں کرے گا۔ اسے اس وقت ملازمت کی شدید ضرورت ہے۔ اسے آپ کوئی بھی ملازمت دے دیں۔ بھلے میری جگہ اسے اپنا ڈرائیور رکھ لیں لیکن اسے آج اور ابھی نوکری دے دیں۔''

''اوہو! وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ کیا ہے؟'' صاحب نے میز پر دھری رقم کا پوچھا۔

''صاحب! جب وہ آپ سے ملے تو اسے خوشخبری سنا دیں کہ وہ عید کے بعد کام پر آ جائے اور یہ اسے ایڈوانس دے دیں کہ عید پر اپنے بچوں کے لیے کچھ خرید لے۔''

''اوہ! اٹھاؤ اس کو۔'' صاحب نے قدرے غصے سے کہا۔

''یہ کیا طریقہ ہے؟ تم لے آنا اسے.....''

''میں لاتا ہوں اسے.....'' کہتے ہوئے شوکت جانے کے لیے مڑا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''ٹھہرو!..... رکو.....'' صاحب نے کہا۔ شوکت رک گیا۔ صاحب فون کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسری طرف کی بات سن کر بولے۔

''میں آ رہا ہوں۔'' پھر شوکت سے بولے۔

''یہ اپنی رقم اٹھاؤ۔''

''صاحب! اسے آپ یہ رقم اپنی طرف سے دیں، مجھ سے وہ نہیں لے گا۔'' شوکت بولا۔

''او یار! کریں گے ناں.....! ابھی تو اٹھاؤ اسے..... میں دیکھ تو لوں تمہارے دوست کو۔'' کہتے ہوئے وہ دفتر سے نکل گئے۔

''صاحب! اسے آج ہی کام پر رکھنا ہے..... بہت مجبور ہے..... اس کے گھر فاقے ہو رہے ہیں۔' شوکت نے صاحب کے دور ہوتے قدموں کی رفتار کی مناسبت سے اپنی بانگ بتدریج بلند کی تھی۔ اس نے میز پر رکھی رقم اٹھائی اور انتظار گاہ کی طرف چلا۔ پھاٹک کی جانب سے ایک معمر سا شخص اسی جانب آ رہا تھا۔ غالباً انہی کے استقبال کے لیے صاحب خود دفتر سے نکلے تھے۔ صاحب کے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ

تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ بھی ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ اسی دوران اشفاق صاحب بھی انتظار گاہ سے باہر نکلے گویا مہمان اور میزبان کے درمیان آ گئے تھے۔

''ارے اشفاق صاحب! آپ؟'' صاحب اپنے مہمان کی طرف جاتے جاتے اشفاق صاحب سے لپٹ گئے۔ شوکت! جو اُن کے پیچھے آ رہا تھا۔ ان کی شناسائی دیکھ کر انہی قدموں رک گیا۔ اشفاق صاحب اسے قطعی نہیں پہچان پائے تھے۔ انہیں پہچاننے کا موقع ہی نہیں ملا تھا بلکہ موقع دیئے بغیر ہی وہ ان سے بغل گیر ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں اس کا مہمان بھی قریب آ گیا تھا۔

''ابو! یہ ہیں میرے محسن! اشفاق صاحب! جنہوں نے مجھے پانچ لاکھ روپے دیئے تھے اور میں نے یہ کاروبار شروع کیا۔''

اشفاق صاحب نے غور سے دیکھا۔ تعارف ہو جانے کے باوجود بھی وہ اسے نہیں پہچان پائے تھے۔ ایک ہی دن محض تھوڑی دیر کے لیے اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ نوجوان تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں جب کہ اب وہ بھرپور جوان تھا۔ اس کے آدھے گال تو قلموں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پھر اس کے چہرے کے نقوش ہی ان کے شعور سے محو ہو چکے تھے۔ انہیں یاد بھی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کو اللہ کے نام پر ایک خطیر رقم یکمشت دی تھی۔

''بہت بہت شکریہ! اشفاق صاحب! آپ کی بروقت مدد سے میرا بیٹا کسی قابل ہو گیا ہے۔ اللہ اسے بھی ترقی دے اور آپ کو بھی۔'' کہتے ہوئے صاحب کے ابو نے اشفاق صاحب سے ہاتھ ملایا۔

''آیئے اشفاق صاحب، دفتر میں..... آپ بھی آئیں ابو! تھوڑی دیر بیٹھ کر چلتے ہیں۔ ذرا اشفاق صاحب سے حال احوال کر لیں۔''

وہ دفتر میں داخل ہوئے۔ اشفاق صاحب دفتر پر طائرانہ نظر ڈال رہے تھے۔ سامنے بڑی سی جہازی حجم کی میز تھی۔ اس کے تین جانب سوفے تھے۔ انہوں نے سوفوں کی جانب دیکھا تو صاحب انہیں ہاتھ پکڑ کر اپنی کرسی کی طرف لے گئے۔

''اونہہ! یہاں نہیں..... یہاں!..... یہ آپ کی جگہ ہے۔ یہ سب آپ ہی کا ہے۔''

شوکت! دفتر کے دروازے میں کھڑا اشفاق صاحب کی عزت افزائی دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل بھرا گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

''ابو! آپ بھی بیٹھیں ناں!''

''نہیں! سرفراز! میں بیٹھوں گا نہیں..... میں یہ کہنے آیا تھا کہ ماسٹر شریف کے بیٹے نے جمعہ

الوداع کی نماز میں ایک شخص کو دیکھا جس نے عربی لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ دوسرے لڑکے سے کہہ رہا تھا کہ اس کا بہت جی چاہتا ہے کہ وہ بھی ایسا لباس پہنے لیکن اس کے ابو اسے نہیں دلوا سکتے۔ میں نے سوچا کہ تم آج ہی اسے اس کے ناپ کا لباس خرید کر دو اور فطرہ بھی اسی کو دو۔ غریب بچہ خوش ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ابو!..... ابھی کرتے ہیں۔" پھر شوکت کو آواز دی۔ شوکت سامنے ہوا تو کہا۔

"شوکت! تم جاؤ ابو کے ساتھ اور جس لڑکے کا کہہ رہے ہیں اسے ساتھ لے جا کر اس کے ناپ کا عربی لباس خرید کر دو اور اسے پانچ سو روپے بھی دے دینا..... عیدی کہہ کر....."

"ابو! میں اشفاق صاحب سے گفتگو کر لوں۔ یہ ایک دم ہی کہیں گم ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنا بنگلہ بھی بیچ دیا تھا۔ آج مدت بعد ملے ہیں تو میں ان سے بات چیت کر لوں۔" وہ اپنے والد سے مخاطب ہوا۔

"ہاں ہاں! ضرور! بلکہ انہیں جانے نہ دینا۔ آج انہیں افطار پر ساتھ گھر پر ہی لے آنا۔"

"ٹھیک ہے ابو! اب انہیں گم نہیں ہونے دوں گا۔" وہ مسکرایا۔

اس کے باپ نے اسے سرفراز کہہ کر مخاطب کیا تو اشفاق صاحب کو یاد آ گیا کہ اس کا نام سرفراز ہی تھا جسے وہ یکسر بھول چکے تھے۔ اس طرح ان کی یہ غفلت دور ہوئی۔

سرفراز کے والد اور شوکت! دونوں چلے گئے تو سرفراز بولا۔

"سر! پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ اپنا بنگلا بیچ کر کہاں چلے گئے تھے۔ میں کئی بار آپ کے اس بنگلے پر گیا اور جو وہاں رہتے ہیں ان سے پوچھتا رہا کہ آپ کا کچھ پتا چلا..... لیکن آپ کی کوئی خبر نہیں ملی۔"

"بس سرفراز!..... مجھے خود اپنی خبر نہ تھی تو دوسرے کو کیا خبر ہوتی۔ تم سناؤ تم تو ملک سے باہر جانے کا کہہ رہے تھے..... گئے تھے یا نہیں؟ کب آئے؟ یہاں یہ کاروبار کب سے شروع کیا؟ مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ!" انہوں نے فوراً بات گھما دی۔

"ہاں سر! میں ملک سے باہر گیا تھا۔ جس کمپنی میں گیا تھا وہاں کا ماحول مجھے پسند نہیں آیا۔ میں محنت پر یقین رکھتا ہوں لیکن وہاں میں نے دیکھا کہ لوگوں کی لاکھوں روپے ماہانہ تنخواہ ہے لیکن وہ ہیرا پھیری سے باز نہیں آتے۔ مجھے میرے والد صاحب نے حلال کما کر کھلایا ہے۔ میں ان لوگوں میں ضم نہ ہو سکا۔ میری ایک مہینے کی تنخواہ پاکستانی ڈھائی لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ میرے کام سے مالک کو فائدہ پہنچا تو اس نے میری تنخواہ خوش ہو کر دگنی کر دی جو میرے پرانے ساتھیوں کو پسند نہ آئی۔ میں نے بمشکل دو سال وہاں گزارے۔ معاہدہ ختم ہوا تو میں پاکستان آ گیا۔ وہاں کا مالک مجھے بہت روک رہا تھا، میرے دوبارہ آنے پر بہت اصرار کیا لیکن میں نہیں گیا۔ اس کمپنی میں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں وقت ضائع

کرنے کا تو پہلے بھی قائل نہ تھا لہٰذا جب تک وہاں رہا سارے کام کو اچھی طرح سمجھا۔ پھر وہی کام یہاں شروع کر دیا۔ مشینری منگوائی اور اب ماشاءاللہ خوب ترقی ہو رہی ہے۔"

"بہت اچھے! اللہ تمہیں مزید ترقی دے مجھے خوشی ہوئی۔" اشفاق صاحب نے کہا۔

"یہ سب اللہ کا کرم ہے! سر! اس نے آپ سے ملوا دیا آپ نے میری بات کی لاج رکھی اور آج تقریباً ہر گھر میں میری فیکٹری کے بنائے ہوئے برتن استعمال ہو رہے ہیں۔ یقیناً آپ کے گھر میں بھی ہوں گے۔"

"ضرور ہوتے..... اگر ہوتے۔" انہوں نے سوچا۔

"پیسے کی محبت تو میرے دل میں پہلے بھی نہ تھی اب بھی نہیں ہے۔ لیکن اپنے بنائے ہوئے برتن ملک میں جا بجا دیکھتا ہوں تو روحانی خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ اپنی صلاحیتیں اپنے ملک کو دے رہا ہوں۔ اچھا سر! اب آ جائیں مطلب کی بات پر..... لیکن درخواست کروں گا میری پیش کش قبول کر لیں۔ آپ نے میری پانچ لاکھ روپے سے مدد کی تھی وہ میری جانب قرض ہیں۔ پہلے تو وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں قبول کیجئے۔" کہتے ہوئے اس نے ایک چیک لکھا اور اشفاق صاحب کے حوالے کیا۔

"اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ پانچ لاکھ روپے میں نے شروع کے تین مہینے میں ہی جمع کر لیے تھے۔ میں نے پاکستان بھیجے۔ اپنے والد صاحب کو آپ کا پتا سمجھایا لیکن انہوں نے بتایا کہ آپ یہ بنگلا بیچ کر کہیں چلے گئے ہیں اور کسی کو کوئی خبر نہیں ہے تو میں صبر کیے رہا۔ دو سال بعد میں واپس آ گیا۔ کئی لوگوں سے ملا..... آپ کا پوچھا لیکن کوئی اطلاع نہ ملی۔ تیسری بات یہ ہے کہ میں نے آپ کی طرف سے آپ کی رقم ایک الگ کاروبار میں لگا دی تھی، یہ سوچ کر کہ جب بھی آپ ملیں گے یہ منافع آپ کو ہوگا۔ اس کا حساب کتاب ہی میں نے الگ کر رکھا ہے۔ اس کے کارندے ہی الگ ہیں۔ یہ درخواست کروں گا کہ اب اس شعبے کو آپ ہی سنبھالیں اور اپنی نگرانی میں لے لیں۔"

"میں.....؟" اشفاق صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن سرفراز نے ان کی بات کاٹ دی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا۔ آپ کا اپنا کاروبار ہے۔ اسے بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کاروبار کے سٹاف کو آپ اپنی تحویل میں لے لیں۔ اپنے اعتبار کا کوئی شخص مقرر کر دیں۔ ویسے تو میرا تمام سٹاف ہی قابل اعتبار ہے پھر بھی آپ اپنے کسی بیٹے بھتیجے کو نگراں بنا دیں گے تو..... میرا مطلب ہے کہ اپنی مرضی کی تبدیلی آپ کر سکتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ آپ اس کے مالک ہیں۔"

اشفاق صاحب ان 'تا بڑ توڑ' قسم کے حملوں سے بچاؤ نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ

کہاں تو وہ فاقے سے تھے اور کہاں یہ سب کچھ......؟ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ آج یکلخت ہی ان کے دن پھر گئے ہیں۔ آج مدت بعد پہلی بار ان کے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے۔

پھر سرفراز نے انہیں اپنی فیکٹری کا وہ حصہ دکھایا جس میں بقول اس کے اس نے اشفاق صاحب کے نام 'مختص' کردہ رقم سے الگ شعبہ بنا رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس حصے میں ہوٹلوں اور شادی ہالوں کی ضرورت کے مطابق برتن تیار کیے جاتے ہیں جو بکتے بھی خوب ہیں اور کثیر تعداد میں بکتے ہیں یعنی پر چون کا گاہک بھی گاڑی بھر کر برتن لے جاتا ہے۔ یہ سب آپ کے لیے مخصوص ہے۔ اشفاق صاحب کے لیے یہ سب کچھ قابل برداشت تھا۔ انہوں نے دولت دیکھ رکھی تھی اس لیے انہوں نے قطعی یہ تاثر نہ دیا کہ وہ اتنی دولت پا کر جامے سے باہر ہو رہے ہیں۔ اچھے وقتوں میں انہوں نے اللہ کے نام پر ایک اجنبی کو پانچ لاکھ روپے دیئے تھے اور پھر واقعی بھول چکے تھے۔ آج اللہ نے انہیں اپنے نام پر دیئے ہوئے پانچ لاکھ روپے واپس کروا دیئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ جیسا کہ اس کا وعدہ تھا کہ وہ اس میں اضافہ کر کے دے گا تو یہ اللہ کے وعدے کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے زمانے کے بہت سرد و گرم دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس طرح وہ اچانک کنگال ہوئے تھے اسی طرح اچانک ہی ان کے پاس دولت واپس آ گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ نے ان کی خطائیں معاف کر دی ہیں ان پر نظر کرم کر دی ہے۔

فیکٹری کے اس حصے کا معائنہ کرتے ہوئے ان کی چال میں وقار آ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ انہی کا ہے۔ یہ طے کر لیا تھا کہ عید کے فوری بعد وہ اپنے بیٹے عدنان کو اس کا نگراں بنا دیں گے اور پانچ لاکھ کی اس رقم سے خود کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیں گے۔ معائنے کے بعد جب وہ دفتر آئے تو شوکت اپنی ذمہ داری نبھا کر واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔

دفتر کے سامنے پہنچ کر سرفراز نے کہا۔

''سر! میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے وہ ضرور پوری ہونے دیں...... دیکھئے انکار نہ کیجئے گا۔''

''کیا ہے بھئی!'' وہ مسکرائے ان کے تمام دلدر دور ہو چکے تھے اب وہ کھل کر مسکرا سکتے تھے۔

''بس! میں جو کچھ کروں مجھے منع نہ کیجئے گا۔''

''ہاں تو بھئی! آپ ہی کریں گے جو کچھ کریں گے۔ ہم تو عید کے بعد کریں گے۔'' وہ بذلہ سنجی سے بولے۔

''نہیں! آپ وعدہ کیجئے! مجھے روکیں گے نہیں۔''

''اچھا بھئی وعدہ رہا، کر لو جو کرنا ہے۔'' وہ ہنسے۔

''یہ بات!'' سرفراز یوں خوش ہوا جیسے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ پھر شوکت سے کہا ''چلو گاڑی نکالو...... چلتے ہیں۔''

یہ دونوں عقبی نشست پر براجمان تھے۔ سرفراز اپنے بیرون ملک تجربات ان کے گوش گزار کر رہا تھا جسے وہ بڑے دھیان سے سن رہے تھے۔

شوکت اس نئی صورت حال سے مطمئن بھی تھا اور حد درجہ خوش بھی۔ ایک گونہ اسے شرمندگی سی بھی تھی کہ اس نے اپنے تئیں ان کی اس وقت پانچ ہزار روپے سے مدد کی کوشش کی تھی۔ ایک خدشہ بھی تھا کہ کہیں اسی وقت صاحب اس کے اس دوست کا ذکر نہ کر بیٹھیں جسے آج ہی نوکری لازمی دلانا تھی۔ صد شکر کہ سرفراز نے بھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ سرفراز نے شوکت سے شہر کی مہنگی ترین مارکیٹ چلنے کا کہا تھا۔ وہاں پہنچ کر سرفراز بولا۔

''سر! آپ کے بچے میرے بہن بھائی ہیں۔ آپ کی بیگم میرے لیے ماں کا درجہ رکھتیں ہیں۔ میں جو کچھ خریدوں گا مجھے منع نہ کیجئے گا۔ میری طرف سے ان کے لیے عید کا تحفہ! واللہ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ آپ کی دی ہوئی رقم پر کوئی منافع ہے۔ کوئی سود ہے بلکہ وہ رقم میں آپ کو دے چکا ہوں۔ بس! یہ میری خواہش ہے کہ میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔ ''

اشفاق صاحب کچھ نہ بولنے کا وعدہ کر چکے تھے ورنہ اسے منع کر دیتے کہ اب ان کی جیب میں بھی پانچ لاکھ روپے کا چیک پڑا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ چلو جو کرتا ہے کرنے دو۔ میں بھی تو اس وقت یہ چیک کیش نہیں کروا سکوں گا کہ بینک تعطیل ہے۔ یہ کام تو عید کے بعد ہی ہوگا۔ سرفراز کو اشفاق صاحب کی خدمت کا موقع ملا تو اس میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تین تین جوڑے کپڑوں کے، جوتوں کے، وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ کے لیے اور شوکت کے حوالے کرتا گیا کہ گاڑی میں رکھتا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ دکاندار سے یہ بھی کہتا رہا کہ ''بھئی ہم یہ اندازے سے لے رہے ہیں۔ جن کے ہیں انہیں پسند نہ آئے یا سائز کا فرق ہوا تو بدل کر لے جائیں گے۔'' دکاندار آمنا صدقنا کہتے رہے۔ پھر اس نے ڈھیر سارے پھل خریدے۔ گاڑی کی ڈکی تو خوب چکار ہوگئی۔ شوکت کے برابر کی نشست بھی لد گئی تو انہوں نے واپسی کی راہ لی۔

''شوکت اب تم ایک کام کرنا،'' وہ بولا۔ ''مجھے فیکٹری چھوڑ کر تم اشفاق صاحب کے گھر جاؤ۔ یہ سب کچھ پہنچاؤ اور ہماری امی کو اور بہن بھائیوں کو اگر ان میں سے کچھ پسند نہ ہو تو اسی دکان سے تبدیل کروا لینا جہاں سے لیے تھے ٹھیک......؟''

''ٹھیک ہے صاحب!'' شوکت نے حامی بھر لی۔

''سر! آپ آج میرے ساتھ روزہ افطار کیجئے گا...... آپ سب...... شوکت آپ کو لینے آ جائے گا۔'' کچھ دیر خاموشی سے سفر کٹنے کے بعد سرفراز نے اشفاق صاحب سے کہا۔

''یہ اتنے ڈھیر سارے پھل بھی لے لیے ہیں اور پھر سب کو روزہ افطار کے لیے اپنے گھر بھی بلا رہے ہو، یہ کون کھائے گا؟'' اشفاق صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو میری طرف سے تحفہ ہے ناں اور اپنے گھر آپ کا روزہ افطار میرے لیے سعادت......!''

اشفاق صاحب کچھ نہ کہہ سکے لیکن ان کی کوشش تھی کہ سرفراز ان کے گھر نہ جائے، ان کی بے حد سبکی ہوگی۔ وہ اس کا حل سوچ ہی رہے تھے کہ سرفراز نے پوچھ لیا۔

''ویسے! آپ رہتے کہاں ہیں آج کل؟''

اشفاق نے جھجکتے جھجکتے بستی کا نام بتایا تو سرفراز خوش ہو کر بولا۔

''ارے وہ تو راستے میں ہی ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ امی وغیرہ سے افطار کے وقت ملاقات ہوگی لیکن یہ تو میں اب بھی مل سکتا ہوں۔''

''ہاں ہاں افطار میں مل لینا۔ ہم لوگ آ جائیں گے۔'' وہ یک بیک گڑبڑا گئے تھے۔ وہ اسے سر دست اپنے گھر سے دور رکھنا چاہتے تھے۔''

''روزہ ہے اور سب اس وقت سو رہے ہوں گے۔ آج ہم سب تمہارے ہاں آئیں گے پھر ہم تمہارے گھرانے کی دعوت کریں گے۔''

''اوہ! میری خواہش تھی کہ ان سب کو ساتھ ہی لے جاؤں گا، انہیں اپنی امی سے ملواؤں گا۔ میری امی آپ کو بلاناغہ دعائیں دیتی ہیں۔ وہ آپ سب سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''ان سے تو ضرور ملیں گے۔ ہم افطار سے پہلے تمہارے ہاں آ جائیں گے۔'' پھر وہ جلدی سے شوکت سے بولے۔

'شوکت! تم عصر کے وقت ہی آ جانا ہمیں لینے، ہم سب تیار ملیں گے۔''

''ٹھیک ہے صاحب! میں آ جاؤں گا۔''

شوکت سمجھ گیا تھا کہ وہ جس محلے میں رہتے ہیں وہاں سرفراز صاحب کا جانا مناسب نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اسے اپنے گھر نہیں لے جانا چاہتے۔ شوکت نے بھی معاملے کی نزاکت کا احساس کیا۔ اس نے کمال ہوشیاری سے گاڑی کو ایسے راستے پر ڈال دیا کہ پہلے فیکٹری جائے اور سرفراز صاحب کو اتار کر اشفاق صاحب کے گھر جا سکے۔ فیکٹری پہنچے تو سرفراز پھاٹک پر ہی اتر گیا۔ اشفاق صاحب کو گھر تک پہنچانے کی ہدایت کرتے

ہوئے شوکت سے کہا کہ ان کا گھر دیکھ آئے اور عصر کے وقت ان سب کو میرے گھر تک پہنچا دے۔

اشفاق صاحب کے روزگار کی تلاش میں نکل جانے کے بعد بیگم اشفاق کا گھر میں کوئی کام، کوئی مصروفیت تو ہوتی نہ تھی، یوں دن کا بیشتر حصہ داخلی دروازے میں کھڑی خفیف سی جھری پیدا کر کے گلی سے گزرتے افراد کو ہی تکا کرتیں۔ اس وقت بھی وہ حسب معمول گلی کا نظارہ کر رہی تھیں۔ عین ان کے گھر کے سامنے ایک گاڑی رکی۔ اس میں سے اپنے پرانے ڈرائیور شوکت کو اترتے دیکھ کر انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور جب اس نے منجھے ہوئے شوفر کی طرح تیزی سے گھوم کر دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور اس میں سے اشفاق صاحب برآمد ہوئے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا وہ سمجھیں جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہیں۔ شوکت نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور سرفراز کے دیئے ہوئے تحائف کے ڈبے نکال کر اشفاق صاحب کو تھمانا شروع کیے تو ان کی حیرت دوچند ہوگئی۔ بقدر جثہ ڈبے اٹھا کر اشفاق صاحب نے اپنی دہلیز کی جانب قدم بڑھائے تو بیگم اشفاق نے دروازہ پورا کھول دیا۔

''السلام علیکم باجی!'' انہیں دیکھ کر شوکت نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام شوکت! کیسے ہو؟'' اس لمحے وہ قطعی بھولی ہوئی تھیں کہ وہ 'بیگم صاحب' نہیں بلکہ 'مائی' کے زمرے میں آتی ہیں لیکن وہ خود کو اسی مقام پر سمجھیں جیسا کہ چھ سال پہلے شوکت اسے سلام کیا کرتا تھا اور وہ مسکرا کر اس کا حال پوچھا کرتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سے ڈبے لے لیے۔ اشفاق سے ڈبے لے کر انہوں نے صغریٰ کو پکارا۔ وہ برآمدے میں لیٹی کوئی پرانا رسالہ پڑھ رہی تھی۔ ماں کے ہاتھ میں سامان دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئی۔ تاہم ماں کی مدد کے لیے دوڑی۔ عقبی نشست خالی ہونے پر شوکت نے ڈکی کھولی۔ وہاں سے پھل وغیرہ کے تھیلے اٹھائے اور اشفاق صاحب کے حوالے کیے۔ اشفاق صاحب کی کوشش تھی کہ شوکت بھی ان کے گھر میں داخل نہ ہو۔ غنیمت تھا کہ روزے کے سبب وہ اسے پانی کا بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ سامان گھر منتقل کرنے کے بعد انہوں نے شوکت کو اجازت دی۔

''ٹھیک ہے شوکت! عصر کے وقت آ جانا۔ ہم تیار ملیں گے۔ پھر دھیرے سے بولے۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے میری بہت مدد کی۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

''صاحب! میں کیا اور میری بساط کیا؟ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے کسی کام آیا۔''

''جب تم نے مارکیٹ سے میرے گھر آنے والا رستہ بدلا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس طرح سرفراز پہلے اترے گا۔ اگر وہ میرا یہ گھر دیکھ لیتا تو مجھے بے حد شرمندگی ہوتی۔'' انہوں نے شوکت سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ گویا کہ اسے اب جانے کی اجازت ہے۔ بیٹی اور بیگم کو سرفراز سے دوبارہ مگر

اچانک ملاقات کا مختصر احوال بتانے کے بعد انہوں نے انہیں فوراً تیار ہونے کا کہا اور بتایا کہ عصر کے وقت شوکت آئے گا۔ ہمارا روزہ افطار آج سرفراز کے ساتھ ہوگا۔

گھر میں جیسے تیسے گزر رہا ہے لیکن تقریبات میں شریک بھڑکیلے لباس زیب تن کیے افراد کو دیکھ کر کوئی بھی ان کے گھریلو مسائل سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ سو انہوں نے سرفراز کے دیئے ہوئے تحائف میں سے ہی لباس منتخب کیا اور تیاری شروع کردی۔

اشفاق صاحب کا ایک ہم جماعت عمارت ساز تھا، زمین خریدتا اور فلیٹ بنا کر فروخت کردیتا تھا۔ انہوں نے پانچ لاکھ کا چیک اس کے حوالے کیا۔ دیگر اخراجات کے لیے اس سے ایک لاکھ روپے لیے۔ اس سے باقی رقم کا وعدہ کر کے فلیٹ خرید لیا۔ عصر سے پہلے وہ تینوں جا کر فلیٹ دیکھ آئے تھے۔ ماں بیٹی سرفراز کے ہاں جانے کی تیاری میں مصروف ہوگئیں اور اشفاق صاحب نے نئے فلیٹ کی ضرورت کے مطابق سوفے میز کرسیاں مسہریاں وغیرہ کا سودا کیا اور دکانداروں کو آگاہ کیا کہ آج ہی میرا سامان میرے گھر پہنچ جانا چاہیے مجھے دوبارہ نہ آنا پڑے۔ سارے کام مشینی انداز میں ہو رہے تھے۔ اشفاق صاحب کو اپنا بڑا پن بھی قائم رکھنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اس عید پر پرانے دوستوں سے ضرور ملنا ہے۔ عید کے بہانے کاروباری رابطے شروع کردینے چاہئیں۔

عصر سے پہلے وہ بعجلت تمام ضروری کام نمٹا چکے تھے۔ جن میں فلیٹ کا قبضہ بھی شامل تھا کہ سب سے اہم کام یہی تھا۔ نئے فلیٹ کی ضرورت کے مطابق اشفاق صاحب بہت سا سامان نیا خرید لائے تھے۔ ماں بیٹی اس فلیٹ میں اسی سامان کی ترتیب دے رہی تھیں۔ اشفاق صاحب شوکت کے آنے سے پہلے گھر پہنچ گئے تاکہ شوکت آئے تو اسے گھر بند نہ ملے۔ وہاں وہ ضروری اشیاء علیحدہ کر رہے تھے کہ سردست 'فلیٹ' میں کون سی چیز جائے گی اور 'گھر' میں کیا کچھ چھوڑا جاسکتا ہے۔

شوکت آیا تو اشفاق صاحب اسے اپنے نئے فلیٹ پر لے گئے۔ اسے بتایا کہ اب ہم یہاں ملیں گے۔ یہ بطور خاص سرفراز کی وجہ سے لیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا اور جلد ہی آئے گا..... ممکن ہے کل ہی آجائے۔ ایسا ہوا تو اس سے ہمارے اُس گھر کا ذکر کرنا ہمیں لے آتا۔

گھر کے جملہ تینوں افراد جب گاڑی میں بیٹھے تو شوکت نے عدنان کا پوچھا۔

''شہزادہ نظر نہیں آرہا؟ وہ کہاں ہے؟ اب تو ماشاءاللہ بڑا ہوگیا ہوگا۔''

''ہاں ماشاءاللہ'' اشفاق صاحب بولے۔ ''وہ مسجد میں اعتکاف میں بیٹھا ہے۔ چاند کا اعلان ہوگیا تو گھر آجائے گا۔''

''اوہ! مبارک ہو آپ کو..... مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر۔'' شوکت واقعی خوش ہوا تھا۔

سرفراز نے ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ ہمہ اقسام پھل، کئی طرح کے کھانے، کئی رنگوں میں مشروب۔ گو کہ وہ کئی دن سے ایسے انواع کے کھانوں سے محروم تھے۔ تاہم ادب آداب سے واقف تھے۔ مرجھکوں کی طرح ٹوٹ نہیں پڑے۔ سرفراز نے بھی عدنان کی کمی کو محسوس کیا۔

''سر! آپ کا ایک بیٹا بھی تو تھا اسے ساتھ نہیں لائے؟''

''وہ اعتکاف میں ہے۔ چاند کا اعلان ہوگیا تو گھر آجائے گا۔''

''ماشاءاللہ! بہت اچھے! مبارک ہو آپ کو۔'' سرفراز بولا۔ ''لیکن وہ خود نہیں آئے گا، چاند کا اعلان ہوتے ہی ہم اسے لینے جائیں گے اسے۔''

''نہیں! وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے لینے کوئی نہ آئے میں خود آجاؤں گا۔'' اشفاق صاحب جلدی سے بولے۔

''ٹھیک ہے، میں اس سے کل مل لوں گا۔'' سرفراز بولا۔

شوکت سمجھ گیا تھا کہ وہ کیوں ایسا کہہ رہے ہیں لیکن اس وقت خاموش رہا۔

افطار اور خورد و نوش سے فراغت ہوئی۔ اشفاق صاحب نے سرفراز سے جانے کی اجازت طلب کی۔ انہیں عدنان کی فکر تھی کہ وہ گھر آگیا ہوگا۔ اسے تالا لگا ملا ہوگا۔

واپسی پر شوکت نے پھولوں کی ایک دکان پر گاڑی روکی۔ پھولوں کے چار ہار خریدے۔ اشفاق صاحب سمجھے کہ اپنے گھر کے لیے خرید رہا ہوگا لیکن اشفاق صاحب کے فلیٹ کے قریب پہنچنے سے پہلے اس نے پوچھا۔

''عدنان کون سی مسجد میں ہے۔ اسے ساتھ ہی نہ لے جائیں؟''

''ہوسکتا ہے وہ گھر پہنچ گیا ہو اسی لیے ہم نے بھی جلدی کی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اسے پرانے گھر پر دیکھ لیں۔'' اشفاق صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے!'' شوکت نے اشفاق صاحب کی تائید کی۔

پرانے گھر پر عدنان کو نہ پا کر شوکت نے کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ مسجد میں ہی آپ کا انتظار کر رہا ہوگا کیونکہ اعتکاف ختم ہوتا ہے تو ان کے گھر والے انہیں لینے آتے ہیں اور مبارک سلامت کرتے ہیں۔ یوں کرتے ہیں ہم سب جاتے ہیں اور مسجد سے اسے لے کر آتے ہیں۔''

صغریٰ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ابو! ہم عدنان کو لینے مسجد تک جاتے ہیں۔ اسے مبارک بھی دیں گے اور اسے اپنے نئے گھر لائیں گے ورنہ وہ ہمیں پرانے گھر پر نہ پا کر پریشان ہوجائے گا۔'' جو بات سب سوچ رہے تھے صغریٰ نے کہہ دی تھی۔

چاند کا اعلان ہو چکا تھا۔ اعتکاف کرنے والوں کو ان کے اہل خانہ ان کے دوست احباب دھج کے ساتھ لینے آئے تھے۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور ان کے بستر وغیرہ خود اٹھائے مبارک سلامت کرتے انہیں جلوس کی شکل میں مسجد سے لے گئے۔ رہ گیا تھا صرف اور صرف عدنان! اسے لینے کوئی نہ آیا اور نہ ہی کسی نے اس جانب توجہ کی۔ عدنان نے نوافل شروع کردیئے تھے۔ سب لوگ چلے گئے۔ اتنی بڑی مسجد میں صرف اکیلا عدنان ہی تھا۔ اسے تنہائی ملی۔ یکسوئی حاصل ہوئی تو اس نے اپنے رب کو پکارا۔

''اے اللہ! بچہ ضد کر کے، رو رو کر، ایڑیاں رگڑ کر اپنے ماں باپ سے اپنی بات منوالیتا ہے۔ ملازمین ہڑتال کر کے مالکان سے اپنے مطالبات منوا لیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے میرے مطالبات کوئی ٹیکٹری مالک پورے نہیں کرسکتا۔ میری ضد میرے ماں باپ پوری نہیں کرسکتے۔ میرا مطالبہ تجھ سے ہے۔ کوئی بادشاہ ہے تو تیرے در کا گدا ہے۔ میری دعا تو ہی قبول کرے گا۔ میں اپنے اس ٹوٹے پھوٹے پرانے گھر نہیں جاؤں گا۔ میری تجھ سے ضد ہے اگر تو نے میرے کہنے پر میرے ابو کو فریب کیا ہے تو جب تک میرے ابو کو پھر سے امیر نہیں کردے گا میں تیرا گھر نہیں چھوڑوں گا۔ جاؤں گا تو اپنے گھر جاؤں گا ورنہ تیرا گھر چھوڑ کر میں بھی کہیں نہیں جاؤں گا..... نہیں جاؤں گا..... نہیں جاؤں گا..... نہیں جاؤں گا..... نہیں جاؤں گا۔''

وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا 'نہیں جاؤں گا' کی رٹ لگاتے لگاتے اس کی آواز بلند ہوگئی۔ وہ آواز کے ساتھ ہی رو پڑا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔

معاً اسے اپنے کندھے پر کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ ڈر سا گیا۔ اس کا رونا یکلخت تھم گیا تھا لیکن ہچکیاں نہ رک سکیں۔ اس کی دانست میں اس وقت مسجد خالی تھی اور عشا کی اذان سے پہلے کسی کے آنے کی کوئی امید، کوئی امکان نہ تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ مسجد خالی ہی تھی۔ اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹ چکا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

''شہزادے!'' اسے پرانے لب و لہجے کی مانوس سی آواز سنائی دی۔

''یہ آواز!..... یہ آواز تو.....!'' سوچتے سوچتے اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی پشت پر اس کا پرانا ڈرائیور شوکت اپنے دونوں ہاتھوں میں ہار لیے کھڑا تھا..... جانے کب سے کھڑا تھا اس کی پلکیں بھی نم تھیں۔

''شہزادے! آپ کو اعتکاف مبارک ہو.....'' اس نے اس کے گلے میں ہار ڈال کر اسے گلے

لگاتے ہوئے کہا۔

''ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔ اللہ نے آپ کی ساری دعائیں قبول کرلی ہیں۔ آپ کے ابو پھر سے امیر ہوگئے ہیں۔ دیکھیں! میں ان کا ڈرائیور ہوں۔ چلیں! آپ کے امی ابو اور بہن باہر آپ کے انتظار میں ہیں۔ سب آپ کو لینے آئے ہیں۔''

عدنان مشینی انداز میں اس کے ساتھ ہولیا۔

مسجد کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ اس نے جونہی مسجد سے قدم باہر نکالے، کار کے دروازے کھلے اور اس میں سے اس کے امی ابو اور بہن صغریٰ باہر نکلے۔ صغریٰ نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ہار ڈالا، اعتکاف کی مبارک دی۔ پھر امی ابو نے بھی ہار ڈال دیئے۔ بیک وقت وہ امی اور ابو سے لپٹ گیا تھا۔ وہ خود کو ابو کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ ابو نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

''بھیا! تمہاری دعائیں اللہ نے سن لی ہیں تمہارا اعتکاف قبول ہوگیا ہے۔ اللہ نے ہمارے دن پھیر دیئے ہیں۔ یہ دیکھو! یہ شوکت انکل ہیں جو تمہیں سکول لے جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہمیں پھر سے مل گئے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ۔''

''آپ لوگ جائیں..... میں ابھی نہیں جاسکتا۔''

''کیوں بھئی! سب لوگ چلے گئے، مسجد خالی ہوچکی۔ اب عشاء کے وقت ہی لوگ آئیں گے تم بھی چلو!'' ابو نے کہا۔

''اللہ نے ہماری دعائیں قبول کی ہیں۔ میں اس کا شکریہ ادا کروں گا پھر گھر آؤں گا۔ میں اوابین پڑھوں گا۔''

''یہ اوابین کیا ہوتا ہے؟'' اشفاق صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ مغرب کی نماز کے بعد کے نوافل ہوتے ہیں۔ میں روزانہ پڑھتا ہوں۔ ابھی پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ لوگ آگئے۔ آپ جائیں میں عشاء کے بعد آجاؤں گا۔''

''تم اکیلے نہیں آسکو گے..... ہم نے وہ مکان چھوڑ دیا ہے اور نیا فلیٹ خرید لیا ہے۔ اس میں ہماری آج کی پہلی رات ہے۔'' صغریٰ بولی۔

''پھر تو میں اس پر بھی اللہ کا شکریہ ادا کروں گا کہ میں نے یہی دعا کی تھی کہ اے اللہ! میں اس پرانے گھر نہیں جانا چاہتا..... گیا تو اپنے گھر ہی جاؤں گا۔'' عدنان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''لیکن میں عشاء پڑھ کر ہی گھر جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے شہزادے! میں امی لوگ کو گھر چھوڑ کر پھر آجاؤں گا۔''

عشاء کی نماز میں بہت ہی کم افراد تھے۔ عدنان نے غور کیا کہ جو لوگ اعتکاف نشین تھے وہ بھی خال خال ہی تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد مسجد جلد ہی خالی ہوگئی تھی۔

شوکت عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ آگیا۔ وہ اشفاق صاحب اور اہل خانہ کو ان کے گھر چھوڑ کر اپنے گھر کا چکر بھی لگا آیا تھا۔ عدنان بہت دن بعد کار میں بیٹھا تھا۔ اب اس کا کھلنڈرا پن رخصت ہو چکا تھا۔ اس میں بردباری در آئی تھی۔ شوکت نے یہ تبدیلی جلد ہی محسوس کر لی تھی۔

''اتنے عرصے بعد مجھے آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' شوکت نے خامشی کو توڑا۔ عدنان خاموش ہی رہا۔ شوکت نے ادھر ادھر کی چند باتیں کیں لیکن عدنان خاموش ہی رہا۔ عدنان کو اس کے گھر پہنچا کر شوکت نے اشفاق صاحب سے جانے کی اجازت لی۔

''سر! میں کل گیارہ بجے تک آؤں گا..... آپ سب تیار رہیے گا۔''

''کیوں بھئی کہاں جانا ہے؟'' اشفاق صاحب حیران ہو کر بولے۔

''اللہ نے ہمارے شہزادے کی ساری دعائیں قبول کر لیں ہیں لیکن ان کی ایک فرمائش باقی ہے۔ وہ کل پوری ہوگی جب تک وہ پوری نہیں ہو جاتی شہزادہ مجھ سے ناراض ہی رہے گا۔'' شوکت بولا۔

''میں آپ سے ناراض تو نہیں ہوں۔'' عدنان بولا۔

''پھر میں نے اتنی باتیں کیں آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔''

''میں پڑھ رہا تھا۔''

''اوہ اچھا!''

''انکل آپ نے بتایا نہیں کل کہاں جانا ہے'' صغریٰ نے اشتیاق سے پوچھا

''میرا اپنے شہزادے سے وعدہ تھا کہ میں خود انہیں چڑیا گھر لے کر جاؤں گا۔ کل عید کا دن ہے خوب رونق ہوگی۔۔ ہم سب چڑیا گھر جائیں گے.....''

''ان شاءاللہ!'' سب نے باجماعت کہا۔

Aimun Library
Parsi Gate Chanesar Goth
Karachi - 75460 Pakistan

- **ناول کا ایک باب**
- **اقبال حسن خان**

راج سنگھ لاہوریا

رابرٹ نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور غصے سے بولا تو اُس کی آواز کا ارتعاش صاف کہہ رہا تھا کہ وہ نشے میں تھا۔

''کیوں آئے ہو یہاں گندے ہندوستانیو؟ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ ورنہ مار دوں گا۔''

مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے مجھ سے ڈیوڑھے تن و توش کے باوجود وہ اس وقت جس حالت میں تھا، اُسے قابو کرنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ مجھے فکر یہ تھی کہ اگر اس کوشش کے دوران اُسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو پھر اس کی کوئی بھی کہانی بن سکتی تھی۔ کیٹی کی آنکھوں میں خوف تھا اور چہرہ ایک بے بس عورت کا چہرہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چیخنے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ رابرٹ کے ہاتھ سے کسی طرح چھری چھین لوں۔ یہ تو میرے علم میں پہلے سے تھا کہ وہ شوقیہ باکسر تھا لیکن اس وقت ایسا کوئی خوف میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میں نے چھری تو نہیں چھینی البتہ رابرٹ کو کیٹی سے دُور کرنے کا ایک ہی طریقہ میری سمجھ میں آیا تو میں نے یہ پروا کیے بغیر کہ مجھے ایک عورت کے سامنے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، رابرٹ کو مخاطب کر کے اردو اور پنجابی گالیوں کا ماہرانہ ترجمہ کر دیا۔ ہماری گالی کی کاٹ ویسے بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے اور شاید اُس وقت مجھے کیٹی کی بے بسی پر غصہ بھی آیا ہوا تھا تو ترجمے نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ اس پر رابرٹ کا ردعمل بالکل وہی تھا جو میں نے سوچا تھا۔ شرابی آدمی کی توجہ کیٹی سے ہٹ گئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے چیخ کر کیٹی سے کہا کہ وہ کمرے میں جائے اور دروازہ اندر سے بند کر لے۔ میں چاہتا تھا کہ نیاز محمد بیرہ، رابرٹ کو قابو کرنے میں میری مدد کرے لیکن وہ انتہائی خوفزدہ تھا اور اُس کے منہ سے فقط گھگھیائی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میری ہدایت کے باوجود کیٹی کمرے میں نہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سہمی کھڑی رہی۔ رابرٹ میرے قریب آیا۔ وہ ہوا میں چھری لہرا رہا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ میرے اتنے قریب آ کر لہرائی کہ اگر میں ایک

طرف نہ ہو جاتا تو اُس کی لپیٹ میں آجاتا۔ اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں رابرٹ سے جسمانی طور پر نمٹتا اور وہی میں نے کیا۔ میں نے اُس کا چھری والا ہاتھ پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے تو چھری اُس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ نیاز محمد بیرے سے زیادہ تو کیٹی سمجھدار نکلی جس نے فوراً ہی وہ چھری اُٹھالی۔ رابرٹ مجھ سے لپٹا ہوا تھا اور اُس کے منہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ میں کیٹی کو خطرے سے نکال چکا تھا اور رابرٹ سے اُلجھنے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ مجھے مارنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نشہ اُسے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اگر رابرٹ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں دو چار مکوں میں اُس کا دماغ درست کر چکا ہوتا لیکن بہر حال وہ میرا افسر تھا اور انگریز تھا مگر مجھے کچھ تو کرنا تھا۔ میں نے رابرٹ کو دھکیل کر ایک کرسی پر زبردستی بٹھا دیا۔ وہ اُٹھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کیٹی کو شاید علم تھا کہ رابرٹ کا دماغ کیسے درست کیا جا سکتا تھا تو وہ آگے بڑھی اور اُس نے رابرٹ کے منہ پر دو بھرپور طمانچے مارے۔ رابرٹ کا چہرہ ایک طرف گھوما اور پھر دوسری طرف۔ میں رابرٹ سے دُور ہٹ گیا۔ اب وہ کسی قسم کی جارحیت نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے سامنے کھڑی کیٹی کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

کیٹی اُس کے قریب گئی اور چیخ کر بولی۔

''میں جا رہی ہوں گندے کتے۔ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔''

بیرہ نیاز محمد کیٹی کی بات نہیں سمجھا۔ وہ اس وقت اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ شاید پنجابی میں بھی یہ بات کی جاتی تو نہ سمجھتا۔ کیٹی اپنی بات کہہ کر وہیں کھڑی رہی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ سردی اور خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنا کوٹ پھرتی سے اُتارا اور اُس کے شانوں پر ڈال دیا۔ اُس نے تکلفاً بھی منع نہیں کیا۔ میں رابرٹ کے قریب گیا اور میں نے نرمی سے کہا۔

''اُٹھیے مسٹر رابرٹ۔ میں آپ کو آپ کی خواب گاہ میں پہنچا دیتا ہوں۔''

وہ رات رابرٹ کی بدنصیبی کی رات تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور اُس نے میرے منہ پر اتنے زور سے طمانچہ مارا کہ میرا چہرہ دوسری طرف گھوم گیا۔ رابرٹ نے یہ طمانچہ تنہائی میں مارا ہوتا، یعنی کسی ایسی جگہ جہاں میرے اور اُس کے علاوہ اور کوئی نہ ہوتا تو شاید میں برداشت بھی کر لیتا لیکن یہ طمانچہ کیٹی اور نیاز محمد بیرے کی موجودگی میں مارا گیا تھا۔ میں نے پھر بھی کوشش کی کہ اپنا غصہ قابو میں رکھوں لیکن جب رابرٹ نے مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں ماں کی گالی دی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے ایک دیوانگی کے عالم میں رابرٹ کے منہ پر دو طمانچے مارے۔ وہ ایک بار پھر کرسی میں گر گیا اور اپنے گال مسلنے لگا۔ میرے طمانچے کھا کر اُس کا آدھا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اُس نے مجھے گھورا اور بولا۔

''تمہیں یہ بہت مہنگا پڑے گا ڈرٹی نیٹو'' (Dirty Native)۔

میرے اور رابرٹ کے درمیان جو بھی تھا، طمانچوں کے اس تبادلے کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ میں اُس وقت اتنے غصے میں تھا کہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ رابرٹ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ باکسر تھا لیکن وہ دو طمانچے کھانے کے باوجود جو مجھ سے کوئی تعرض نہیں کر رہا تھا تو شاید اس کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ شراب نے اُسے اُٹھنے اور حملہ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ بہر حال کچھ بھی تھا وہ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ کیٹی چند لمحوں کو دوسرے کمرے میں گئی۔ وہ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک اٹیچی کیس تھا اور جسم پر ایک گرم اور لامبا کوٹ۔ اُس نے مجھ سے کہا۔

''تم میرے لئے کسی تانگے کا بندوبست کر سکتے ہو؟ میں اسی وقت دلی جا رہی ہوں۔''

میں اور کیٹی کمرے سے نکلنے لگے تو میں نے گھوم کر دیکھا۔ بیرہ نیاز محمد رابرٹ کو سنبھال رہا تھا۔ رات انتہائی سرد اور اندھیری تھی اور میں جانتا تھا کہ اس وقت کیٹی کے لئے کوئی تانگہ ڈھونڈنا کس قدر مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ ہم نے میدان پار کیا اور میرے کوارٹر کے برامدے میں پہنچے۔ میں ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا تو میں نے کیٹی کو وہیں ٹھہرنے کو کہا اور ایک اونی چادر، جو اماں نے گزشتہ بار میرے ساتھ کر دی تھی، اپنے گرد لپیٹی کیونکہ کیٹی میرا کوٹ وہیں چھوڑ آئی تھی اور اس کے بارے پوچھنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے کیٹی سے کہا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اُسے پشاور سے آکر بمبئی جانے والے فرنٹیئر میل ہی مل سکتی تھی جو دلی سے گزر کر جاتی تھی لیکن چک الالہ کے سٹیشن پر نہیں رکتی تھی اور ہمیں راولپنڈی کے ریلوے سٹیشن جانا ہوگا اور یہ بھی کہ اس وقت کسی تانگے کا حصول ناممکن تھا، چنانچہ ہمارے پاس میری سائیکل کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں تھی۔ کیٹی فوراً ہی آمادہ ہو گئی۔ میں نے کیٹی کو سامنے بٹھایا، اُس کا اٹیچی کیس پیچھے باندھا اور ہم راولپنڈی ریلوے سٹیشن کے لئے روانہ ہو گئے۔ پشاور سے ٹرین آنے میں ابھی کچھ دیر تھی لیکن راولپنڈی سے لگنے والے ڈبے سائیڈ لائن پر کھڑے تھے۔ کیٹی نے ٹکٹ لیا اور ہم پہلے سے لگے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں پہنچ گئے۔ ڈبے میں صرف ایک انگریز عورت اور اس کی چار پانچ سالہ بچی پہلے سے موجود تھیں۔ بچی سو رہی تھی اور انگریز عورت کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اُس نے کیٹی کو ایک نظر دیکھا اور مطالعہ میں مشغول ہو گئی۔ ہم ڈبے کے آخری سرے پر بیٹھے۔ میں نے کیٹی کے کہنے پر چائے کے لئے کہا۔ چائے کا پہلا گھونٹ لیتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس چائے کی کتنی شدت سے ضرورت تھی۔ کیٹی نے بھی شاید ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ راستے میں ہمارے درمیان صرف موسم اور ویران راستے کے حوالے سے کبھی کبھی کوئی بات ہوتی تھی۔ کیٹی خاموش تھی اور میں اس تکلیف دہ واقعے کی تفاصیل از خود نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔

کیٹی نے چائے ختم کی بطویل سانس لی اور ایک سگریٹ سلگا کر دو تین آسودہ کش لے کر بولی۔

''حامد۔ آج رات تم نے میری جان بچائی ہے اور میں یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا تو میں نے تکلفاً کہا۔

''سب ٹھیک ہے کیٹی۔ ہوا سو ہوا۔ ویسے تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ بات اتنی کیسے بڑھ گئی تھی؟''

کیٹی نے لمحہ بھر سوچا اور بولی۔

''ایک اور عورت ہے۔ لزا۔ تمہارے محکمے میں۔ کسی انگریز ریٹائرڈ کرنل کی بیٹی۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اُس نے آج رات نشے میں مجھے وہ عورت قرار دیا جسے کوئی بھی ایک رات اپنے پاس رکھ کر اگلی صبح لات مار کر گھر سے نکال سکتا ہے۔ وہ میری طلاق کے بعد میری دو تین دوستیوں سے واقف ہے اور یہ میں نے ہی اُسے بتایا تھا۔ اُس نے مجھے ایک طوائف سے بدتر عورت قرار دیا۔ میں نے جواب دیا تو ہم لڑتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے اور اُس نے مجھ پر چھری تان لی۔ بیرہ نیاز محمد چھری نکلتے ہی بھاگ کر تمہیں بلانے چلا گیا تھا۔ اُس کے بعد جو ہوا تمہیں پتہ ہے۔''

اس کے بعد جو ہوا تھا وہ یقیناً مجھے پتہ تھا لیکن اگلی صبح میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا یہ مجھے پتہ تھا اور نہ ہی کیٹی کو۔

''میں نے زندگی میں ہمیشہ غلط فیصلے کئے۔'' وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''میری شادی غلط فیصلہ تھا۔ پھر وہ دو چار مرد جو میری زندگی میں آئے اور اب یہ۔ میں ایک احمق عورت ہوں۔''

وہ ایسی نہیں تھی تو میں نے اُسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں تھا۔ اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔

''میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے تم جیسا دوست ملا حامد۔ تم ایک بہادر آدمی بھی ہو۔ اگر وہ تمہیں زخمی کر دیتا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرتی۔''

مجھے یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی کہ کیٹی مجھے اپنا دوست سمجھ رہی تھی۔ اپنا دوست بنا چکی تھی۔ میں نے کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار رہوں گا کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو۔ میں ہمیشہ اس دوستی کی قدر کروں گا۔''

ٹرین کو جھٹکا لگا تو میں سمجھ گیا کہ اب اسے پشاور سے بمبئی جانے والی ٹرین سے جوڑا جائے گا تو میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا۔

''میں تم سے رابطہ رکھنا چاہوں گا کیٹی۔ کیا تم بھی ایسا چاہو گی؟''

اُس نے جواب کے بجائے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر مجھے دیا اور کہا۔

''یہ میرا دلی کا پتہ ہے۔ تم وہاں مہمان کی طرح نہیں، گھر کے مالک کی طرح آ سکتے ہو۔ جب چاہو۔ اس میرا فون نمبر بھی ہے۔ آنے سے پہلے یہ ضرور معلوم کر لینا کہ میں شہر میں ہوں یا نہیں۔''

ٹرین چلنے لگی اور جب تک آؤٹر سگنل سے نکل نہیں گئی، کیٹی کھڑکی سے منہ نکالے ہاتھ ہلاتی رہی۔ ٹرین کی عقبی سرخ روشنیاں نقطے میں تبدیل ہوئیں تو میں سٹیشن سے نکل آیا۔

میں نے حسب معمول دفتر جانے کی تیاری کی اور جب میں دفتر پہنچا تو رابرٹ اپنے دفتر کے باہر ٹہل رہا تھا۔ اُس نے مجھے معمول کا سلام کرنے کی مہلت نہیں دی اور ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کرتا ہوا اپنے دفتر میں داخل ہو گیا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا بلکہ اُس کی پشت پر کھڑا ہوا اور چند لمحوں تک مجھے ایک بغیر تاثر والے چہرے سے دیکھ کر بولا۔

''دو باتیں۔ دو باتیں ہو سکتی ہیں۔''

میں منتظر رہا۔ وہ لمحہ بھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''ایک بات تو یہ ہو سکتی ہے کہ میں تم پر سٹور زکے مال میں خورد برد کا الزام لگا کر تمہیں چارج شیٹ کروں۔ گواہیاں دینے والے میرے ہاتھ میں ہیں لیکن میں یہ اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تم نے بہر حال میرے ہاتھ سے اُس حرامزادی کو زخمی یا قتل ہونے سے بچایا دوسری صورت یہ ہے کہ تم خود ہی استعفیٰ دے دو جسے میں فوراً منظور کر کے اُوپر مزید کارروائی کے لئے بھجوا دوں گا۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

پھر وہ ٹہلا اور ایک بار پھر اپنی کرسی کی پشت پر کھڑا ہوا۔ اُس نے اس بار میری طرف سے دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔

''ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے میں نیاز محمد بیرے سے یہ گواہی دلوا دوں کہ تمہارے میری بیوی سے ناجائز تعلقات تھے اور تم نے میرے گھر میں اُس کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی صورت میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

میں چلنے لگا تو اُس کی آواز پر رکا۔ وہ بولا۔

''اور ہاں ایک صورت اور بھی ہے۔ تم نیاز محمد بیرے کے سامنے مجھ سے معافی مانگ لو لیکن اس کے لئے تمہیں ہندوستانی طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔ میرے قدموں پر سر رکھنا ہو گا۔ تمہیں منظور ہے؟''

میں اب چاہتا بھی تو یہاں نوکری نہیں کر سکتا تھا۔ میرا یہاں سے نکالا جانا طے ہو چکا تھا تو مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس گھٹیا انگریز سے ڈرتا، چنانچہ میں نے کہا۔

''میں استعفیٰ خود ہی دے رہا ہوں کیونکہ تم جیسے کمینے آدمی کے ساتھ میں خود بھی نوکری نہیں کر سکتا اور کیٹی تمہاری بیوی نہیں تھی۔ وہ تمہارے ساتھ بنا شادی کے رہ رہی تھی اس لئے تم اپنی شادی والی بکواس میرے سامنے دوبارہ مت کرنا۔''

اُس کا منہ حیرت سے ایک مرتبہ کھلا اور بند ہو گیا لیکن وہ مسکراتا رہا۔

''وہ ایک مرد مار عورت ہے۔ اُس نے تمہیں یہاں تک بتا دیا تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے اور اُس کے تعلقات کی نوعیت کچھ اور ہی رہی ہو گی۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم عین میری ناک کے نیچے اُس کمینی کے ساتھ سوتے رہے ہو۔ دفعان ہو جاؤ اور جو میں نے کہا ہے اُس پر سوچو۔''

مجھے کچھ بھی نہیں سوچنا تھا تو میں نے اُس کی میز سے کاغذ اُٹھایا، اپنی جیب سے قلم نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے چار سطریں گھسیٹ کر دستخط کئے اور کاغذ میز پر پھینک کر کہا۔

''تم یہی چاہتے تھے نا؟ یہ میں نے کر دیا۔ تمہارا خیال تھا کہ ایک ہندوستانی ایک سو پچیس روپے کی نوکری بچانے کے لئے تمہارے پیروں میں گر کر تم سے رحم کی بھیک مانگے گا؟ تم نے غلط سوچا تھا۔''

میں چلا اور میں نے دروازے میں رک کر کہا۔

''ہماری پچھلی نسلوں کو تم نے تعلیم سے محروم رکھا تھا تو نیاز محمد بیرے جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ تم نے مجھے بھی اُسی قطار میں رکھا اور غلطی کی۔ یہ ملک ہمارا ہے اور سب نوکریاں ہماری ہیں۔ تم دو چار سال بعد یہاں سے دفعان ہو جاؤ گے تو حالات کچھ اور ہوں گے۔ خدا حافظ۔''

میں دروازے سے نکلنے لگا تو وہ بولا۔

''ایک منٹ۔ ایک منٹ۔ میری بات سنو۔''

میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ وہ مجھے نوکری سے برخواست نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بس اتنا چاہتا تھا کہ میں بیرے کے سامنے اُس کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگ لوں تا کہ اُسے میں نے جو تھپڑ مارے تھے، اُس کا مداوا ہو سکے۔ میں نکلنے لگا تو اُس نے مجھے رکنے کو شاید اسی لئے کہا تھا، لیکن میں نہ رکا۔

تین گھنٹے بعد میں راولپنڈی سے چل کر اپنے شہر جانے والی ریل میں بیٹھا ہوا تھا۔

شاید ہندوستان کا وائسرائے استعفیٰ دے کر چلا جاتا تو اتنا شدید ردِ عمل نہ ہوتا جو میرے نوکری چھوڑ کر گھر آنے پر ہوا۔ ابا جی جو صحن کے کونے میں اپنا حقہ تازہ کر رہے تھے مجھے بار بار خانہ ساز گالیوں کے ساتھ مخاطب کرتے تھے۔ اور جب وہ اپنا حقہ لے کر چارپائی پر بیٹھ گئے اور ستر پوشی کے خیال سے اپنی دھوتی رانوں تلے دبا چکے تو اُنہوں نے دوسری چارپائی پر اُداس بیٹھی میری ماں سے کہا۔

''بے غیرت ہے بے غیرت۔ کسی بے حیا کا بچہ ہے۔ اوئے میں کہتا ہوں جس بندے نے انگریز کی نوکری چھوڑ دی اُس پہ لاکھ دفعہ تالت ہے۔ زندگی بن جاتی۔ ہمارے ابا جی نے انگریزوں کی جوتیاں سیدھی کیں، دنیا بھی بنائی اور آخرت بھی۔ اور یہ گھر جس میں ہم اس ٹیم پہ بیٹھے ہوئے ہیں، ایک کمرے کا تھا۔ اب حویلی ہے پوری۔ یہ سب انگریزوں کی نوکری کے طفیل ہے۔''

ابا جی نے دادا مرحوم کی آخرت سنورنے کو بھی انگریز کی دین بتایا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے کہا۔

''ابا جی۔ کچھ خدا کا خوف کریں۔ یہ لال مونہوں والے کافر اپنی بخشش تو کروا لیں پہلے۔ توبہ کریں ابا جی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

میرے ابا جی نے جواب دینے سے پہلے حقے کے نَے سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولے۔

''اوئے اچھا؟ تو ہم سے زیادہ جانتا ہے؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ میں اپنے یار اصغر کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ یہ سوچا؟ ناں اصل بات کیا ہوئی تھی؟''

وہ یہ سوال کوئی دس مرتبہ پوچھ چکے تھے۔ ظاہر ہے میں اُنہیں پورا قصہ نہیں سنا سکتا تھا تو میں نے بار بار کہی ہوئی بات ایک مرتبہ پھر دہرائی۔

''بتایا تو ہے آپ کو۔ میرا جی نہیں لگا وہاں۔''

یہ بات ابا جی کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔

اماں اور ابا کئی دنوں تک دماغ لڑا کر آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جو میں نگی لگائی نوکری پر لات مار کے گھر چلا آیا ہوں تو اس کے پیچھے محلے کے کسی جلنے والے کا ہاتھ صاف دکھائی دے رہا ہے یعنی میں تعویذ گنڈوں کے زیرِ اثر ہوں۔ مجھ سے بالا بالا اُنہوں نے ماموں احمد دین کو خط لکھ دیا ہو گا جبھی تو وہ اُس شام ابا جی کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور مجھے میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے، وقتاً فوقتاً کچھ پڑھ کر میری طرف پھونکیں مار رہا تھا۔ مجھے شدید اُلجھن ہو رہی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جیرے کے ہوٹل پر آج اِدھر اُدھر کے شاعر جمع ہو رہے تھے اور ایک مختصر سے مشاعرے کا ڈول ڈالا گیا تھا۔

میرا یہ ماموں ہمارے شہر میں کسی پیر کا مرید تھا اور جب ہمارے گھر آتا اپنے پیر کی کرامات کے اُلٹے سیدھے قصے بھی سنایا کرتا تھا۔ پیر صاحب کے تعویذوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اتنے جلالی ہوتے تھے کہ چلتے پانی میں ڈال دیئے جاتے تو پانی بیچ سے پھٹ جاتا تھا اور صاف ننگی پرچھیاں تڑپتی دکھائی دینے لگتی تھیں کہ جتنی جی چاہے ہاتھ بڑھا کے اُٹھا لو!

میرا ماموں جو میرا اسسر ہوتے ہوتے بھی رہ گیا تھا اور جو اپنے شہر میں منیاری کی دکان چلاتا تھا اور ساتھ ہی عورتوں کی ضروریات کا وہ سامان بھی بیچا کرتا تھا جسے عورتیں خود ہی خریدنا پسند کرتی ہیں۔ اُس نے رنگین رومالوں، بنیانوں کے ساتھ وہ سامان بھی ہوا میں لٹکا رکھا ہوتا تھا جو مجھے معیوب لگتا تھا۔ ماموں چلتی عورت کے قدموں کے انداز سے اُس کے کردار پر رواں تبصرہ کرتا اور اپنے ڈھنگ کے مطالب نکالا کرتا لیکن میرے حسابوں وہ ایک احمق آدمی تھا کہ ہر ہفتے باقاعدگی سے ریس کھیلنے لاہور جاتا اور وہاں سب کچھ لٹا کر واپس آجاتا تھا۔ ہم اُسے ضرور ماموں کہتے تھے لیکن محلے اور اُس بازار میں جہاں اُس کی دکان تھی وہ احمد دین جواریا کہلاتا تھا۔ دراصل وہاں احمد دین نام کا ایک شخص اور بھی تھا اس لئے لوگ جب میرے ماموں کا تذکرہ کرتے تھے تو دونوں میں تخصیص کے خیال سے میرے ماموں کے نام کا لاحقہ ضرور استعمال کرتے تھے۔

میرے والدین پیروں فقیروں اور اُن کی کرامات کے بہت قائل تھے اور ماموں کے پیر کو تو وہ ولایت کے کسی بلند درجے پر فائز سمجھتے تھے لیکن اُنہوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ اگر ماموں کے پیر صاحب اتنے ہی پہنچے ہوئے تھے تو ماموں کی بیٹی گلو، یعنی میری منگیتر نے اپنی مرضی سے شادی کیسے کر لی اور یہ کہ ماموں لاہور میں پابندی سے جو ریس ہارا کرتا تھا تو اس سلسلے میں پیر صاحب اُس کی امداد کیوں نہ کرتے تھے؟ میں نے دبی زبان سے ایک مرتبہ ابا جی سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ اُلٹے میرے سر ہو گئے۔

''اوے کافرا۔ اوئے کافرا۔ اللہ والوں پہ اعتراض کرتا ہے؟ ہمیں بھی ساتھ میں گناہگار بناتا ہے؟ یہ اللہ والوں کے بھید ہیں جو ہم گناگاروں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ توبہ کر توبہ۔''

اماں بھی دنوں تک میری اس گستاخی کے اثرات کو ٹالنے کے لئے پتہ نہیں کون کون سے لمبے لمبے وظیفے پڑھتی رہیں۔

میرا ماموں ابا جی کی پائینتی بیٹھا تھا۔ اُس نے دھوتی کرتے کے علاوہ ایک بڑا سا چاندی کا تعویذ گلے میں ڈال رکھا تھا اور آنکھوں میں لگے سرمے کا کچھ حصہ میں اُس کی آنکھوں سے باہر بھی دیکھ سکتا تھا۔ ماموں کے ہاتھ میں ہمہ وقت ایک تسبیح ہوتی تھی اور یہ بات میرے لئے انتہائی حیرت کی حامل تھی کہ وہ کسی عورت کا بدمعاشی سے بھی تذکرہ کرتا تب بھی یہ تسبیح مسلسل اپنی اُنگلیوں میں گھماتا رہتا اور وقفے وقفے سے اُس کے ہونٹ بھی ہلتے رہتے۔ ایک مرتبہ مجھے اُس کی اپنے ابا جی سے گفتگو سننے کا اتفاق ہوا۔ دونوں کمروں کے بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں ماموں کی گفتگو بہت صاف سن سکتا تھا۔

''میں تو حیران رہ گیا بھائی جی۔ میں سمجھا اپنے ساتھ جو چھوکری لائی ہے، اُس کے لئے باڈی خریدنے آئی ہوگی۔ میں تو آنکھوں آنکھوں میں عورتوں کا ،،سیز،، ناپ لیتا ہوں مگر اُس نے مجھے چکر میں

ڈال دیا۔ کبھی لگتا ہے تھا اُنتھی ہے۔ کبھی بڑھ کر چالی اور کبھی پھر گھٹ کر چھتی۔ کسی کسی عورت کی چھاتی میں ،،الیشلک،، لگا ہوتا ہے۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔''

''ناں۔ پھر کیا ہوا؟''

ابا جی کے اندر کا مرد اب انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا اور میں نے شوق کو ان کی آواز میں لہریں لیتا محسوس کیا تھا۔

''میں نے کہا بی بی تمہارا سیز کیا ہے؟ میرا تو دماغ پاغل ہو گیا ہے۔ ایسے بات نہیں بنے گی۔ اگر ازاجت ہو تو......''

اگلی بات غالبًا سرگوشی میں کہی گئی تھی کیونکہ اس کے بعد میں نے دونوں کا مشترکہ قہقہہ سنا۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اماں کو شبہ تھا کہ مجھ پر کسی نے تعویذ کروا دیئے تھا اور ابا جی نے اماں کی بات فوراً تسلیم کر لی تھی اور نتیجتًا اس وقت منیاری کی دکان چلانے والا اور جوئے میں اپنا پیسہ تباہ کرنے والا ماموں ہمارے گھر کے صحن میں درِ تحقیق وا کئے بیٹھا تھا۔

''ناں کیا یہی اصلی بات ہے جو تو نے لگی لگائی نوکری چھوڑ دی؟''

میں نے ایک بار پھر بتایا کہ یہی اصل بات تھی۔

ماموں کچھ دیر آنکھیں بند کئے سوچتا رہا اور جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا۔

''تیرے اُوپر ایک عورت دکھتی ہے اور تیری نوکری چھوٹنے کا سبب بھی وہی ہے۔''

مجھے جھٹکا سا لگا۔ یقینا میری نوکری چھوٹنے کا سبب ایک عورت تھی اور وہ عورت کیٹی تھی لیکن کیا واقعی یہ جواری ماموں اتنا پہنچا ہوا تھا کہ اُس نے ایک جھٹکے میں میرے راز پر سے پڑا ہوا پردہ کھینچ کر اُتار دیا تھا۔ میں نے اُسے اپنی بات کا ردِعمل اپنے چہرے پر تلاش کرتے پایا تو سوچا، پڑا ہوا کرے وہ کسی قسم کا بزرگ میں کبھی یہ بات کسی سے نہیں کہوں گا کہ میں نے وہاں سے نوکری کیوں چھوڑی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنی تمامتر کوشش کے باوجود اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو نہیں رکھ سکا تھا تبھی تو ماموں نے اپنی مسکراہٹ کو مزید گہرا کر کے کہا تھا۔

''بڑی کانٹا عورت ہے وہ''۔ اگر بازاری زبان میں کہا جاتا تو یقیناً کیٹی ایک ،،کانٹا،، عورت تو تھی۔ میں نے کہا۔

''کوئی عورت وورت کا چکر نہیں ہے ماموں۔ تم خواہ مخواہ کے اندازے لگا رہے ہو۔ بھلا وہاں بیابان میں عورت کہاں سے آگئی؟''

ماموں پھر مسکرایا اور قدرے رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''دیکھ پُت۔ ٹھیک ہے۔ میں ایسے کاموں میں ابھی کچا ہوں لیکن پیر صاحب کے سامنے ایسے انکار نہ کرنا ورنہ وہ کتنے جلالی ہیں، تجھے ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے۔ جو بھی سچ ہے میرے سامنے ہی کہہ دے۔''

سچ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا۔

''جو سچ تھا میں نے بتا دیا ہے۔ پہلے ہی دن سے بتا رہا ہوں۔ اب اگر کوئی نہ مانے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

ابا جی نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

''تیرے مامے کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی کنجرا۔ کدھر جا رہا ہے؟''

میں پھر بیٹھ گیا تو ماموں بولا۔

''ہو سکتا ہے میری بات غلط بھی ہو کیونکہ یہ موکل کبھی کبھی ہم سے مذاق بھی کرتے ہیں لیکن پیر صاحب؟ اللہ میری توبہ، اُن سے بچنا بڑا مشکل ہے۔ ٹھیک ہے۔ کل صبح میرے ساتھ چلنا۔''

ماموں کی دوسری بات نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ ماموں نے ایک تکا لگایا تھا جو نہ لگ سکا تو وہ اب بات کا رخ دوسری طرف موڑ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''مجھے اُمید ہے کہ میں کوئی دوسری نوکری ڈھونڈ لوں گا اور مجھے کسی پیر ویر کے پاس نہیں جانا۔''

اس مرتبہ میں تیزی سے باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھا تو ابا جی کی گالیاں میں نے گلی کے سرے تک سُنیں۔

جیرے کے ہوٹل پر بڑی رونق تھی لیکن یہ رونق اب گلی تک یوں نہیں تھی کہ بڑا کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر البتہ خوب رونق تھی۔ بجی اور خلش مجھے اندر داخل ہوتے ہی دکھائی دیئے تھے۔ خلش نے ایک لامبا سا کوٹ پہن رکھا تھا اور وہ مونگ پھلیاں کھا رہا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ شعرا کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے جن کے بارے میں تین دن سے میں سن رہا تھا۔ میں بجی کو نوکری چھوڑ کر آنے کی اصل وجہ بتا چکا تھا لیکن خلش کو علم نہیں تھا تو وہ حیرت سے بولا۔

''تم نے نوکری چھوڑ دی؟ یہ سب کیسے ہوا عزیزم؟''

میں خلش کو ایک ذمہ دار آدمی سمجھتا تھا تو میں نے اُسے ساری بات بتا دی۔ خلش میری بات کا وہ حصہ سن کر بہت خوش ہوا جس میں رابرٹ کو دو تھپڑ مارنے کا حوالہ تھا۔ اُس نے رابرٹ پر رکھ کر ہندوستان پر حکومت کرنے والے سبھی انگریزوں کو ماں کی گالی دی اور ہنس کر بولا۔

''تو اب کیا کرو گے؟ ایک اور نوکری؟ ایک اور غلامی؟''۔

بی اے پاس آدمی کا ٹھالی گھومنا ایک ایسا جرم تھا جسے کوئی بھی معاف نہ کرتا تو میں نے اقرار کیا کہ مجھے کچھ تو کرنا تھا۔ بجی نے کہا۔

''میں تو کہتا ہوں کہ تُو چاچے کے ساتھ دکان پر بیٹھ جا اور خاندانی کام سیکھ لے۔ دیکھ اس کام میں بڑی برکت ہے۔ تُو پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس کام کو اپنے باپ سے بہتر چلا سکتا ہے۔''

ابا جی کا سبزی منڈی میں آڑھت کا کاروبار تھا۔ وہ لہسن پیاز پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز رکھتے تھے اس لئے شاید یہی وجہ تھی کہ وہ نہا دھو کر لباس بدلے ہوئے بھی ہوتے تب بھی اُن کے پاس سے مذکورہ اجناس کی بُو آیا کرتی تھی اور غالبًا برسوں اس کاروبار سے منسلک رہنے کی وجہ سے یہ بو ان کی گفتگو میں بھی شامل ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''نہیں یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ میں اگر نوکری نہیں کروں گا تو یہ کام بھی نہیں کروں گا۔''

بجی بولا۔

''میں خود سوچ رہا ہوں کہ ابا جی کے ساتھ دکان پر بیٹھ کر کم از کم پاجامے قمیص کی کٹنگ ہی سیکھ لوں اور پھر دلی جا کر اپنا کام شروع کر دوں۔''

مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ بجی کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

''تُو تو کہتا ہے کہ میں زندگی ایسے ہی گزار دوں گا۔ اب کام کرنے کا خیال کیسے آگیا؟''

اس پر بجی تو مسکرا کر رہ گیا لیکن خلش نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''تجھے نہیں پتہ؟ شادی کا وعدہ کر چکا ہے کسی سے؟''

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بجی نے شادی کا ارادہ کر لیا تھا کیونکہ اپنی بنگالن محبوبہ سوسن کے مرنے کے بعد وہ کبھی ایسا نہ کرنے کا مصمم ارادہ کئے بیٹھا تھا اور اب اس بات کو کوئی تین سال تو ہو ہی چلے تھے۔ بہر حال مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بجی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس مرتبہ سگریٹ سلگا کر وہ خود ہی بولا۔

''یار میں بہت سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عورت کے بغیر زندگی کچھ بھی نہیں۔ عورت کے بغیر زندگی صرف رشی، سادھو اور اولیا گزار سکتے ہیں۔ ہم جیسے عام لوگ نہیں۔ ٹھیک ہے مجھے سوسن سے بڑی محبت تھی۔ اُس سے شادی ہو جاتی تو میری زندگی زیادہ بہتر گزر سکتی تھی لیکن وہ نہیں تو کوئی عورت تو ہونی چاہئے مرد کی زندگی میں۔''

چونکہ بجی مجھ سے برسوں کہتا رہا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا اور فطرت سے لڑ کر ثابت کر دے

گا کہ عورت کے بغیر ایک مرد ہرگز ادھورا نہیں ہوتا تو وہ میرے سامنے بات کہتے ہوئے کچھ جھجک بھی رہا تھا اور مجھے سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ وہ مجھے غلط سمجھ رہا تھا کیونکہ میں نے ہمیشہ اُسے یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ ضرور شادی کرے اور پھر اُس کے باپ کا بھی یہی خیال تھا کہ شادی کر لینے کی صورت میں ججی کی آوارگیاں ختم ہو سکتی تھیں۔ جب ججی اپنی آدھی ادھوری باتیں کر چکا تو خلش نے ایک ایسی بات کی کہ گفتگو کا رخ ہی تبدیل ہو گیا۔

وہ بولا۔

''یہ جو عورت ہے کیتھرین، جس کی وجہ سے تیری نوکری جاتی رہی، بہت خوبصورت ہے؟''

میرے خیال میں ایسا تھا تو میں نے کہا۔

''بہت تو نہیں لیکن وہ خاصی دل کش عورت کہی جا سکتی ہے؟''

خلش نے سگریٹ کے گل کو چند لمحوں تک دیکھا جیسے اگلے سوال کی تیاری کر رہا ہو یا پھر گہری سوچ میں ہو۔ پھر اُس نے سگریٹ کا کش لگایا اور دھواں چھوڑ کر بات کی۔ لیکن اُس کے الفاظ وہ نہیں تھے جو میں نے لکھے ہیں، مقصد یہی تھا۔

''تیرا جی کبھی اُس کے ساتھ سونے کو چاہا؟ میرا مطلب ہے کہ ایسی عورتیں زُود یاب ہوتی ہیں نا؟''

ججی زود یاب کا مطلب نہیں سمجھا تو اُس نے پوچھ لیا۔ مطلب بتانے کے بعد خلش نے کہا۔

''اپنی طلاق کے بعد وہ دو چار مردوں کے ساتھ سوتی رہی تھی اور ڈیڑھ دو سال سے اس حرامی انگریز کے ساتھ ایک چھت تلے رہ رہی تھی تو اُس کا حصول ایسا مشکل تو نہ ہو گا۔''

اُس نے حصول کے لئے پھر ایک فحش لفظ استعمال کیا۔

میں نے کیٹی کے حوالے سے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں تھا اس لئے میں نے کہا۔

''میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔''

خلش تلخی سے بولا۔

''ابے تو کیا تُو اُس کے ساتھ گاندھی جی کی بکری کے بارے میں باتیں کرتا تھا؟''

میں نے کہا۔

''ہم ایک دفعہ طویل وقت کے لئے ضرور ساتھ بیٹھے تھے، پھر لمبی ملاقات ہی نہیں ہوئی حالانکہ وہ میرے ساتھ شراب نوشی کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات اُس نے دو مرتبہ کہی تھی۔''

خلش نے طویل سانس لی۔

''تو اس کا موقع نہیں آیا۔ کوئی خاص وجہ؟''

میں نے ذہن پر زور ڈالا تو مجھے کوئی خاص وجہ دکھائی نہیں دی۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ وہ اس دوران لمبے لمبے وقفوں کے لئے راولپنڈی سے باہر رہی تھی۔ شاید ایسا موقعہ آ بھی جاتا کہ ہم اکٹھے بیٹھ کر شراب نوشی بھی کرتے لیکن پھر وہ واقعہ ہو گیا اور میں چلا آیا۔ میں نے کہا۔

''نہیں کوئی خاص وجہ نہیں لیکن تُو اس بات کو اتنا زیادہ کیوں بڑھا رہا ہے؟''

ججی ہنسا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔

''میرے بلبل نے مجھ سے آج رات ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ میں چلا ورنہ وہ بیچاری اُداس ہو جائے گی۔''

میں حیران تھا کہ ایک لڑکی، ہمارے شہر اور اتنی سرد رات میں کیسے ججی سے ملنے آ سکتی تھی لیکن میرے استفسار سے پہلے ہی ججی چلا گیا تو میں نے یہی سوال خلش کے سامنے رکھا۔ وہ ہنسا اور بولا۔

''سالا اُس کے گھر کی ڈیوڑھی میں ملنے جاتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں یہ جگہ صدیوں سے عاشقوں کے ملنے کے لئے سب سے محفوظ گردانی جاتی رہی ہے۔''

خلش دیر تک اپنی اُس نوکری کی باتیں کرتا رہا جسے وہ غلامی سمجھتا تھا۔ میں جب گھر کے لئے روانہ ہوا تو شدید سرد رات میں گرنے والی شبنم کی ٹھنڈک اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا۔

امریکہ نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ جنگ ختم ہو گئی لیکن ہندوستان میں جاری جنگ آزادی تیز ہو گئی۔ ایک طرف مطالبہ پاکستان تھا، دوسری طرف انگریزوں کا یہ احساس قوی تر ہو گیا تھا کہ اب جلد یا بدیر اُنہیں ہندوستان چھوڑنا ہو گا۔ ہندوستان کے راجے اور نواب جن میں سے اکثریت انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے خلاف تھی جبکہ صدیوں تک شمال سے آنے والوں اور اُن سے مختلف مذہب رکھنے والوں کی مخالفت میں، ہندوؤں کے ایڈیٹ قسم کے رہنماؤں نے ایک مہم چلا رکھی تھی اور بعین وہی خوف مسلمانوں میں بھی جگا رہے تھے جس کام پر مسلمان علما لگے ہوئے تھے۔ وہاں یہ کام پاکستان بنانے کے لئے اور یہاں ایک فرضی ،،رام راج،، کے حوالے سے ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ کسی بھی قدیم دور کے ملک کی تاریخ ہے۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ حملہ آوروں نے کسی ملک پر قبضہ کر کے وہاں اپنے نام کا سکہ چلا دیا تھا۔ اقوام عالم کی معلوم تاریخ اس پر گواہ ہے کہ قومیں دوسری قوموں پر حملے کرتی رہیں، ان کے علاقے تاراج کرتی رہیں اور وہاں اُن کے قبضے رہے۔ ہندوستان کے ہندو اس معاملے میں خوش نصیب نکلے کہ صدیوں بعد وہ ملک میں اپنی حکومت قائم کرنے جا رہے تھے جبکہ ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں کہ حملہ آوروں نے قوموں کا قبضہ تو لیا ہی، ان کی تہذیب، تمدن اور کلچر، ہر چیز کا صفایا کر دیا یا پھر اُس پر اپنا رنگ اتنا گہرا چڑھایا کہ قوموں کی شناخت ہی مٹ گئی۔ ہندوستانی اس معاملے میں بھی خوش نصیب ٹھہرے کہ کٹا پھٹا ملک

انگریزوں کے تدبر نے ایک ہی بند وبستی لڑی میں پروکر ان کے حوالے کر دیا اور جدید دنیا کی ترقی کے دروازے اگر پوری طرح اُن پر نہیں کھولے تو کم ازکم اُن کی بنیاد ضرور رکھ دی۔

مسلمانوں کے لئے یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ وہ تمام کے تمام ہندوستان کا بٹوارہ کر کے پاکستان بنانے چاہتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں تھا لیکن پاکستان کا نعرہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اپنی طرف زیادہ سے زیادہ یوں متوجہ کر رہا تھا کہ کانگریسی قیادت پے در پے ایسی حماقتیں کر رہی تھی جن سے مسلمان دشمنی کی بُو آتی صاف محسوس کی جا سکتی تھی، اس کی ایک بڑی مثال یہ تھی کہ مسلمانوں کو ذمہ دار عہدوں سے ہٹایا جا رہا تھا اور وہاں ہندوؤں کو تعینات کیا جا رہا تھا۔ پاکستان بنانے والے چونکہ پاکستان کو مسلمانوں کا ملک قرار دے رہے تھے تو ہندوستان میں صدیوں سے رہنے والے مسلمانوں نے اس کا نقشہ اپنے طور پر ہی عرب کے صحرائی معاشرے سے وابستہ کرلیا تھا اور شریعت کا تصور زندگی کے ہر شعبے میں نافذ ہونے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔

اس خواہش کو مہمیز اُس وقت ملی جب مسلم لیگ کے دوسرے درجے پر مشتمل علما کی قیادت نے پاکستان کے قیام کو شریعت سے مشروط کر کے عام مسلمانوں کی قیادت ہاتھ میں لے لی۔ اس قیادت نے اتنے تواتر سے پاکستان میں شرعی نظام کی بات کی کہ بنگال اور پنجاب کی اقلیتیں بدک گئیں اور اُنہوں نے پاکستان کے خلاف ردِعمل کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ یہ ردِعمل کا اظہار ہی تھا جو بعد میں بنگال اور پنجاب کے خونیں فسادات کا سبب بنا۔

میرے معمولات وہی تھے جو ایک بے روزگار جوان کے ہو سکتے ہیں۔ میں رات گئے تک کتابیں پڑھتا، دیر سے سو کر اُٹھتا اور ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا۔ ابا جی نے انتقاماً میرا خرچ بند کر رکھا تھا۔ وہ تو اچھا تھا کہ میں نے اپنی نوکری کے زمانے میں کچھ بچت کر لی تھی جس کی وجہ سے میرا بھرم دوستوں میں ابھی تک قائم تھا۔ میں بہت دنوں تک بے روزگار نہیں رہ سکتا تھا اور مجھے کچھ تو کرنا تھا۔ اُن دنوں میری کوشش ہوتی تھی کہ میں ابا جی کے سامنے کم سے کم جاؤں کیونکہ جیسے ہی میرا اور اُن کا آمنا سامنا ہوتا تھا، وہ چہرے پر زبردستی حقارت کے تاثرات پیدا کر کے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگتے تھے۔ اماں البتہ میری طرف دار تھیں اور فقط نرم لفظوں میں مجھے سمجھایا کرتی تھیں۔

''بیٹا وہ سکینہ نہیں، وہی جن کے گھر میں پیپل کا بڑا سا درخت ہے؟ اُس کا بیٹا دلی جا کے نجانے کس دفتر میں ملازم ہو گیا ہے۔ دو سو روپیہ گھر بھیجتا ہے مہینے کا حالانکہ اُس نے صرف دس جماعتیں پاس کی ہیں۔ اور یہی نہیں تیرے خالو صابر کا چھوٹا بیٹا بھی......''

میں جانتا تھا کہ اماں محض مجھے حوصلہ دینے کو یہ باتیں کیا کرتی تھیں ورنہ مجھے پتہ تھا کہ وہ دل سے نہیں چاہتی تھیں کہ میں پردیس جا کر نوکری کروں۔ میرے پیسوں کی گھر والوں کو کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ابا جی کا کام اچھا خاصا چل رہا تھا۔ اور کوئی بہن بھائی تھا نہیں، گھر ہمارا اپنا تھا اور جنگ کی وجہ سے کچھ مہنگائی ہونے کے باوجود ابھی لوگوں کی سفید پوشی کا بھرم بخوبی قائم تھا۔

میری آوارگی جاری تھی۔ ابا جی بدستور مجھ سے ناراض تھے اور اماں چھپ چھپا کر میری مالی مدد کر دیتی تھیں۔ میں جب تنہا ہوتا اور اپنی بے روزگاری کے بارے میں سوچتا مجھے خود پر غصہ آنے لگتا۔ میں چاہتا تو کیٹی کے پاس دلی جا سکتا تھا کیونکہ اُس نے کہا تھا کہ میں اُس کے فلیٹ کو اپنا سمجھوں اور کسی بھی قسم کی مدد درکار ہو، اُس سے رابطہ کروں لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا، کم ازکم میں اپنے منہ سے تو اُسے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے کہیں نوکری دلوا دے۔ اُنہی دنوں ابا جی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ وہ پیاز کا سیزن تھا اور ابا جی ایک دن بھی سبزی منڈی غیر حاضر رہنا اپنے کاروبار کے لئے سمِ قاتل گردانتے تھے تو اماں نے مجھے سبزی منڈی جانے اور ابا جی کا کاروبار کچھ دنوں کے لئے دیکھنے پر آمادہ کر لیا۔ میں نے اس کی حامی ظاہر ہے خوش دلی سے نہیں بھری ہوگی۔

ابا جی نے، جن کا اب بخار تو اُتر گیا تھا لیکن نقاہت حد سے بڑھی ہوئی تھی، مجھ سے عارضی صلح کا ڈول ڈال لیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے سامنے والی چارپائی پر بٹھا کر کہا۔

''اس بخار بھین یاوے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ آدمی کو حقہ پینے سے معذور کر دیتا ہے۔ دم لگاؤ تو لگتا ہے جیسے منہ میں بھینچو گیس بھر گئی ہو۔''

اماں جی نے گفتگو کسی اور طرف جاتی دیکھی تو بولیں۔

''صبح سے خیر سے تمہارا کام سنبھالے گا۔ اسے جو بتانا ہو، بتادو۔ یہ باتیں پھر کسی اور وقت کر لینا۔''

ابا جی مسکرائے اور بولے۔

''پتر جی ٹُو نے کچھ زیادہ نہیں کرنا۔ سارا کام دلدار سنبھال لے گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا ہے۔ یہ جو چھوٹے شہروں کے بیوپاری آتے ہیں، یہ ایک نمبر کے اپنی ماں کے خصم ہوتے ہیں۔ کسی کو بھی دو سو سے زیادہ اُدھار نہیں دینا۔ پچھلی،،رقومات،، کی وصولی کا حساب کتاب سب دلدار بتا دے گا۔ بولی میں خود ضرور جانا۔ خود بے شک حصہ نہ لینا کیونکہ ٹُو لے ہی نہیں سکتا۔ تیرے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ پر یہ ضرور دیکھ لینا کہ بولی کیسے اور کب لگتی ہے۔ مطلب یہ کہ پڑھے لکھے بندے کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔''

ایسا نہیں تھا کہ میں کبھی سبزی منڈی نہیں گیا تھا یا وہاں کے لوگوں کو نہیں جانتا تھا۔ دلدار ابا جی کے پاس کوئی بیس سال سے ملازم تھا اور سبزی منڈی کا اتنا پرانا آدمی کہ اُس کے قریب سے ابا جی کے مقابلے میں

پیاز لہسن کی دُگنی بُو آیا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا میری سبزی منڈی جانے پر آمادگی نے ابا جی کی بیماری آدھی کر دی تھی۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے میرا ماموں احمد دین جواریا ہمارے گھر آیا۔ وہ ابا جی کے لئے کچھ پھل لایا تھا اور جنہیں اُس نے خود ہی کھانا شروع بھی کر دیا تھا۔ وہ چونکہ ابھی تک میرے نوکری چھوڑنے والے واقعے کی روحانی تحقیق کر رہا تھا اور جس کے دوران اُس پر منکشف ہوا تھا کہ میری زندگی میں کم ازکم ایک اور خوفناک عورت کے آنے کا احتمال تھا تو اُس نے پانچویں کیلے کا چھلکا اُتارتے ہوئے کہا۔

''حلیہ بھی بتا دیتا ہوں۔ لمبے قد کی عورت ہوگی۔ بال بھی لمبے ہوں گے۔ دانت چمکدار، آنکھیں بڑی اور چال مورنی جیسی۔ بس تجھے اس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔''

اس کا جواب تو یہی بنتا تھا کہ اس حلیے کی عورت نے اگر کبھی ڈورے ڈالے تو میں تو میں، میرے ابا جی بھی اُن ڈوروں میں بندھے چلے جائیں گے۔ میں نے نیک چلنی کا وعدہ کیا تو اماں بولیں۔

''ویسے بھی میرا بچہ ایسا نہیں ہے۔''

اس پر ماموں ایک خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''یہ عورت ذات بڑی کپتی ہوتی ہے آپاں جی۔ یہ تو ولیوں پیروں تک پہ وار کر دیتی ہے۔ پر تم فکر نہ کرو۔ جاتے ٹیم مجھے اس کی کوئی پرانی قمیص دے دینا۔ پیر صاحب اُس پر عمل کر دیں گے۔ وہ اس کے کپڑوں کے ساتھ رکھ دینا۔ پھر ستے خیراں ہیں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ عورت ذات بڑی کپتی ہوتی ہے......''

وہ غالباً یوسف زلیخا کی داستان شروع کرنا چاہتا تھا اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا تو میں نے رخصت لی اور اپنے چھت پر اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ رات سرد تھی اور ستارے ایک دوسرے سے فاصلے پر دکھائی دے رہے تھے جس کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ آسمان پر یقیناً کہیں کہیں بادل ہوں گے۔ میں کلثوم کے گھر کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ اُس رات بہت دنوں بعد ایسا ہوا کہ مجھے کلثوم بے اختیار یاد آئی۔ چھت اور وہ دیوار ویسے ہی تھی۔ رات بھی ویسی ہی تھی اگر کچھ نہ تھا تو وہ کلثوم تھی۔ پھر میں سوچنے لگا اس وقت دلی کے کسی پرانے محلے کے گھر میں کلثوم کیا کر رہی ہوگی؟ شاید کسی اور بچے کو دودھ پلا رہی ہو۔ کسی کو سلانے کی کوشش کر رہی ہو یا پھر اپنے گنجے، موٹے اور لمبی قلموں والے میاں کے ہاتھ پاؤں دبا رہی ہو۔ میں جلدی ہی اُکتا گیا اور کمرے میں آ کر کچھ دیر ایک کتاب پڑھنے کے بعد سو گیا۔

سبزی منڈی میں جس حقیقت کا سامنا میں نے سب سے پہلے کیا وہ سیاہ کیچڑ تھی۔ بعد میں اس گندگی کے ماخذ کا علم بھی ہو گیا۔ یہ گندگی اس گندگی سے بے زار دکانداروں کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ ہر دکان دار

خود یا اُس کا ملازم سبزیوں کو تازہ رکھنے کے لئے وقفے وقفے سے اُس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا کرتا تھا اور چونکہ یہ عمل نجانے کب سے جاری تھا تو یہ پانی کیچڑ کی صورت جا بجا پوری سبزی منڈی میں اپنی موجودگی ثابت کیا کرتا تھا۔ دکانیں چھوٹی تھیں لیکن ہر دکاندار نے دکان کے سامنے آدھی سڑک تک ترپال باندھ کر اپنی دکان کو نصف راستے تک وسعت دے رکھی تھی چنانچہ اطراف سے سبزیاں لے کر آنے والی بیل گاڑیاں بمشکل بازار میں داخل ہوتی تھیں۔ اُن کے آگے لگے بیلوں کے گوبر اور پیشاب کی بُو اس گندگی پر مستزاد تھی۔

کاروبار کا طریقہ انتہائی سادہ تھا۔ بیل گاڑیاں کسی نہ کسی آڑھتی کی دکان پر آیا کرتی تھیں۔ وہ آڑھتی یوں اس گاڑی کا مالک ہوا کرتا تھا کہ سبزیاں وہ،،پیشگی،، خرید لیا کرتا تھا۔ یہ پیشگی والا کاروبار میرے ابا جی بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی وہ خود اور کبھی دلدار دیہات میں جا کر کسانوں کی فصل اُٹھنے اور کبھی تو لگنے سے پہلے ہی خرید لیا کرتے تھے اور یہ رقم کسانوں کو ادا کر دیتے تھے۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس سودے میں سراسر گھاٹا کسان کا ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی سبزی اُس بھاؤ پر نہیں بیچ سکتا تھا جو بھاؤ اُس کی سبزی بازار میں آنے کے وقت چل رہا ہوتا تھا۔ اُس دور کا کسان انتہائی مفلوک الحال ہونے کی وجہ یہی بیچ کے لوگ تھے، جن میں سے ایک میرے ابا جی بھی تھے۔

سبزی سے لدی گاڑی جیسے ہی ہماری دکان کے سامنے کھڑی ہوتی، اُسے بڑے بڑے بیوپاری گھیر لیتے، وہیں قیمت مقرر ہوتی اور اُسی وقت سبزی کی نیلامی شروع ہو جاتی۔ اس دوران اپنے دو روپے کا مال دس روپے میں بکتا دیکھنے والے کسان ایک طرف بیٹھے ناریل کے حقے پیتے رہتے یا اپنی پگڑیوں سے جوئیں بین کر اُنہیں مارتے رہتے۔ یہ سب کسان چودھری کہلاتے تھے لیکن ان میں چودھراہٹ بس اتنی ہی تھی کہ وہ شہری آڑھتیوں کے ہاتھوں لٹتے اور اس لوٹ مار پر احتجاج تو در کنار، اُنہیں اس کا احساس تک نہ تھا۔

میں نے کبھی شمار تو نہیں کیں لیکن سبزی منڈی میں بہت سی دکانیں تھیں۔ مالکان میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے۔ سبھی جی بھر کے جھوٹ بولتے، ایک دوسرے سے کاروباری رقابت رکھتے لیکن ایک معاملے میں اُن میں بے مثال ایکا تھا۔ وہ لمبی مدت تک چودھریوں کی رقمیں دبائے رکھتے اور جب کبھی دیتے مختلف بہانوں سے اُن میں کٹوتیاں کرتے۔ اچھی بھلی تازہ سبزی میں عیب نکالتے لیکن مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرے ابا جی ان چند لوگوں میں شامل تھے جو ایسا نہیں کرتے تھے۔ چونکہ وہ ایسا نہیں کرتے تھے اور نرم خوئی ان کا رویہ تھا تو بقول ہمارے ملازم دلدار کے، چودھری ان کے ساتھ،،حرامی پنا،، کرتے تھے۔ یہ کاروباری دنیا وہ تھی جہاں کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں تھا۔ کوئی سچ بولنے پر آمادہ نہیں تھا اور جس کو موقعہ ملتا تھا وہ دوسرے کی گردن کاٹ دیتا تھا۔

مجھے منڈی علی الصباح اُس وقت جانا پڑتا تھا جب کہ آدھے سے زیادہ شہر سویا ہوا ہوتا تھا۔ اگر میں سائیکل پر جاتا تو بیس منٹ کا رستہ تھا اور پیدل جانے میں کم و بیش پینتالیس منٹ لگتے تھے۔ مجھے پیدل چلنا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا تو میں اکثر پیدل ہی جایا کرتا تھا، ہاں کسی دن اماں کے جگانے کے باوجود اگر میں دیر تک سوتا رہتا تو سائیکل پر چلا جاتا تھا۔ پیدل جانا مجھے یوں بھی اچھا لگتا تھا کہ اُس زمانے میں ابھی برصغیر کے لوگوں نے آبادی میں اضافے کی طرف سنجیدگی سے دھیان نہیں دیا تھا اور بڑے شہر بھی انسانوں کی موجودگی کے باوجود خالی خالی دکھائی دیتے تھے۔ انسان کم تھے تو مسائل بھی کم تھے اور مسائل کم تھے تو زندگی آج کی نسبت خوشگوار تھی۔ مجھے ہندوستان میں شرح آبادی بڑھنے کی وجہ نہیں معلوم لیکن پاکستان میں مولویوں نے آبادی پر قابو پانے کی کوششوں کو سیدھا اسلام سے متصادم قرار دے کر ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔

دلدار ہمارا نوکر تو یقیناً تھا لیکن ابا جی نے تقریباً سارے کاروباری معاملات اُس کو سونپ رکھے تھے۔ دلدار کا ایک ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹا ہوا تھا جس سے ایک داستان وابستہ تھی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ یہ داستان مخاطب اور ماحول کے مطابق کیسے تبدیل ہوتی تھی لیکن بہرحال اس میں ایک شیر اور ایک میم کا کلیدی کردار ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ وہ شیر جس سے دلدار دو بدو ہوا تھا اور جسے اُس نے کیفرِ کردار تک پہنچانے کی کوشش کے دوران اپنا ہاتھ گنوایا تھا۔ وہ ایک مرتبہ شروع ہوتا تو پورا قصہ سنا کر دم لیتا۔ اُس نے میری موجودگی میں یہ قصہ تیسری مرتبہ سنایا تھا۔

''لو جی۔ اُٹھتی جوانی کی بات ہے۔ میں آسام میں ایک انگریز صاحب بہادر کے گھر نوکر تھا۔ یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ چھوٹا سا تھا تو یتیم ہو گیا تھا اور میرے چچا نے میرے باپ کی زمین پر قبضہ کر کے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ پھرتا پھراتا میں آسام پہنچ گیا اور انگریز صاحب بہادر کے گھر میں نوکر ہو گیا۔ اُس ٹیم پہ میری شکل ایسی نہیں تھی جیسی اس ٹیم پہ دکھائی دے رہی ہے اور میرا قد بھی کچھ لمبا ہی تھا۔ نہ نہ ہنسو مت۔ یہ تو زمانے کے رگڑے کھا کھا کر گھس گیا ہے تو چھوٹا لگتا ہے۔ لو جی صاحب بہادر نے شیر کے شکار کا پروگرام بنا لیا۔ خود اور میم صاب ہاتھی پہ، میں دوسرے نوکروں کے ساتھ پیدل۔ ہانکا کرنے والوں نے ہانکا کیا تو شیر گھبرا کے باہر نکلا۔ ہو گا کوئی نو ہاتھ لمبا اور چار ہاتھ اُونچا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سیدھا ہاتھی پر حملہ کر دیا۔ صاحب کہیں گرا، میم صاحب کہیں گری اور دموق کہیں گری۔ ہانکا کرنے والے سب بھاگ گئے، مگر اپنی جگہ اگر کوئی جما کھڑا رہا تو وہ کون تھا؟ میرے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا؟ ارے بولو نا۔''

وہ اس اعتماد سے یہ قصہ سناتا تھا کہ سننے والے سانس روک لیتے تھے۔

''لو جی میرے پاس نہ کوئی بھالا، نہ برچھا، نہ کوئی دموق، بس خالی ہاتھ۔ شیر بھی پدر سوختہ

عورتوں کا شوقین لگتا تھا۔ سیدھا میم صاحب کی طرف بڑھا۔ بس اُس کی اس حرکت پہ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ لگائی کسی کی بھی ہو، گھر کی عزت ہوتی ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر شیر کے منہ پر جو تھپڑ مارا تو اُس کا منہ دوسری طرف کو گھوم گیا۔ میم صاحب صاف بچ گئی اور بھاگ کے اپنے میاں کے قریب چلی گئی۔ وہ دونوں ترنت درخت پر چڑھ گئے۔ اب میدان میں ایک طرف آپ کا یہ خادم اور دوسری طرف شیر۔ شیر دہاڑا اور مجھ پہ لپکا۔ میں نے دوسرا تھپڑ مارا اور شیر نے میرا یہ بازو اپنے منہ میں لے کے کچر کچر چبانا شروع کر دیا۔ اُس وقت غصے کے مارے میرا بدن تھرا رہا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے شیر کی گردن پکڑ لی اور سالے کا ٹینٹوا دبانا شروع کر دیا۔ بڑا زور مارا سالے نے مگر بھیا دلدار کی پکڑ؟ اللہ توبہ۔ بے جان ہو کے قدموں میں گر گیا۔''

یہی قصہ جب اُس نے پہلی مرتبہ سنایا تھا تو شیر کو بھالے سے مارا تھا۔

میں ابا کے صحتیاب ہونے کا شدت سے منتظر تھا کیونکہ منڈی اور خاص طور پر ابا کی دکان میں جہاں صرف لہسن اور پیاز کی تجارت ہوتی تھی، وقت گزارنے سے مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ میری سانسوں میں ان دونوں سبزیوں کی بُو بس گئی تھی۔ اُنہی دنوں دلدار نے مجھے بتایا کہ پیاز اور لہسن کی بوائی کا وقت شروع ہونے والا تھا اور چونکہ میرے ابا جی نہیں تھے تو مجھے دہقانوں کو ،،پیشگی،، دینے جانا ہو گا اور اس سلسلے میں دیہاتوں کا سفر کرنا ہو گا۔ پیشگی کا تذکرہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ بوائی سے پہلے ہی آڑھتی کسان سے اُس کی فصل کا سودا کر لیتے تھے اور اس سلسلے میں فصل خریدنے کے لئے کچھ رقم پیشگی بھی دے دیا کرتے تھے۔ یہ رقم طے شدہ ہوتی تھی۔ کچھ تو آڑھتیوں کی اپنی چالاکیاں اور کچھ کسانوں کی سادگی اور مجبوریاں، کسان ہمیشہ گھاٹے میں رہتا تھا اور اُسے اتنا ہی ملتا تھا جو اُس کے تن و جان کا رشتہ یوں برقرار رکھتا کہ اگلی فصل بونے کو وہ زندہ رہ سکتا۔

اگلی صبح جب مجھے روانہ ہونا تھا، ابا نے مجھے سامنے بٹھا کر چند نصیحتیں کیں۔

''میں مدتوں سے دیہاتوں میں جاتا رہا ہوں۔ یہ کسان بھینچو اتنے سادے نہیں ہوتے، جتنے دکھائی دیتے ہیں۔ بڑے چالباز ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں میں آ کر اور ان کی مظلومیت کی کہانیاں سن کر چکر مت کھا جانا۔ دلدار تمہارے ساتھ ہو گا اور وہ خوب جانتا ہے کہ ان ''داوں'' سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔''

مجھے ان محنت کشوں اور انتہائی پسے ہوئے لوگوں کے لئے ابا کی یہ زبان ذرا بھی اچھی نہیں لگی اور میں نے اُسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں ان کسانوں سے سودا کرتے وقت اُنہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کروں گا۔

ہمیں تین گھنٹے کے سفر کے بعد ریل نے ایک ہرے بھرے اور انتہائی شاداب علاقے کے

چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر اُتارا۔

راولپنڈی اور کیمبلپور (اب اٹک) کے بیچ واقع اس اُفتادہ گاؤں کی آبادی پانچ چھے سو زیادہ نہیں تھی۔ ہندو کم تھے اور سکھ اور مسلمان زیادہ۔ ہم سٹیشن سے ایک پرانے تانگے میں، جس کا کوچوان ایک بوڑھا سکھ تھا، گاؤں پہنچے۔ گاؤں میں باقاعدہ گلیاں نہیں تھیں، البتہ کہیں کہیں چار چھے گھر قریب قریب ضرور بنے ہوئے تھے۔ اکثر گھر ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ تانگے کے پیچھے ننگ دھڑنگ یا انتہائی کم لباس میں، دھول سے اٹے بچوں کے ساتھ گاؤں کے کتے بھی بھاگ رہے تھے۔ ہم چودھری روپ کمار کے مہمان تھے۔ روپ کمار ادھیڑ عمر، زرد پگڑی اور اُسی رنگت کی پلپلی کھال والے چہرے کا مالک زمیندار تھا اور وہی پیشگیوں کے سودے بھی اپنی مرضی سے کروایا کرتا تھا۔ وہاں حسب مراتب کا خیال رکھا گیا اور مجھے دلدار سے علیحدہ ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ دلدار نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس گاؤں سے سب سے زیادہ سبزی ہم اپنے کاروبار کے لئے خریدا کرتے تھے۔ وہیں جا کر مجھے علم ہوا کہ کسانوں کی چمڑی اُتارنے والوں میں ہمیں نہیں تھے، کچھ اور لوگ بھی اس میں شریک تھے اور روپ کمار اُنہی میں سے ایک تھا۔

روپ کمار کو ساتھ لے کر دلدار مجھے گاؤں کی سیر کروانے لے گیا۔ یہ سیر تو شاید نہیں تھی، مجھے وہ کھیت دیکھنا اور اُن دہقانوں سے ملنا تھا جنہیں اگلے موسم میں ہمارے ہاتھ سبزیاں بیچنے کے واسطے ہم سے پیشگی وصول کرنا تھی۔ میں غربت دیکھ کر کانپ گیا۔

یہ ایک مسلمان کی زمین تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ فقط ایک ایسا کپڑا باندھے کیچڑ سے بھرے کھیت میں کھڑا تھا جس نے بمشکل اُس کے دھڑ کی ستر پوشی کر رکھی تھی۔ پتہ چلا کہ پچھلی بارش کا پانی ابھی سوکھ بھی نہ پایا تھا کہ مزید بارش ہو گئی تھی اور وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کھیت کا پانی نکال رہا تھا کہ بروقت پیاز کی بوائی کر سکے۔ اُس کی مدقوق بیوی جو چالیس کی بھی نہیں تھی، بوڑھی لگ رہی تھی۔ دو دبلے پتلے اور گہرے سانولے رنگ کے بچے برابر سے ماں باپ کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ لڑکوں سے ذرا دور ایک نوجوان لڑکی جھکی ہوئی پانی اور کیچڑ سے بھرے ڈول کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی کھیت کی منڈیر پر خالی کر رہی تھی۔ غربت کی گہری چھاپ کے باوجود لڑکی کے سانولے چہرے کے نقوش دل کش تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر اوروں کی طرح لڑکی نے ہمیں ایک نظر دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

کھیت کا مالک جس کا نام مجھے بعد میں سلطان معلوم ہوا اور جسے دلدار اور روپ کمار تانا کہہ کر پکار رہے تھے۔ کیچڑ سے بھرے ہاتھ پاؤں لئے ہمارے قریب آیا۔ میں نے اُسے قریب سے دیکھا تو میں کانپ گیا۔ میں اُس کی پسلیاں گن سکتا تھا۔ اُس کا کھیت میں نے نظروں سے ناپنے کی کوشش کی۔ وہ جگہ بہت

رہی ہو گی تو کوئی دس کنال ہو گی۔ وہی اُس کی کل کائنات تھی اور اُسی پر لگائی اور بیچی جانے والی سبزی پر وہ اپنے بچوں اور نجانے کس کس کو پال رہا تھا۔ تانے نے براہِ راست بات کی۔

''اس واری صرف پیاز لگاؤں گا۔ پانی ماں یاوے نے بڑا کام خراب کر دیا ہے۔ سب تمہارے سامنے ہے۔''

سب ہمارے سامنے تھا لیکن میں صرف پیاز لگانے والی بات نہ سمجھ سکا۔ روپ کمار نے بیزاری سے کہا۔

''اپنی مرضی کرے گا تو کھائے گا کیا؟ آڑھتی لوگ جو کہیں گے، وہ لگانا پڑے گا۔''

اُس نے اپنی بات مکمل کر کے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ میں قطعاً ان تیکنیکی باتوں کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ پیاز اور لہسن لگانے سے اس قسم کی زمین کا کیا تعلق تھا تو میں خاموش رہا۔ اب دلدار بولا۔

''پیشگی دینے آئے ہیں تجھے۔ نقد نانواں دیں گے۔ کوشش کر لہسن لگ جائے۔ ساری دنیا پیاز لگائے گی تو بھاؤ گر جائیں گے اور پھر لاگت بھی پوری نہیں ملے گی۔''

لاگت اور بھاؤ گرنے والی بات نے تانے کے چہرے پر اُداسی کی ایک اور لکیر کا اضافہ کر دیا۔ اُس نے گھوم کر کھیت کو دیکھا اور بولا۔

''وہ تو ہے پر مجبوری بھی کوئی چیز ہوتی ہے جی۔ ہوتی ہے کہ نہیں؟''

تانے نے گیند ہماری طرف لڑھکا دی تھی۔ روپ کمار نے دلدار کو دیکھا۔ دلدار نے مجھے دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ دلدار مسکرایا اور اُس نے جیب سے بہت سے نوٹ نکال کر تانے کو دکھائے اور بولا۔

''چودھری سبزی وہی لگے گی جو ہم چاہیں گے۔ مرضی ہے تو پکڑ پیشگی ورنہ اور بہت سے پکڑنے کو تیار بیٹھے ہیں۔''

تانے نے پھر کھیت کو دیکھا، نوٹ دیکھے اور پھر کھیت کو دیکھا۔ وہ خاصی کشمکش کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ پھر اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔

''لہسن میں بڑی محنت ہے۔ میری بیوی بیمار ہے۔ پھیپھڑوں کی بیماری لگ گئی ہے اسے۔ وہ ساتھ کام نہ کرے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بچوں کو ابھی کچھ پتہ نہیں۔ بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اس واری پیاز لے لو۔ اگلی واری لہسن کا وعدہ پکا۔''

لیکن دلدار جانتا تھا کہ ہمیں کیا خریدنا تھا تو اُس نے نوٹ واپس جیب میں رکھے اور بولا۔

''تیری مرضی۔ جو پیاز لیتا ہے، اُسے دے دے۔ چل بھئی روپ۔ ادھر سودا نہیں ہو سکتا اس واری۔''

گفتگو طول پکڑ چکی تھی تو تانے کی بیوی، دونوں لڑکے اور اُس کی لڑکی بھی قریب آ گئے۔ وہ ہمیں متجسس نگاہوں سے دیکھنے اور باتیں سننے لگے۔ میں نے اُس کی لڑکی کو پہلی مرتبہ قریب سے دیکھا۔ وہ بیس سے کم رہی ہوگی۔ اُس کا رنگ اپنے بھائیوں سے کم سانولا تھا اور بڑی آنکھیں خوفناک غربت کے باوجود روشن روشن تھیں۔ تانے نے جلدی سے کہا۔

''دیکھو جی۔ بات یوں ہے کہ تمہارے کہنے پہ لہسن لگا لیتا ہوں پر مجھے پتہ ہے کیا ہوگا۔ نقصان ہو گیا تو کون پورا کرے گا؟''

وہاں نقصان صرف کسان اور فائدہ صرف آڑھتی کو ملنے کا دستور تھا تو دلدار نے کہا۔

''بات کی لمبی مت بنا۔ ہم پیشگی دے رہے ہیں۔ چل میں تجھے ساری پیشگی دے دیتا ہوں اور بول؟ پر لگے گا تھوم ہی۔''

مجھے اس گفتگو سے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ ہم کسان نہیں تھے۔ ہم زمین اور موسم سے واقف نہیں تھے۔ ہم صرف بیچنے والے تھے۔ لہسن ہو یا پیاز اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ لیکن اُس وقت میں یہ سب باتیں نہیں سمجھتا تھا۔ روپ کمار ان دیہات کا کیڑا تھا۔ وہ موسم سے بھی خوب واقف تھا۔ علاقے میں ہر کوئی اس مرتبہ پیاز لگا رہا تھا۔ وہ اور دلدار جانتے تھے کہ منڈی میں پیاز کے ڈھیر لگ جائیں گے اور بھاؤ گر جائے گا اور وہ منافع نہیں ہو پائے گا جس کی اُنہیں توقع تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ پیشگی دینے والے اور آڑھتیوں نے بھی یہ سوانگ رچا رکھا تھا جو ہم اس وقت رچا رہے تھے۔ اگر لہسن کی فصل خراب بھی ہو جاتی تو نقصان کسان کا ہی ہونا تھا کیونکہ پیشگی اتنی کم دی جاتی تھی کہ بچی کھچی فصل میں سے بھی آڑھتی اپنا منافع کما ہی لیتا۔ اس بات کو تانا بھی خوب سمجھ رہا تھا۔ مگر وہ مجبور تھا کیونکہ بیوی کا علاج تھا، بچوں کا لباس اور خوراک تھی اور جوان بیٹی کی شادی کے لئے دو پیسے کی بچت بھی کرنا تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا۔ میں مٹی کے مادھو کی طرح کھڑا تھا۔ میری سمجھ میں اور کچھ آ رہا تھا یا نہیں آ رہا تھا لیکن یہ غربت ضرور آ رہی تھی اور اس غربت کے تناظر میں تانے کی مجبوریاں بھی۔ تانے نے منہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن اُس کا سارا وجود سراپا التجا بنا ہمیں دیکھ رہا تھا۔

میرے ابا کی آڑھت کی فقط ایک دکان تھی۔ وہ چھوٹے پیمانے پر کاروبار کرتے تھے تو ان کے کارندے ایک چھوٹا ظلم کر رہے تھے۔ میں نے ہندوستان کی خوفناک غربت کے پس منظر میں بڑے کاروباری لوگوں کو سوچا تو میری سمجھ میں آ گیا کہ اس غربت کی وجہ کیا تھی۔ مجھے اُس غریب کسان پر ترس آ گیا۔ ساری صورت حال تین بچوں، ایک مدقوق بیوی اور ایک پھٹے حال کسان کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جو چاہتے ہو لگا لو۔ بس ہمیں مال ستھرا چاہئے۔ دلدار، اسے پیشگی دے دو۔ اور ہاں پہلے اس پوری زمین کی پیداوار کی قیمت طے کر لو۔''

یہ بات غالباً وہاں کسی آڑھتی نے کسی کسان سے کبھی نہیں کہی تھی۔ میں نے روپ کمار، دلدار اور تانے کے چہروں پر حیرت کی شدت دیکھی۔ دلدار نے قدرے تلخی سے کہا۔

''آپ کو ان باتوں کو نہیں سمجھتے جی۔ وہ قیمت طے کرنے والا کون ہوتا ہے؟ قیمت آڑھتی طے کرتا ہے اور یہ اُصول بڑا پرانا چلا آ رہا ہے۔''

میں کسی ایسے پرانے اُصول کو نہیں مان سکتا تھا اور اُس صورت میں تو ہرگز نہیں جبکہ کسان کا کنبہ میرے سامنے جن حالوں میں کھڑا تھا۔ میں نے قدرے سختی سے کہا۔

''ویسا ہی کرو جیسا میں نے کہا ہے۔''

روپ کمار ہنسا اور اُس نے ایک طرف منہ کر کے پان کی پیک تھوکی اور بولا۔

''اگر چھوکری کی بات ہے تو ایک سے ایک کا انتظام ہو سکتا ہے۔''

یہ بات میری سمجھ میں قدرے دیر سے آئی۔ میرا جی تو یہ چاہا کہ اس پیلے منہ والے دلال کا منہ اسی کھیت کی کیچڑ میں رگڑ کر اس کا رنگ تبدیل کر دوں جس کے کنارے ہم کھڑے تھے لیکن میں مصلحتاً بات کو پی گیا۔ تانے اور اُس کے خاندان کے چہروں پر بے یقینی کی خوشی تھی۔ دلدار نے مجھے ایک بار پھر دیکھا اور بولا۔

''آپ کو پتہ ہے کہ اس کھیت سے کتنی فصل نکلے گی؟ اُس نیم پہ کیا بھاؤ ہوگا اور کتنا مال ہم نکال سکیں گے؟ آپ کو کچھ بھی پتہ نہیں۔''

واقعی مجھے ان تکنیکی باتوں کا کوئی علم نہیں تھا لیکن نجانے میرا دل کہتا تھا کہ یہ کسان اپنی فصل کی قیمت غلط نہیں بتائے گا۔ فصل اُٹھانے کے بعد وہ ہماری ذمہ داری تھی اور نفع نقصان ہمارا تھا۔ اس وقت تک جو نظام چل رہا تھا، اُس میں آڑھتی کو کسی قسم کے نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے تانے کو غور سے دیکھ کر کہا۔

''چودھری۔ کتنی زمین ہے تمہاری جس پہ تم پیاز لگانا چاہتے ہو؟''

تانے نے گھوم کر زمین دیکھی، پھر مجھے دیکھا اور بولا۔

''ساری پہ لگاؤں گا جی۔ ایک کھیت اور بھی ہے پر اُس پہ باجرہ اور مکا لگاتا ہوں۔ سال بھر کے دانے بھی ضرورت ہوتے ہیں۔ ہم چھے جی ہیں۔ میری ماں بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔''

میں نے کہا۔

''اس ساری زمین کی فصل برداشت ہوگی تو کتنے میں بیچو گے؟''

تانے سے زندگی بھر کسی نے یوں فصل کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ شدید کش مکش کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ پیچھے آنکھیں ہماری، آٹھ اُس کے بیوی بچوں کی اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ تانے نے ایک بار اپنی زمین کو پھر دیکھا، مجھے دیکھا اور اپنے خاندان کو دیکھ کر گردن موڑی، پھر جھجک کر بولا۔

''تین ہزار لوں گا۔''

مجھے یہ رقم مناسب لگی لیکن میرے پہلو سے ایک بے اختیار قہقہہ اُٹھا تو میں نے گھوم کر دیکھا۔ یہ قہقہہ روپ کمار کا تھا۔ دلدار بھی ہنس رہا تھا لیکن بے آواز۔ میں نے تانے اور اُس کے خاندان کے چہروں پر غصے کے بجائے ایسی شرمندگی دیکھی جو کسی کو کوئی غلط کام کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر ہوتی ہوگی۔ مجھے روپ کمار کا ہنسنا ذرا بھی اچھا نہیں لگا لیکن میرے کچھ بولنے سے پہلے وہ بولا۔ بات کرتے وقت اُس کی آواز میں مزاح کا نہیں تلخی کا رنگ تھا۔ ایسی تلخی جو غرور میں ڈوبی ہوئی بھی تھی۔

''ابے تین ہزار روپے کبھی اکٹھے دیکھے ہیں زندگی میں؟ اتنے ہوتے ہیں اتنے۔''

اُس نے اپنی ہانپیں پھیلا کر کہا۔ تانا شاید مجھے اپنا ہمنوا پا کر خود میں جواب دینے کا حوصلہ پیدا کر چکا تھا تو اُس نے تلخی سے کہا۔

''جتنے بھی ہوتے ہوں، میں اپنی فصل اتنے میں ہی بیچوں گا۔''

دلدار نے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔

''بہت پیسے مانگ رہا ہے جی۔ دفع کریں اسے۔ اور بیچنے والے تھوڑے ہیں اس گاؤں میں۔''

وہ چلا لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ میں اُلجھن میں تھا۔ کیا واقعی تانا زیادہ پیسے مانگ رہا تھا اور میری نرمی سے فائدہ اُٹھا رہا تھا یا میرے ساتھیوں کا خبث باطن مجھے ایسا سوچنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ میں نے سوچا اگر میں ذرا سی بحث کر لوں تو شاید صورت حال مزید واضح ہو سکے۔ میں نے کہا۔

''تین ہزار بہت زیادہ نہیں کہے تم نے؟''

''وہ جی بات یہ ہے کہ دو سو روپے مہینے میں ہم گزارہ کریں گے۔ سو روپیہ فالتو بچے گا جو ادھر اُدھر کے خرچوں میں چلا جائے گا۔ میں نے بڑے حساب سے آپ سے بھاؤ طے کیا ہے۔''

یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا کہ وہ محض دو سو روپے مہینے پر گزران کرے گا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔''

پھر میں دلدار سے کہا۔

''اسے پانچ سو پیشگی دے دو اور لکھا پڑھی کر لو۔''

روپ کمار نے پہلے سے لکھی تحریر پر تانے کا انگوٹھا لگوایا اور میں نے پانچسو کی وصول شدہ رقم کا اندراج اپنے ہاتھ سے کیا۔

اُس دن ہم دو اور کسانوں کے پاس بھی گئے لیکن دونوں ہی نہ ملے۔ شام گہری ہونے لگی تو ہم واپس آ گئے۔ روپ کمار نے عمدہ کھانا پکوایا تھا۔ مجھے اُونچے نیچے راستوں پر چلنے کی عادت نہیں تھی تو میں بہت ہی تھک گیا تھا۔ جس کمرے میں میرا قیام تھا، اُس کے گرد کوئی چار دیواری نہیں تھی۔ کھیتوں سے سیدھا راستہ کمرے کے اندر آتا تھا، اسی لئے روپ کمار نے مجھے خصوصی ہدایات دی تھیں کہ میں دروازہ بند کرنا نہ بھولوں کیونکہ جنگلی بلے اس موسم میں آوارہ گھومتے تھے اور سوئے ہوئے انسانوں پر حملوں کے سلسلے میں بھی بدنام تھے۔

روپ کمار تو یہ بھی چاہتا تھا کہ میں اُس کی اور دلدار کی شراب نوشی کی محفل میں شرکت کرتا لیکن چونکہ میں شراب نہیں پیتا تھا تو میں نے انکار کر دیا۔ کھانے کے بعد جب دلدار اور روپ کمار یہ دیکھنے کے لئے کہ میں وہاں آرام سے تھا، آئے تو میں نے دلدار سے پوچھا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ ہم نے تانے سے مہنگی فصل خریدی ہے؟''

اس پر دلدار ہنسا اور بولا۔

''مالکوں کی مرضی ہے، پر سودا ٹھیک ہوا ہے۔ ہم یہ فصل بارہ میں آرام سے بیچ دیں گے۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ دلدار ہنسا اور بولا۔

''آپ کی وجہ سے پورے ایک ہزار کا نقصان ہو گیا۔ میں دو ہزار سے ایک پیسہ زیادہ نہ لگاتا، پر چلو جی کہیں اور کسر نکال لیں گے۔''

میں نے سوچا اگر دلدار کے ساتھ میرے ابا جی ہوتے تو کیا وہ بھی ایسا ہی کرتے؟ لگتا تو نہیں تھا کیونکہ زبان کے الاکھ برے سہی ہگر وہ دل کے اچھے آدمی تھے اور اس کسان کی یہ حالت دیکھ کر یقیناً ایسا نہ کرتے۔

میں کچھ دیر اپنے ساتھ لائی ہوئی کتاب پڑھتا رہا اور پھر میری آنکھوں میں نیند گہری ہو کر جھپی تو مجھے دروازہ بند کرنے کا خیال آیا، میں اُٹھا، دروازہ بند کیا اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ چک الالہ والے گھر کے بعد یہ پہلی جگہ تھی جہاں شہروں والی ہوا ہی نہیں تھی لیکن دیہات میں دن میں انسان اور رات میں جانور جاگتے ہیں۔ مجھے کبھی کسی گیدڑ کی منحوس آواز سنائی دیتی، پھر کتے بھونکتے اور کبھی دُور سے کوئی بھیڑیا۔ میں نے دروازے کے قریب بلی کی غراہٹ بھی سنی تو خیال آیا کہ شاید یہ اُنہی جنگلی بلوں میں سے کسی کی آواز

ہوگی جس کا تذکرہ روپ کمار نے کیا تھا۔ پھر میں سو گیا۔

مجھے سوتے ہوئے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میری آنکھ کسی آواز سے کھلی۔ میں پہلے تو سمجھا ہی نہیں کہ یہ کس قسم کی آواز تھی۔ میں بستر سے نکلا اور نہ ہی اُٹھ کر بیٹھا بس چپ چاپ پڑا آواز دوبارہ آنے کا منتظر رہا۔ کسی نے دروازہ نرمی سے کھٹکھٹایا تھا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زمانہ چوروں ڈاکوؤں والا نہیں تھا اور نہ ہی کوئی جنگلی بلا دروازہ کھٹکھٹا سکتا تھا تو میں بستر سے باہر نکلا، لالٹین کی بتی اُونچی کی اور دروازے کے قریب جا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

باہر کچھ دیر خاموشی رہی پھر کسی عورت نے جواب دیا۔

''میں ہوں جی۔ دروازہ کھولو۔''

میں نے گاؤں دیہات کے بارے میں کہانیاں سن رکھی تھیں جن میں بتایا جاتا تھا کہ ایسی راتوں کو چڑیلیں اور چھلی پیری کیا کرتی ہیں اور دروازہ کھولتے ہی آدمی پر حملہ آور ہو کر اُس کا کلیجہ چبا ڈالتی ہیں لیکن میں اس خرافات پر یقین نہیں رکھتا تھا تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ میں ابھی اُسے اچھی طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ وہ لپک کر کمرے میں آ گئی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر دیکھا۔ وہ تانے کی بیٹی تھی۔

بلاشبہ وہی تھی اور میں اُسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے اس وقت کپڑے البتہ دوسرے پہن رکھے تھے لیکن سر کی اوڑھنی وہی دوپہر والی تھی۔ میں نے حیرت سے کہا۔

''تم! تم چودھری سلطان کی بیٹی ہو؟ تانے کی بیٹی؟''

ایک پھیکی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر اُبھری اور اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ میں نے اگلا سوال پوچھا۔

''تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟''

شاید وہ اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی اسی لئے اُس نے جواب دینے میں وقت لیا۔

''وہ جی۔ میں جی۔ وہ جی ابے نے کہا تھا کہ بابو جی اچھے لوگ ہیں تو میں....''

میں اب بھی نہ سمجھا۔

''دیکھو لڑکی۔ میں تمہاری بات بالکل بھی نہیں سمجھ رہا ہوں۔''

شاید اُسے اتنے سوالوں کی توقع نہیں تھی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی بھی تھی تو بولی۔

''وہ جی۔ باؤ جی۔ آپ نے بڑی مہربانی کی ہے نا جو ہماری فصل تین ہزار میں خرید لی ہے تو ابے

نے کہا.....''

اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ مجھے یہ سوچ کر شدید غصہ آیا کہ تانا مجھے اس قبیل کا آدمی سمجھتا تھا۔ میں نے تلخی سے کہا۔

''تمہارے باپ نے اُس مہربانی کے بدلے میں تمہیں یہاں بھجوایا ہے۔''

لڑکی میرے لہجے سے ڈر گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''ہاں جی۔ پر میری اس میں کوئی غلطی نہیں ہے جی۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

میں نے گھور کر اُسے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا ہوتا ہے یہاں؟''

لڑکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ خوف اُس کے چہرے سے عیاں تھا اور وہ جو صورت حال سوچ کر یہاں آئی تھی، یہ صورت حال اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ ڈر ڈر کر بولی۔

''بس جی۔ بڑے لوگوں کو خوش کرتے ہیں ہم اور کیا؟''

میرا غصہ اُس کی بے بسی دیکھ کر مانو ایک دم ہی غائب ہو گیا۔ میں نے نرمی سے پوچھا۔

''کونسے بڑے آدمی؟''

وہ جھجک کر بولی اور اُس نے میرے چہرے کو نہیں، زمین کو دیکھا۔

''جیسے پٹواری، بڑا خان اور تھانے دار۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے کہا۔

''اُن کا تم سے کیا تعلق ہے؟''

پہلی بار اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بولی۔

''تعلق کیوں نہیں ہے جی؟ جب چاہیں ابے کو چوری کے الزام میں پکڑوا دیں۔ جوئے کا پرچہ کر دیں اُس پہ۔ پر وہ زبردستی والی بات ہوتی ہے۔ آپ نے تو بڑی مہربانی کی ہے ہمارے ساتھ۔''

اُس نے اوڑھنی اُتار کر بستر پر ڈال دی۔ میں نے قدرے تلخی سے کہا۔

''اوڑھنی اپنے جسم پر ڈالو۔ بہت سردی ہے۔''

اُس نے فوراً ہی میری ہدایت یا حکم پر عمل کیا اور اس مرتبہ اپنے بدن کو اچھی طرح لپیٹا۔ خاموشی کے طویل وقفے میں وہ تو یہ نہیں کیا سوچ رہی تھی لیکن میں اس نظام کو سوچ رہا تھا جس میں ایک کسان کی بیٹی کی یہ قیمت تھی۔ مجھے اُس سے ہمدردی ہونے لگی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ خاموشی سے میرے بستر کی

پائینتی بیٹھ گئی۔ میں نے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔

''لیکن تمہارا باپ اگر بے قصور ہے تو اُسے کوئی کیوں پکڑنے لگا؟''

اُس نے طویل سانس لی۔

''وہ بات نہیں ہے جی۔ میرا چاچا چور ہے نا۔ آج کل جیل میں ہے۔ علاقے میں کوئی چوری ہو تو ابے کو پکڑ کے لے جاتے ہیں اور پھر.....''

اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''اور پھر؟''

وہ زمین کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور پھر مجھے جانا پڑتا ہے جی۔''

میں کانپ گیا۔ وہ بمشکل اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اُس کے چہرے پر ابھی تک اس عمر کی بچیوں والا الہڑ پن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''تم کتنی مرتبہ.... میرا مطلب ہے کہ.... اس طرح جا چکی ہو۔''

وہ سوچ کر بولی۔

''تین دفعہ جی۔ دو دفعہ تھانیدار کے پاس اور ایک دفعہ بڑے خان کے پاس۔''

میں پوچھا۔

''یہ بڑا خان کون ہے؟''

اُس نے ایک مرتبہ مجھے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

''دلاور ہے جی۔ وہ یہاں کا سب سے بڑا زمیندار ہے۔ کتنی ہی مربعے ہیں اُس کے۔''

''اور وہ تھانیدار؟''

اُس نے اس بار کچھ بھی نہیں سوچا۔

''پہلے دوسرا تھا۔ اب دوسرا ہے۔''

نجانے میرے ذہن کی تہہ میں کیا تھا تو میں نے اگلا سوال پوچھا۔

''کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟''

اُس نے اس مرتبہ بھی کچھ نہیں سوچا اور بولی۔

''یہ والا سکھ ہے جی۔ پہلے والا مسلمان تھا۔''

میں غصے سے گھول اُٹھا۔ ایک بے بس کسان کی جوان بیٹی کی اہمیت ہندو یا مسلمان سے مشروط نہیں تھی۔ میں نے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

اُس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

''حمیداں۔ ویسے سب مجھے پیار سے میداں میداں کہتے ہیں۔''

بیٹی کو پیار سے میداں کہنے والوں نے یقیناً کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ اُنہیں یہ بیٹی اپنے گھر کے کاموں کے لئے یوں بھی استعمال کرنی ہوگی۔ میداں نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

''میں جاؤں جی۔ ویسے آپ نے ہماری بڑی مدد کی ہے تو میں یہاں آ گئی تھی۔''

دوسرے لفظوں میں وہ غالباً یہ کہنا چاہتی تھی کہ اس اغرویہ کے باوجود جو میں نے ابھی کیا تھا، وہ اُس مقصد کے لئے اب بھی حاضر تھی جس کے لئے وہ یہاں آئی تھی۔ میں نے اُس سے ایک اور ہی بات پوچھی۔

''گاؤں میں تم اکیلی لڑکی تو نہیں ہو۔ یہاں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ سبھی کے کچھ نہ کچھ مسئلے ہوتے ہوں گے۔ کیا سبھی مسلوں کا یہی حل ہوتا ہے؟''

میداں پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ہاں جی۔ ایسا ہی ہوتا ہے یہاں۔ کسی کی بیوی، کسی کی بیٹی اور کسی کی بہو۔''

میں نے کہا۔

''ہندو مسلمان سکھ، سبھی؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں جی۔ غریب تو غریب ہوتا ہے نا۔ اُس کا ہندو مسلمان سکھ سے کیا واسطہ؟''

وہ سچ کہہ رہی تھی، غریب واقعی غریب ہوتا ہے۔ اب اُس سے مزید کچھ پوچھنا ایک ذہنی تلذذ کے سوا اور کچھ نہیں تھا تو میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔''

لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی اور قدرے مسکرا کر بولی۔

''وہ دیکھیں نا جی۔ اُدھر دو دفعہ جب میں گئی تھی تو وہ زبردستی والی بات تھی۔ اِدھر تو میں خوشی سے آئی ہوں۔ آپ بڑے اچھے لوگ ہیں جی۔ وہ تو ظالم لوگ تھے۔ بڑے ظالم لوگ تھے جی۔''

یقیناً وہ ظالم لوگ ہوں گے لیکن میں نہیں تھا۔ میں نے اگر اُس کے باپ کے ساتھ کوئی مہربانی

کی تھی تو وہ محض انسانیت کے ناطے کی تھی اور تب یا اب میرا اس مہربانی کی قیمت وصول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے نرمی سے بات کی۔

''تم اچھی لڑکی ہو بیداں اور میں تم لوگوں کی مجبوریاں بھی سمجھتا ہوں۔ میں نے کسی الائچی میں تم لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ تم اپنے گھر جاؤ اور سو جاؤ۔''

میں نے جذبات میں ڈوبی ایک لمبی تقریر بھی کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہم جس سسٹم میں رہ رہے تھے وہ گلا سڑا تھا اور اس کا دوسرا نام غریبوں کو دبانا اور زرداروں کو اُبھارنا تھا وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی کہ پاکستان بننے والا تھا اور اس کے بعد اس قسم کی زیادتیوں کا ازالہ ہونا فطری امر تھا۔ وہ منہ کھولے میری باتیں سنتی رہی۔ میں نے جب اُسے اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکالا اور کنڈی لگا کر اپنے بستر پر لیٹا تو دُور کہیں سے فجر کی اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔

اگلے تین دنوں میں ہم نے پانچ مزید دہقانوں سے فصل خریدی اور ہر جگہ میرا دلدار اور روپ کمار کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا۔ ہم ایک ایسے پرانے تانگے پر دیہاتوں میں گھوم پھر رہے تھے جس کے تانگے بان سے ہم نے پندرہ روپیہ روز کے حساب سے کرایہ طے کر رکھا تھا۔ تانگہ پرانا تھا لیکن گھوڑا جوان اور جاندار تھا۔ یہ تانگے بان مسلمان تھا جو کسی بھی گاؤں پہنچتے ہی گھوڑا تانگے سے جدا کرتا، کسی سے چارپائی مانگ کر اُس پر دراز ہوتا اور چانڈو پینے لگتا۔ اپنے اس دورے کے آخری دَور میں ہم چوروں والے پنڈ پہنچے۔ مجھے تو یہ نام ہی بڑا عجیب لگا تو روپ کمار نے بتایا کہ کسی زمانے میں اس گاؤں کے لوگ انتہائی شورہ پشت تھے اور اس گاؤں سے گزرنے والے قافلوں کا سامان چرا لیا کرتے تھے اور اکا دکا مسافروں کو مار بھی ڈالتے تھے۔ پھر انگریزوں نے گاؤں کے بہت سے لوگوں کو درختوں سے لٹکا کر سرِ عام پھانسیاں دیں اور یوں اس لعنت کا قلع قمع ہوا لیکن گاؤں کا نام چوروں والا پنڈ برقرار رہا۔

چوروں والے پنڈ میں مجھے زندگی کی دوسری محبت ہوئی۔ میری یہ محبوبہ مسلمان نہیں، سکھ تھی اور اس کا نام کلونت کور تھا۔

ہم کلونت کور کے باپ بلبیر سنگھ کے پاس بھی اُس کی سبزی کی فصل پیشگی خریدنے پہنچے تھے۔ بلبیر سنگھ، تانے کی طرح مدقوق یا خوشحالی ثابت نہیں ہوا۔ اُس کی زمین بھی زیادہ تھی اور لہلہے میں ایک رعونت بھی۔ میں نے دیکھا روپ کمار بھی اُس سے ذرا دب کر بات کر رہا تھا۔ دلدار کی اُس سے پہلی ملاقات تھی۔ اُس نے ہمیں اپنے کھیتوں کے قریب، جہاں ٹماٹر کی فصل لگانے کی تیاری ہو رہی تھی، ایک رنگین پائیوں والی چارپائی پر بٹھایا اور چند ہی لمحوں میں لسی کے بڑے بڑے گلاسوں سے ہماری تواضع کرنے

لگا۔ بلبیر سنگھ گالی پہلے دیتا تھا اور بات بعد میں کرتا تھا۔ وہ بولا۔

''مجھے سی بھین..... پیشگی کی جرورت نہیں۔ واہ گرو کی بڑی کرپا ہے۔ نقد بیچتا ہوں اور پیسے اُسی ٹیم وصول کر لیتا ہوں۔ ٹھیک ہے تم سے وعدہ کر لیتا ہوں کہ فصل تمہیں ہی دوں گا اور مہینہ بھی بتا دیتا ہوں۔ اگر تم نے اُس ٹیم تک فصل نہ اُٹھائی تو جو بھین.... پہلے آئے گا، اُسی کو دے دوں گا۔''

یہ بیان غالباً روپ کمار اور دلدار کی پیشگی دے کر کسانوں کو پھنسا لینے والی ترکیب سے لگا نہیں کھاتا تھا تو روپ کمار نے اپنی پگڑی کے پلو سے لسی میں پڑا ہوا مکھن اپنے ہونٹوں سے پونچھ کر کہا۔

''وہ بات ٹھیک ہے۔ پر یہ تو سوچ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ فصل خراب بھی ہو سکتی ہے۔ نقصان اُن کا ہوگا جو اسے خریدیں گے۔ تجھے تیری رقم مل جائے گی۔''

بلبیر سنگھ یہ سن کر مسکرایا اور روپ کمار کے شانے پہ اپنا بھاری ہاتھ مار کر بولا۔

''مجھ سے بنیوں جیسی باتیں مت کر۔ جو ہوگا میرا معتقد ہوگا۔ اتنا تو تجھے پتہ ہی ہوگا کہ سارے علاقے میں کوئی ماں..... میرے جیسی ٹماٹر کی فصل نہیں اُٹھاتا۔ بڑا نقصان کر لیا میں نے ان بھین..... آڑھتیوں کے چکر میں۔ نقد سودا کرنا ہے تو ابھی زبان دیتا ہوں۔''

نقد سودا دلدار اور روپ کمار کے حق میں یوں نہ تھا کہ پیشگی دے کر سودا کی گئی فصل میں چار سے پانچ گنا فائدہ ہوتا تھا۔ نقد میں وہی بھاؤ دینا پڑتا جو اُس وقت چل رہا ہوتا۔ روپ کمار ہر قیمت پر بلبیر سے سودا کرنا چاہتا تھا کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ بلبیر کی ٹماٹروں کی فصل کی دھوم تھی۔ دلدار نے کہا۔

''دیکھو سردار جی۔ یہ دستور ہے کہ آڑھتی پیشگی دے کر فصل خرید لیتے ہیں۔ ہم اتنی دور سے کوئی نیا کام کرنے تو نہیں آئے۔ ہم اگر اوروں کو روپیہ دیتے ہیں تو تمہیں دو دیں گے۔''

پھر دلدار نے بلبیر کی زمین نظروں میں ناپی اور بولا۔

''ساری پہ ٹماٹر لگاؤ گے؟''

بلبیر نے اپنی دھوتی کے پلو سے اپنی ناک پونچھی اور ہنس کر بولا۔

''ہاں۔ اس کے علاوہ بھی زمین ہے۔ یوں سمجھ لوں کہ کوئی چالیس کنال پہ ٹماٹر ہی لگیں گے اس واری۔''

یہ بہت بڑی فصل تھی۔ دلدار نے سوچا اور بولا۔

''آدھی لیتا ہوں اسی ٹیم اور پیشگی دگنی دیتا ہوں۔''

بلبیر نے کھنکھار کر ایک طرف تھوکا اور بولا۔

''بڑی مہربانی۔ آپاں نقد ہی بیچوں گا۔''

اُسی وقت کلونت کور ایک درخت کے پیچھے سے نکلی۔ وہ سیاہ لاچے اور سرخ قمیص میں ملبوس تھی اور شاید تیز چل کر آئی تھی تو اُس کی سفید پیشانی پر پسینہ چھوتا ہوا تھا۔ اُس کا قد لمبا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اُس نے مہمانوں کی پروا کئے بغیر بلبیر سے ایک شکایت کی۔

''باپو۔ کیا کہہ دیا ہے تو نے ماں سے؟ کہتی ہے اس واری کوئی میلے پہ نہیں جائے گا۔ میں پوچھتی ہوں کیوں نہیں جائے گا کوئی؟''

اپنی بات کہہ کر اُسے اچانک احساس ہوا کہ اُسے مہمانوں کے سامنے یہ بات نہیں کہنا چاہئے تھی۔ وہ قدرے شرمائی اور ہنس کر بولی۔

''ٹھیک ہے۔ مہمان چلے جائیں تو میں پھر آتی ہوں۔''

بلبیر ہنسا اور ہم سے بولا۔

''یہ بڑی والی ہے۔ مطلب اس سے چھوٹا لڑکا ہے میرا۔ بڑی ہے تو لاڈلی ہے اور لاڈلی ہے تو بد تمیز ہے۔''

لیکن یہ باتیں مذاق میں کہی گئی تھیں تو کلونت کور مسکراتی رہی۔ میں دلدار اور روپ کمار سے ذرا ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میں بھی اکلوتا ہوں تو لاڈلا ہوں سردار جی۔''

اور یوں تب کلونت نے میری طرف پہلی مرتبہ دیکھا۔ مجھے کبھی یوسف ثانی ہونے کا دعویٰ نہیں رہا۔ آنے والی زندگی میں کبھی میں نے کسی عورت کو کبھی محض اپنا چہرہ دکھا کر متاثر نہیں کیا لیکن کلونت کور کو میرے چہرے میں جانے کیا دکھا کہ وہ اتنے لوگوں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر یک ٹک مجھے یوں دیکھنے لگی کہ اُس کی محویت پر مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ بلبیر بولا تو کلونت کور کی محویت ٹوٹی۔

''اچھا اچھا دیکھتے ہیں۔ گھر جا رہی ہے تو یہ گلاس لیتی جا اور ماں سے کہنا مہمانوں کے لئے بھی روٹی بھیجے۔''

کلونت کور نے جھک کر تینوں گلاس جمع کئے۔ ایک گلاس میرے قریب سے بھی اُٹھایا۔ وہ مجھ سے لمحہ بھر کو اتنی قریب ہوئی کہ میں اُس کے گورے چہرے پر اُگا گاؤں تک صاف دیکھ سکتا تھا۔ رُواں سنہری تھا جیسے پکے ہوئے آڑو پر ہوتا ہے۔ آڑو یقیناً بہت پکا ہوا تھا اور میں اُس کی مہک بہت واضح محسوس کر سکتا تھا۔ کلونت سیدھی کھڑی ہوئی، ایک نظر پھر مجھے دیکھا اور درخت کے پیچھے سے گھر جانے والی پگڈنڈی پر ہو لی۔ میرے سامنے بیٹھے ہوئے دلدار، روپ کمار اور بلبیر سنگھ کی پیٹھ اُس کی جانب تھی اور میں اُسے جاتا

دیکھ سکتا تھا۔ وہ چار چھے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہونے سے پہلے گھومی، شاید مسکرائی بھی ہو لیکن میں اتنے فاصلے سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن میں اُس کا ہلتا ہوا ہاتھ دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے ہاتھ ہلایا، اپنے سینے پر رکھا اور ذرا جھکی۔ پھر سیدھی ہوئی اور درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئی۔ میں اتنی محویت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ دلدار نے ایک مرتبہ گھوم کر دیکھا لیکن اُس وقت تک کلونت کور جا چکی تھی اور دلدار نے اگر دیکھے ہوں گے تو محض چند درخت ہی دیکھے ہوں گے۔

چوروں والا پنڈ ہمارا آخری پڑاؤ تھا۔ کل صبح ہمیں یہاں سے واپس شہر چلے جانا تھا کیونکہ یہاں سے وہ ریلوے سٹیشن قریب تھا جہاں سے ہمیں اپنے شہر کی ریل مل سکتی تھی۔ گاؤں سے میل بھر کے فاصلے سے گزرتی اور چمکتی ریل کی پٹری اس جگہ سے، جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے صاف دکھائی دے رہی تھی اور ایک مرتبہ ریل بھی گزر چکی تھی۔ پٹری کے عین عقب میں عمر رسیدہ کی سفید حویلی درختوں کے پار سے دکھائی دے رہی تھی۔ اُس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن مجھے بھی اس حویلی آنا پڑے گا۔

بلبیر سنگھ سے ہمارا سودا نہ ہو سکا یہ الگ بات تھی لیکن ہم گاؤں میں اُس کے مہمان یوں تھے کہ ہم یہاں اُسی کے پاس آئے تھے تو اُس نے ہمیں اپنے ''ڈیرے'' پر اپنا مہمان بنا لیا۔ دلدار اور روپ کمار کو چونکہ شراب پینا تھی تو وہیں اس کا انتظام کر دیا گیا۔ میں نے گاؤں دیکھنے کا ارادہ کیا اور اُٹھ کر پگڈنڈیوں پر چلنے لگا۔

گندم کوئی چار پانچ انگل اُٹھ آئی تھی۔ کہیں کی سرسوں کے کھیت دور تک چلے گئے تھے اور پیلے پھولوں کا میدان آنکھوں کو بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ میں کلونت کور کے رویہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کا مجھے ایسی محویت سے دیکھنا اور پھر جاتے ہوئے ہاتھ ہلانا۔ میں سکھ لڑکیوں کے کھلے ڈلے انداز کے بارے میں بہت کچھ سنتا رہتا تھا۔ ایک سکھ عورت میرے تجربے میں بھی تھی۔ لہنا سنگھ کی پیاسی بیوی۔ تو کیا کلونت کور بھی ایسی ہی تھی؟ میں اس رویہ کے بارے میں اُلجھن میں تھا۔ میں چنار رہا اور سبزے کو لانگ کر آنے والی ہوا میرے چہرے سے ٹکراتی رہی۔

کلونت کور اچانک کسی کھیت سے نکلی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ وہ مسکرائی۔ اُس کے ہونٹ اور مسوڑے سرخ تھے۔ شاید اُس نے ابھی ابھی تازہ دنداسہ کیا تھا۔ کپڑے وہی تھے جن میں مَیں نے اُسے کوئی دو گھنٹے قبل دیکھا تھا۔ ہمارے درمیان چار ہاتھ کا فاصلہ ہوگا۔ اُس نے بات کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اُس نے سر پر رکھی ہوئی سرسوں کا ایک گٹھا اُٹھا رکھا تھا اور درانتی ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے گٹھا ایک طرف پھینکا، مسکرائی اور بولی۔

''شہر سے آئے ہو نا؟ بیوپاری ہو نا؟''

یہ دونوں باتیں اُس کے علم میں تھیں تو وہ کیوں پوچھ رہی تھی۔ شاید اُسے بات شروع کرنے کو کوئی موضوع درکار تھا۔ میں نے کہا۔

''ہاں۔''

اس کے بعد ہمارے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں تھا۔ ایک اجنبی کے ساتھ جو آپ سے اتنا قریب بھی کھڑا ہو، خاموشی کا لمحہ بری طرح اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ بولی۔

''میرا نام کلونت ہے۔ کلونت کور۔ بلبیر سنگھ میرے باپو ہیں۔''

وہ نہ بھی بتاتی تو مجھے پتہ تھا کہ بلبیر سنگھ سے اُس کا کیا رشتہ تھا لیکن میں نے یہ بات نہیں دہرائی اور قدرے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اس کے بعد ہمارے پاس کہنے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس مرتبہ میں نے خاموشی کا وقفہ توڑا۔

''تمہارا گاؤں بہت خوبصورت ہے۔''

وہ ہنسی اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''بس گاؤں؟''

میں لمحہ بھر کو کچھ بھی نہ سمجھا لیکن جیسے ہی اُس کی بات میری سمجھ میں آئی، میں نے کہا۔

''گاؤں والے بھی۔''

میں نے اس کو کافی نہ جانتے ہوئے براہ راست بات کی۔

''اور تم بھی بڑی خوبصورت ہو کلونت کور۔''

شاید اُسے اتنی جلدی اس تعریف کی توقع نہیں تھی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر سرسوں کے چند پھول توڑے اور اُنہیں اپنے بالوں میں اُڑس کر بولی۔

''سبھی یہ کہتے ہیں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔

''ضرور کہتے ہوں گے کیونکہ تم واقعی خوبصورت ہو۔''

اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ طویل نہیں تھا۔ کلونت کور نے تیزی سے مغرب کو جاتے سورج کو دیکھا اور بولی۔

''تم لوگ کل واپس شہر چلے جاؤ گے؟ پھر کبھی آؤ گے؟''

میں نہیں جانتا تھا کہ میں پھر کبھی اس گاؤں آ تا یا نہ آتا۔ میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ دلدار کسانوں کے حوالے سے میرے نرم رویہ سے بالکل بھی خوش نہیں تھا۔ گو میں نے کوئی سودا گھاٹے کا

نہیں کیا تھا اور بقول دلدار کے، ہم پیشگی دے کر خریدی فصل کا زیادہ پیسوں میں سودا کرنے کے باوجود بھی، منافع میں ہی بیچتے لیکن میرا خیال تھا کہ میری سخاوت میرے اباجی کو ذرا بھی پسند نہ آتی اور اگلی مرتبہ وہ ہمیشہ کی طرح خود ہی یہ سفر کرتے۔ میں نے کہا۔

''مجھے نہیں پتہ۔ میرے خیال میں میں اب یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔''

میں نے دیکھا۔ میرا جواب سن کر کلونت کور کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔ وہ قدرے دکھ سے بولی۔

''اگر کوئی یہاں تمہارا انتظار کرے پھر بھی نہیں آؤ گے؟''

ایک عجیب سے احساس کی سنسناتی لہر میرے وجود سے گزر گئی۔ میں نے کہا۔

''یہاں کون کرے گا میرا انتظار؟''

کلونت کور جواب دینا چاہتی تھی لیکن اُسی وقت تین چار سکھ بچے ایک آوارہ کتے کا پیچھا کرتے کھیتوں سے نکلے۔ کلونت کور اُن کی آوازیں سنتے ہی زمین پر پڑا گٹھا اُٹھا کر جلدی سے ایک کھیت میں اوجھل ہو گئی۔ بچوں نے ایک اجنبی، یعنی مجھے اپنے سامنے پایا تو شرما کر وہیں ٹھٹھک گئے۔ میں آگے بڑھ گیا۔

اگلے روز ہماری چوروں والے پنڈ سے روانگی تھی۔ میں لکھ چکا ہوں کہ ریلوے سٹیشن یہاں سے قریب تھا۔ ہم نے تانگے والے کو کل شام ہی رخصت کر دیا تھا چنانچہ اس میل ڈیڑھ میل کے فاصلے کے لئے بلبیر سنگھ نے ہمیں بیل گاڑی پر بٹھا دیا۔ روپ کمار ہمارے ساتھ نہیں تھا کیونکہ وہ وہیں سے اپنے گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ رات بھر ڈٹ کر مفت کی اور دیسی شراب پینے کی بنا پر دلدار محض اپنے آدھے ہی حواسوں میں تھا اور آنکھیں بند کئے نیم دراز تھا۔ بیل گاڑی ظاہر ہے اس کی جو بھی رفتار تھی اُس پر سبز چارے کے درمیان بنے راستے پر چلی جا رہی تھی۔ تب میں نے کلونت کور کو دیکھا۔

اُس نے کپڑے تو کل والے ہی پہن رکھے تھے لیکن اُس کا دوپٹہ آج دھانی رنگ کا تھا۔ میں چونکہ سامنے کے رخ نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ پیچھے کی طرف منہ کئے بیٹھا تھا تو جب بیل گاڑی اُس کے قریب سے گزر گئی تو وہ مجھے دکھائی دی۔ وہ تنہا اور ساکت یوں کھڑی تھی جیسے انسان نہ ہو، کھیتوں میں کھڑا بجوکا ہو۔ بیل گاڑی اُس کے قریب سے گزر گئی، وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی، پھر بھاگی اور بیل گاڑی کے بالکل قریب ہو کر اُس نے میرا ہاتھ تھاما۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ بیل گاڑی والا ہماری طرف سے بے خبر تھا۔ دلدار شاید گہری نیند میں تھا۔ میں بیل گاڑی سے آہستگی سے اُترا۔ یہ اطمینان تو بہر حال اپنی جگہ تھا کہ اگر بیل گاڑی آگے بھی نکل گئی تو میں بھاگ کر اُس پر سوار ہو جاؤں گا۔

ہم سبزے کے کھیتوں کے بیچ کھڑے تھے۔ کلونت کور بولی۔

''میں تم سے جو کل سے کہنا چاہتی تھی، وہ کہنے کے لئے رات تمہارے پاس بھی گئی تھی مگر تم نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ میں بڑی دیر کھٹکھٹاتی رہی۔''

یہ بات میرے لئے حیرت انگیز تھی۔ میں نے کہا۔

''مجھے بالکل بھی پتہ نہ چلا۔ تم کیا کہنا چاہتی تھیں کلونت کور؟''

کلونت کور نے ایک نظر مجھے دیکھا اور بولی۔

''میں تمہیں یہ بتانے گئی تھی باؤ کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں اور میں اس کے لیے اپنا دھرم تک چھوڑنے کو تیار ہوں۔''

یہ عجیب صورت حال تھی، مجھے سٹیشن پہنچنا تھا۔ بیل گاڑی مجھ سے دُور ہوتی جا رہی تھی اور ایک ایسی لڑکی مجھ سے شادی کرنے کو کہہ رہی تھی جس سے میری یہ تیسری ملاقات تھی۔

میں نے کلونت کی کور کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو، اُمید اور التجا تھی۔

یہ بہت بڑا فیصلہ تھا جو کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا تھا جسے خود سے ہر لمحہ دُور ہوتی بیل گاڑی پر ابھی بھاگ کر سوار ہونا تھا اور تاخیر کی صورت میں گھنٹوں کسی دوسری ریل گاڑی کا منتظر رہنا تھا۔ مجھے وہ پاگل لگی۔ میں نے سوچا یہ میں کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اُسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا۔ اپنی بات کسی اور طرح سے کہتا لیکن اب مجھے جو کہنا تھا وہ چند سیکنڈوں میں ہی کہنا تھا، چنانچہ میں نے کہا۔

''تمہیں مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟ اوہ۔ یہ جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے جب تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تو تم مجھے بڑی اچھی لگی تھیں۔''

میں بیل گاڑی کی طرف چلنے لگا کیونکہ میرا خیال تھا کہ یہ اُسے ٹالنے کو یہ جواب کافی تھا۔ یہ جواب دے کر مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن مجھے اور کوئی جواب سوجھا ہی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کلونت کور کا چہرہ خوشی سے سرخ ہوگیا۔ وہ مسکرائی اور میرا ہاتھ تھام کر بولی۔

''تم سچ بول رہے ہو باؤ؟''

میں اب جلد از جلد اُس سے دُور چلا جانا چاہتا تھا تو میں نے کہا۔

''ہاں سچ بول رہا ہوں۔ دیکھو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں پھر کبھی آؤں گا تمہارے گاؤں۔ ٹھیک؟''

اب میں تیز چل رہا تھا۔ کلونت میرے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ مجھے تیز چلنے میں قدرے دشواری پیش آ رہی تھی لیکن کلونت اتنی سبک قدمی سے چل رہی تھی جیسے یہ اُس کا روز کا معمول ہو۔ اُس نے

چلتے چلتے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی۔

''پکا وعدہ؟''

میں نے کہا۔

''ہاں پکا وعدہ۔''

کلونت نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا اور مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر بولی۔

''مجھے پتہ تھا۔''

پتہ نہیں وہ یہ کس سلسلے میں کہہ رہی تھی۔ میں اُس سے الگ ہوا اور میں نے کہا۔

''تم گھر جاؤ۔ ہم پھر ملیں گے۔''

کلونت وہیں کھڑی رہ گئی۔ میں کبھی تیز چلا اور کبھی بھاگا اور بیل گاڑی میں سوار ہوگیا۔

میرے سوار ہونے سے جھٹکا لگا تو گاڑی بان نے گھوم کر دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

جب ہماری ریل سٹیشن سے نکل رہی تھی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا تو ویران پلیٹ فارم پر مجھے ایک ہی فرد دکھائی دیا۔ وہ کلونت کور تھی جو شاید مجھے تو نہ دیکھ پائی ہو لیکن ریل کی طرف دیکھ کر ہاتھ ضرور ہلا رہی تھی۔ شاید وہی لمحہ تھا جب میرے دل پر کلونت کور کی محبت برسات کے مینہ کی طرح یک بارگی برسی اور میرا جی چاہا کہ میں ریل سے اتر کر اُس کی طرف بھاگا چلا جاؤں اور اُسے ساتھ لے کر کسی ایسی جگہ جا چھپوں جہاں وہ ہو اور میں۔

میں گھر پہنچا تو ابا جی کی صحت پہلے سے بہتر تھی اور اُن کی گالیوں میں پہلے والا کرارا پن لوٹ آیا تھا۔ میں اس کام سے بہت بے مزہ ہو کر واپس آیا تھا اور ان چند دنوں میں اگر مجھے کوئی نفع ہوا تھا تو وہ ایک سکھ لڑکی تھی جس سے مجھے محبت ہوگئی تھی۔ میرا ماموں محمد دین اُنہی دنوں میرے لئے کوئی رشتہ تلاش کر چکا تھا اور گھر پہنچ کے مجھے یہ علم بھی ہوا کہ اس سلسلہ جنبانی میں میری غیر موجودگی میں کافی حد تک ترقی بھی ہو چکی تھی اور وہ یوں کہ ابا لڑکی کے والد سے ملاقات کر چکے تھے اور وہ اُنہیں کافی پسند آیا تھا۔ لڑکی لاہور کی رہنے والی تھی تو ظاہر اُس کے والد کا بھی اُسی شہر سے تعلق تھا۔ اُس شام جب میں رات بھر کے سفر سے تھکا ماندہ اپنی نیند پوری کر کے گھر کے برامدے میں آیا، جہاں ابا چائے پینے کے بعد حقہ پی رہے تھے اور میرا ماموں ابا کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھا پُرشور آواز میں چائے کے گھونٹ لے رہا تھا، یہی موضوع گرم تھا۔ میرے ابا جی جو میرے ماموں سے خوش بھی تھے، اُس وقت کہہ رہے تھے۔

''میں تو کہتا ہوں اب اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے ابا جی تو ستاراں سال کے تھے جب ان کی شادی ہوگئی تھی۔ خود میں جب اس کی عمر کا تھا تو ہمارے بچے......''

میں نے دیکھا تھا کہ اماں کو ہمیشہ ابا کی اپنی عمر کے ساتھ بچوں کے حوالے والی بات بہت بری لگتی تھی تو اُنہوں نے چائے کا پیالہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے ابا کی بات کاٹی اور بولیں۔

''سو دفعہ سن چکی ہوں تمہاری یہ بات۔ اس کی بات کرو اب۔''

اماں نے میرے قریب بیٹھتے اور دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ابا کو سرزنش کی۔

اس پر میرا ماموں مسکرایا اور بولا۔

''وہ بھی آڑھت کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں گڑ شکر کا کاروبار ہے تو بندے بھی ویسے ہی میٹھے ہیں۔ لڑکا کوئی ہے نہیں۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کی شادی پچھلے سال ہوگئی ہے۔ داماد اُن کے ساتھ ہی دکان پر بیٹھتا ہے۔ ملا ہوا ہوں اُس سے۔ شام کو زور کرنے اکھاڑے میں جاتا ہے۔''

میں نے بی اے پاس کیا تھا، کیٹی جیسی نستعلیق عورت میرے دوستوں میں شامل تھی۔ بہت سے مطالعے نے مجھ پر زندگی کے جو در وا کئے تھے اُن میں سے کوئی گڑ شکر کی دکان میں نہیں کھلتا تھا اور میں کسی پہلوان کا ہم زلف یوں بھی نہیں بن سکتا تھا کہ میری زندگی میں کلونت کور جیسی لڑکی آ چکی تھی، چنانچہ میں نے کہا۔

''ابا جی۔ میں ابھی شادی وادی نہیں کروں گا۔ میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔ اور یہ کاروبار جو آپ کر رہے ہیں، اس میں میں نے صرف ظلم ہی ظلم دیکھا ہے۔ ہم ایک کسان سے اُس کی فصل پتھروں کے مول لیتے اور موتیوں کے مول بیچتے ہیں۔ یہ بددیانتی بھی ہے اور گناہ بھی۔''

برامدے میں سناٹا چھا گیا۔ میں نے پہلی بار کھل کر بغاوت کی تھی اور اس کا اظہار بھی واشگاف الفاظ میں کیا تھا تو ابا جی پہلے تو سیدھے ہو کر بیٹھے۔ پھر اُنہوں نے جھک کر چارپائی کے نیچے سے اپنی چپل ڈھونڈنے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے، ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو اُنہیں کوئی ایسی ٹھوس چیز دکھائی نہ دی جسے وہ مجھے پھینک کر مار سکتے تو اُنہوں نے مجھے منہ بھر کر گالی دی اور بولے۔

''اوئے ہم بے ایمان ہیں۔ چور ہیں۔ خیانتیں کرتے ہیں۔ گناہ گار ہیں۔ یہ تو مجھے بتا رہا ہے۔ میں نے تجھے اُس دلے دلدار کے ساتھ بھیج کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ تو ایک ناکارہ اور بے کار آدمی ہے اور میں تجھے اسی وقت اپنی (وہ غالباً منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد غصے کی بنا پر نہ کہہ پائے) وہ جو بھین یا دی مقبولہ وغیرہ ہوتی ہے، اُس سے وہ کرتا ہوں۔ دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔''

ماموں نے ابا جی کی بات آگے بڑھائی۔

''بالکل ٹھیک بات کر رہے ہیں بھائی جی۔ بڑوں سے ایسے کوئی بولتا ہے؟ چل معافی مانگ اسی ٹیم۔''

اماں کو ابا جی کی باتیں ذرا بھی پسند نہ آئیں لیکن وہ اُنہیں کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں تو اُنہوں نے

میرے ماموں کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''کوئی اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے اُسے ایسا لگا ہو جیسے اُس نے کہا ہے۔ اُسے سمجھاتے کیوں نہیں؟''

پھر اماں نے مجھ سے دھیمے لہجے میں بات کی۔

''پُت کاروبار ایسے ہی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں تُو کیا دیکھ کر، کیا سمجھ آیا ہے۔''

میں نے کہا۔

''نہیں اماں۔ یہ کاروبار نہیں ظلم ہے۔ میرا اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے میں آج تک اس آڑھت والے کام کو سمجھ ہی نہیں سکا۔''

ابا جی کا غصہ اب اپنے عروج پر تھا۔ وہ بولے۔

''ہم تو ایسے ہی کاروبار کرتے ہیں۔ ساری دنیا کرتی ہے۔ اوئے تجھ پہ کسی نے پھر سے گنڈے تو نہیں کروا دیئے؟''

یہ موضوع میرے ماموں کا دل پسند تھا تو وہ مسکرا کر حوصلہ دینے والے انداز میں بولا۔

''مجھے خود بھی شبہ ہوا تھا۔ جب میں اس گھر میں داخل ہونے لگتا ہوں مجھے ایک عجیب سی خوشبو آتی ہے۔ جس گھر پہ جادو ٹونہ ہوا ہو وہاں سے ایسی خوشبو ہی آتی ہے۔''

ابا جی کا غصہ یہ بات سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کہاں تو وہ مجھے اپنی جائیداد سے عاق کرنے کا اعلان کر بیٹھے تھے اور کہاں اُنہوں نے مجھے پیار سے مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جا یار دوستوں میں گھوم آ۔ ہم نے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔''

میں خود بھی یہی چاہتا تھا تو میں فوراً ہی گھر سے نکل گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری موجودگی میں ماموں کے پیر، اُس کے جلالی وظیفوں اور مجھ پر کئے گئے تعویذ گنڈوں کے توڑ کی باتیں ہوں گی۔ میں نے ایک مرتبہ لگی لگائی نوکری چھوڑی تھی اور دوسری مرتبہ اپنے باپ کے کاروبار میں غلطیاں نکالی اور باپ کو نصیحت کرنے کی کوشش کی تھی اور ان کے خیال میں یہ کام وہی آدمی کر سکتا تھا جس کا دماغ اُلٹ چکا ہو اور یہ دماغ صرف تعویذ گنڈوں اور جوابی عمل سے ہی درست کیا جا سکتا تھا۔

جیرے کا ہوٹل آباد تھا۔ خلش کے علاوہ اور سبھی موجود تھے۔ جی کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور وہ بہت چہک رہا تھا۔ چونکہ وہ میری اور کلثوم کی ناکام محبت سے واقف تھا اور خود بھی اسی تجربے سے گزر کر ایک مرتبہ پھر محبت کا ڈول ڈال کر شادی کر رہا تو وہ میرے لئے بھی یہی مناسب سمجھتا تھا۔ جب چائے

منگوا چکے اور پہلے پہلے گھونٹ بھر چکے تو اُس نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''دیکھ یار۔ٹھیک ہے آدمی کو محبت ہو جاتی ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کبھی کامیاب ہوتی ہے اور کبھی ناکام لیکن اسے ہرز جاں نہیں بنانا چاہئے۔(مجھے یقین ہے کہ اُس نے یہ الفاظ جیرے کے ہوٹل پر ہونے والے کسی مشاعرے سے اُڑائے تھے)اور بندے کو شادی ضرور کرنی چاہئے۔''

میں نے اُسے کلونت کور کے بارے میں بتایا۔وہ ہنسا اور بولا۔

''ہاں مغربی پنجاب کی سکھنیاں بڑی ٹائٹ ہوتی ہیں۔پھر بات کچھ آگے چلی؟''

میں بات آگے چلنے کا مطلب ذرا دیر میں سمجھا تو میں نے کہا۔

''کمینگی مت کر جّجی۔مجھے اُس لڑکی سے نہ اُس وقت محبت ہوئی تھی جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا، نہ اُس وقت جب وہ میرے راستے میں کھڑی ہو گئی تھی۔مجھے اُس سے اُس وقت محبت ہوئی جب ہماری ریل چلی اور وہ ریلوے سٹیشن پر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔''

جّجی نے کہا۔

''اگر جس رات وہ تیرے کمرے کا دروازہ بجاتی رہی اور تو سویا رہا، تجھے ملتی تو بات بہت آگے نکل سکتی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور مجھے آنکھ ماری۔میں نے کہا۔

''نہیں۔ایسا اُس رات بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں کیسا آدمی ہوں، تجھے اچھی طرح پتہ ہے۔''

جّجی چند لمحوں تک سگریٹ پیتا رہا اور پھر بولا۔

''پھر اب کیا ارادہ ہے؟ جائے گا اُس کے گاؤں؟''

اس سوال کا جواب دینا اس لئے مشکل تھا کہ میں جو کچھ وہاں کر کے آیا تھا اور پھر ابا جی سے اس سلسلے میں بحث بھی کر چکا تھا تو وہ مجھے کبھی دوبارہ اس کام کے لئے نہ بھجواتے۔

میں نے کہا۔

''کوئی اُمید تو نہیں ہے لیکن جّجی جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے، میں اُس کے لئے بے چین ہو رہا ہوں۔میں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔اُس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔یار اتنی شدت کی محبت تو مجھے کلثوم سے بھی نہیں ہوئی تھی۔جّجی مجھے کوئی مشورہ دے''۔

جّجی کو غالبًا اب اس معاملے میں اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''شادی کرے گا اُس سے؟''

میں نے بنا جھجکے کہا۔

''کر بھی سکتا ہوں۔میں نے تجھے بتایا تو ہے کہ وہ اپنا دھرم تک چھوڑنے کو تیار ہے۔''

میں نے کہہ کر کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا کیونکہ کلونت کور نے مجھ سے یہی کہا تھا اور بار بار کہا تھا۔جّجی نے اپنی دو تین دن پرانی شیو والی ٹھوڑی کھجائی،طویل سانس لیا اور بولا۔

''یار بات یہ ہے کہ ایک تو مغربی پنجاب کے سکھ پکے اپنی ماں کے خصم ہیں۔ایک منٹ میں قتل کر دیتے ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو تمہارے ماں یاوے سیاست دانوں نے ہندو مسلمان سکھ میں تفریق پیدا کر دی ہے، یہ اس معاملے کو اور خطرناک بنا رہی ہے۔میں کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

ہم دیر تک کوئی ایسا طریقہ سوچتے رہے مگر عاجز رہے۔جّجی جب دوسری مرتبہ چائے منگوا چکا تو بولا۔

''تُو اپنے گھر والوں کو سنبھال سکتا ہے؟''

میں جانتا تھا کہ اُس کا کیا مطلب تھا۔یہ بھی ایک امر محال تھا۔کم از کم میرے ابا جی کو ایک سکھ بہو کسی صورت قبول نہ ہوتی۔میں نے کہا۔

''میرے ابا جی کسی صورت ایک سکھ لڑکی کو بہو بنانے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ہاں اماں کو میں منا سکتا ہوں۔''

لیکن جّجی جانتا تھا کہ برصغیری معاشرے میں ماں کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے تو اُس نے کہا۔

''شادی عمر بھر کا قصہ ہوتا ہے تو بہتر ہے تُو اُسے بھول جا۔''

لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے مجھے لگ رہا تھا کلونت کور کو بھولنا ناممکن تھا۔میں نے کہا۔

''میں اُسے نہیں بھول سکتا۔میرے پاس اُس کے گاؤں جانے کا بھی کوئی معقول بہانہ نہیں ہے لیکن میں اُس سے ملنا بھی چاہتا ہوں۔مجھے کیا کرنا چاہئے۔''

جّجی نے سگریٹ پرچ میں بچی کچھی چائے میں ڈبو کا بجھایا لیکن اُسے پھینکا نہیں بلکہ اُس کے سیاہ سرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اُس سے مل۔یاد رکھ یہ عشق بڑی بری بلا ہے۔ایک دفعہ ملنے کا مطلب سمجھتا ہے؟ بار بار ملنے کی خواہش؟ ہو سکے تو ایک دفعہ دل کو مار لے۔سمجھا لے۔ورنہ پھر عمر بھر تڑپنے سسکنے کو تیار ہو جا کیونکہ اگر تجھے واقعی اُس سے محبت ہو گئی ہے تو پھر یہ تجھے کبھی چین نہیں لینے دے گی۔''

جّجی نے یہ مشورہ بہت دیر سے دیا تھا۔

میں نوجوان تھا، بی اے پاس تھا اور بے روزگار تھا۔یہ بے روزگاری والا طعنہ مجھے یوں بھی

شدت سے دیا جاتا تھا کہ میں ایک لگی لگائی نوکری کو لات مار آیا تھا۔وہ دن کساد بازاری کے تھے اور نوکریوں کا حصول ہندوستانی جوانوں کے لئے ناممکن تھا۔ملک میں سیاسی آگ لگی ہوئی تھی۔صدیوں سے مل جل کر رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ابھی کھلم کھلا فسادات تو شروع نہیں ہوئے تھے لیکن مسلمانوں کے علیحدہ وطن کی تحریک میں جان پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔اُس وقت کا ہندوستان تین قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔محض آزادی حاصل کرنے کے متمنی، پاکستان بنانے والے اور ایک خاموش اکثریت جنہیں ان دونوں باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی ہندو مسلمانوں کو کچھ چبا جائیں گے اس لئے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ جائے پناہ بہت ضروری تھی۔وہ بھی تھے جن کے خیال میں ہندوستان کی تقسیم مسلمانوں کی تقسیم کے مترادف تھی لیکن ہندوستان کی اُس وقت کی سیاسی اشرافیہ جس میں جناح صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا نام سرِفہرست رکھا جا سکتا ہے، پاکستان کے مطالبے کے ساتھ ہی در آنے والے ایک عظیم خطرے کی طرف سے قطعاً لاتعلق یا بے خبر دکھائی دیتے تھے اور وہ خطرہ برصغیر کی تاریخ میں پھوٹنے والے وہ خوفناک اور خون آلود فسادات تھے جن کا لاوہ اندر ہی اندر پک رہا تھا اور جب یہ لاوہ پھوٹا تو اس نے انسانیت اور مذہب پر لوگوں کے یقین کے پرخچے اُڑا کر رکھ دیئے لیکن ابھی وہ وقت قدرے دُور تھا۔

میرے لئے دوسری نوکری کا بندوبست گوگی بٹ نے کیا۔میں پہلے بھی اُس کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ وہ پاکستان اور جناح صاحب کے خلاف تھا اور مولانا آزاد اور گاندھی جی کا زبردست مقلد تھا۔اُس نے تو گاندھی جی کی اقتدا میں ایک بکری بھی پال رکھی تھی اور اُسی کا دودھ پیا کرتا تھا۔

میں اُس دن اپنی گھر کی بیٹھک میں کرسی پر نیم دراز چھت کی کڑیاں گن رہا تھا اور کلونت کور اور اپنے بارے میں سوچ رہا تھا، تبھی گوگی بٹ نے دروازے پر بلند آواز میں میرا نام لے کر پکارا۔میں اُسے اندر لے آیا۔گوگی بٹ کا سرخ چہرہ معمول سے زیادہ سرخ تھا اور لمبے سانس اس بات کے گواہ تھے کہ وہ تیز چل کر آیا تھا۔اُس نے کمرے میں آتے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا اور پرجوش لہجے میں بولا۔

''لے بھئی تیرے لئے ایک نوکری کا بندوبست کر دیا ہے میں نے۔ساڑھے تین سو تنخواہ۔کھانا پینا رہنا سب مفت اور نوکری کیا ہے تفریح ہے ایک قسم کی۔بس جنگل میں رہنا ہوگا۔''

وہ بیٹھا اور دامن کے نیچے احتیاط سے کھجا کر بولا۔

''پچھلی گرمیوں سے ایسی بھین...... خارش لگی ہے اور ایسی غلط جگہ کہ کیا بتاؤں؟ پھر تُو تیار ہے؟''

میں اتنی سی تفصیل کے ساتھ کیسے تیار ہو سکتا تھا لیکن چونکہ تنخواہ مجھے بہت زیادہ لگی تھی تو میں نے کہا۔

''کہاں کرنا ہوگی نوکری؟ کون لوگ ہیں؟ اور جنگل میں تو فاریسٹ گارڈ کی نوکری ہی ہو سکتی ہے جس کی تنخواہ محض چالیس روپے ہوتی ہے۔''

وہ ہنسا اور وہ ہاتھ جس سے اُس نے زیرِ دامن ٹٹولا تھا، اُس کی اُنگلیوں پر پھونک مار کر بولا۔

''اوئے جنگل سے مطلب ہے دیہاتی علاقہ۔ایک بڑا زمیندار ہے۔عمر حیات خان۔اُس بھین....کے پرکھوں کو انگریزوں نے غدر کے ٹیم پر وفاداری کے صلے میں بڑی جگیر دی تھی۔اُس کا منیجر مر گیا ہے۔اُسے ایک منیجر چاہئے۔یہ ابھی راز ہے۔میرا چاچا اُدھر منشی ہے۔اُس نے کہا ہے کہ سارے ہندوستانی اُدھر کام کرتے ہیں۔ایک بندہ اپنا بھی ہونا چاہئے اور پنجابی ہو۔بی اے پاس ہو۔جوان ہو اور انگریزی بولتا ہو۔تجھ میں ساری خوبیاں ہیں تو میں نے سوچا تجھ سے بہتر اُمیدوار اُن بھین....کو اور کہاں سے ملے گا۔تو کاکا اگر تُو تیار ہے تو پانچ بجے میرے گھر آ جا۔چاچا کل صبح واپس جا رہا ہے۔''

میرا اگلا سوال بالکل قدرتی تھا۔میں نے کہا۔

''مگر یہ جاگیر ہے کہاں جہاں تُو مجھے نوکری دلوا رہا ہے؟''

اس پر جو علاقہ گوگی بٹ نے بتایا وہ سن کر میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔وہ علاقہ اُس جگہ سے تقریباً متصل تھا جہاں کلونت کور رہتی تھی۔میری یہ حالت تھی کہ اگر اُس وقت گوگی بٹ مجھ سے مجوزہ خدمات مفت بجالانے کو بھی کہتا تو میں بخوشی آمادہ ہو جاتا جبکہ وہ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ بھی بتا رہا تھا۔گوگی بٹ کا چچا ٹھیٹھ پنجابی تھا اور اُس کی صورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ اس روئے زمین پر اُس سے بڑا خوشامدی شاید ہی کوئی اور پیدا ہوا ہو۔ایک ایسی مسلسل خوشامدانہ مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی جس نے اُس کے لبوں کے گوشوں کو دو مستقل لکیروں میں تبدیل کر دیا تھا۔جس وقت میں وہاں پہنچا وہ سگریٹ کو مٹھی میں تھامے اُسے دم پخت کئے بیٹھا تھا اور گوگی بٹ کے باپ کو کسی ایسے سکھ پولیس افسر کا قصہ سنا رہا تھا جس نے جاگیردار کے کسی کارندے کو جوا کھیلنے کے الزام میں پکڑ لیا تھا اور جسے اُس نے اپنے رعب و داب کے زیرِ اثر رات تھانے میں گزارنے سے بچا لیا تھا۔وہ مجھ سے مل کر خوش ہوا اور بولا۔

''کاکا جیسی تیری صورت ہے اور جیسی انگریزی میں نے سنا ہے تُو بولتا ہے تو پھر اپنی نوکری پکی سمجھ۔میں خان صاحب سے جاتے ہی کہانی ڈال دوں گا۔بات یہ ہے کہ وہاں سب ماں یاوے اردو بولنے والے ہیں۔میرا تو منہ دکھ جاتا ہے ان سے باتیں کرتے کرتے مگر خان صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں اور ان بھین....کو بڑا لائق سمجھتے ہیں تو بڑے منیجر سے لے کر مال منڈی پہنچانے والے تک سبھی یہی لوگ ہیں مگر تو فکر نہ کر اور اپنا سمیان تیار رکھ۔''

میں بڑا بے چین تھا اور جب میں نے یہ سوال پوچھا تو گوگی بٹ کا چچا اسے میری نوکری کے لئے بے چینی سمجھا۔ میں نے کہا۔

''میں جلد از جلد یہ نوکری کرنا چاہتا ہوں جی۔ کہیں تو آج رات ہی روانہ ہو جاؤں؟''

وہ کھل کر ہنسا تو اُسے کھانسی کا بلغمی دورہ پڑا۔ اُس نے سانس بحال کر کے کہا۔

''اوئے اتنا اوتاولا مت بن۔ ایک ہفتہ تو لگے ہی لگے۔ میں کل جا رہا ہوں۔ تیری کہانی ڈالوں گا اور پھر خان صاب کی منظوری ہوگی، پھر تجھے بلائیں گے۔ پر ایک بات یاد رکھنا۔ خان صاحب سے سیاسی بات کوئی نہ کرنا۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے بڑے خلاف ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ انگریز بادشاہ کبھی یہاں سے نہ جائیں اور میں تو کہتا ہوں کہ ٹھیک ہی کہتے ہیں وہ۔ کیا خیال ہے تیرا؟''

مجھے اس وقت سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انگریز، ہندوستان کی آزادی اور پاکستان وغیرہ میرے لئے ثانوی حیثیت یوں رکھتے تھے کہ ان سب پر اُونچے لمبے قد اور سیاہ آنکھوں والی، سرخ قمیص اور کالے لاچے میں ملبوس کلونت کور کھڑی اپنے رنگلے دنداسے والے نیم سرخ ہونٹوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

''چاچا مجھے سیاست سے ویسے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم بس مجھے کسی طرح یہ نوکری دلوا دو۔''

کھانسی کا دوسرا دورہ قابو کر کے گوگی بٹ کے منشی چچا نے زوردار انداز میں یقین دلایا کہ میں ایسا ہی سمجھوں۔

''دیکھ بچے۔ مجھے تو سولہ آنے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ جب میں ادھر آ رہا تھا تو خان صاحب نے کہا تھا کہ میں کوئی منیجر دیکھوں اچھا سا۔ جوان ہو اور انگریزی جانتا ہو۔ اس سے تو یہی پتہ لگتا ہے کہ اُنہیں تیرے جیسے جوان کی ہی ضرورت ہوگی۔''

میں مطمئن ہو کر وہاں سے اُٹھا۔

میری توقع کے عین مطابق یہ خبر اباجی کے لئے انتہائی خوشی کا باعث ٹھہری۔

چونکہ ان دونوں میرا ماموں مجھ پر سے سفلی اثرات اُتارنے کو جتن بھی کر رہا تھا تو میرے والدین نے اسے اُس کی کاوشوں کا ثمر جانا اور میرے اباجی نے کھنکھار کر تھوکا اور لب کرتے کے دامن سے پونچھ کر میری اماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''میں کہتا ہوں تیرا بھائی معمولی آدمی نہیں۔ دیکھ ایک ہفتے میں اُس نے اپنی کارروائیوں کا نتیجہ نکال دیا۔''

اماں نے تائید کی کہ ایسا ہی تھا۔ پھر اباجی نے وہ موضوع چھیڑا جو میری چڑ بن چکا تھا۔ وہ بولے۔

''اب تو تیرے پاس اپنا گھر بار بھی ہوگا اس لئے دو چار دن کی چھٹی لے کر آ جانا اور شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے جانا''۔

اُنہوں نے اگلا سوال اماں سے کیا۔

''کیا کہتی ہے؟''

پھر مجھے متوقع نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔

''اب اگر کوئی بہانہ کیا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔''

دراصل میں اُس شام اتنا خوش تھا کہ اباجی سے کسی قسم کی تلخ گفتگو کرنا ہی نہیں چاہتا تھا تو میں نے ہنس کر کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے اباجی پر ابھی مجھے نوکر تو ہو لینے دیں۔ وہاں کا ماحول تو دیکھ لینے دیں۔''

اماں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''بات ٹھیک ہے اس کی اور وہ کوئی منع تو نہیں کر رہا۔''

اباجی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور وہ ہنس کر بولے۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جا ماحول دیکھ اور پھر تیاری کر۔ اب میں نے تجھے نہیں چھوڑنا۔ غضب خدا کا۔ میں تو تیری عمر میں......''

چونکہ وہ میری عمر میں باپ بننے والی بات کا فخریہ اظہار کرنے جا رہے تھے اور یہ بات میں کتنی ہی مرتبہ پہلے بھی سن چکا تھا تو میں وہاں سے فوراً ہی اُٹھ کر گھر سے نکل گیا لیکن میں اپنے پیچھے اماں کا احتجاج اور اباجی کی ہنسی سن سکتا تھا۔ وہ اس شام بہت خوش تھے۔

خلش اور ججی میری نوکری والی بات سن کر بہت خوش ہوئے۔ ججی نے کہا۔

''ویسے میں نے سنا ہے کہ ان جاگیرداروں کی حویلیوں میں بڑی کہانیاں ہوتی ہیں۔ میرا مطلب سمجھتا ہے نا؟''

مجھے کسی کہانی سے دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے فقط کلونت کور میں دلچسپی تھی۔

آٹھویں دن میں ایک نیم ویران دیہاتی سٹیشن پر اُترا تو اُس جگہ کو فوراً ہی یوں پہچان گیا کہ اس سے متصل علاقے میں ہم اُس دوران تانگے میں خوب گھومے پھرے تھے جب میں دلدار کے ساتھ سبزیوں کی پیشگی خریداری کے لئے آیا تھا۔ مجھے لینے کے لئے سٹیشن پر جو آدمی آیا تھا، اُس کی لمبی مونچھوں تلے کثرت

تمباکو نوشی سے پیلے دانت پہلی نظر میں اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

آدمی نے میرا ٹین کا صندوق اُٹھایا اور ہنس کر بولا۔

''منشی خود نہیں آیا کیونکہ وہ خان جی کے ساتھ لاہور گیا ہے۔ کوئی ماں....زمین کا رولا ہے۔''

تانگہ جب کچی پکی سڑک پر چلنا شروع ہوا تو اُس نے میرے جسم کا ہر بند ہلا ڈالا۔ میں نے کہا۔

''سڑک بڑی خراب ہے اس علاقے کی۔''

پیلے دانتوں والا ہنسا اور سڑک کو گالی دے کر بولا۔

''خان جی کہتے ہیں پکی سڑک بنے گی تو سکول بنے گا، سکول بنے گا تو ان ماں....کسانوں کے بچے پڑھ جائیں گے اور جب یہ پڑھ جائیں گے تو ہمارے حقے کون تازہ کرے گا؟''

مجھے عمر حیات خان کی ذہنیت کا اندازہ اسی ایک بیان سے ہو گیا۔ وہ شخص جس کی میں نوکری کرنے آیا تھا، کس قبیل کا تھا، میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا۔ پھر پیلے دانتوں والے نے اپنا تعارف کروایا۔

''میرا ناں بشیر ہے جی۔ میں غلام ہوں خان جی کا۔ ویسے بات ٹھیک نہیں اُن کی؟''

وہ ایک جاہلانہ بات پر میری گواہی لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''اپنا اپنا خیال ہے بشیر۔''

اس بات کا اس کے علاوہ اور کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

جب تانگہ دُور سے دکھائی دینے والے ایک وسیع و عریض گھر سے متصل مکانوں میں سے ایک کے قریب ٹھہرا تو مجھے علم ہوا کہ مجھے کہاں ٹھہرنا تھا۔ گھر صاف ستھرا تھا۔ دو کمرے اور ایک غسل خانہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ۔ بشیر نے کہا۔

''پہلے والا منیجر صاب اسی گھر میں رہتا تھا۔ اچھا لوگ تھا جی۔ بس دو دن بیمار رہا اور مر گیا۔''

بشیر نے مجھ سے کھانے کو پوچھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں بےحد تھکا ہوا تھا اور سونا چاہتا تھا۔ میں فوراً ہی سو گیا۔ چار بجے ہوں گے جب میری آنکھ کھلی۔ میں نہایا تو پانی بہت ہی فرحت بخش تھا۔ میں نے لباس تبدیل ہی کیا تھا کہ بشیر پھر آن موجود ہوا اور اُس نے مجھے فوراً ہی عمر حیات کے حضور پیش ہونے کو کہا۔ جی ہاں اُس کے الفاظ یہ تھے۔

''خان جی کے حضور پیش ہونا ہے۔ تم تیار ہو؟''

میں تیار تھا۔ پانچ منٹ بعد میں عمر حیات کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ایک وسیع لان میں کھڑا ہوا گلاب کی ایک کیاری کا معائنہ کر رہا تھا اور بشیر کی آواز پر سیدھا ہو کر ہماری جانب گھوما تھا۔ بشیر نے کہا تھا۔

''خان جی۔ نیا منیجر پیش ہو گیا ہے۔''

سچی بات ہے جب لمبی سفید مونچھوں اور چمکدار دانتوں والے عمر حیات نے میری طرف دیکھا تو میں قدرے نروس ہو گیا تھا۔ وہ انگریزی میں بولا۔

''تمہیں وہاں رہنے میں کوئی تکلیف تو نہیں؟''

مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی تو میں نے مختصراً بتایا کہ ایسا ہی تھا۔ پھر وہ پہلے سے پڑی ایک ہی کرسی پر بیٹھا اور بولا۔

''منشی جمعہ خان نے تمہاری بڑی تعریف کی تھی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اُسے شرمندہ نہیں ہونے دو گے۔''

میری سمجھ میں یہ بات ادھوری سی آئی۔ میں نے کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ اپنا کام ایمانداری سے کروں لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے ابھی تک یہ پتہ نہیں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میرا کھیتی باڑی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں چند ماہ پی ڈبلیو ڈی میں کلرکی کر چکا ہوں اور بس۔''

لگتا تھا عمر حیات کو میری صاف گوئی اچھی لگی تھی۔ وہ مسکرایا اور بولا۔

''کھیتی باڑی کی فکر کرنے والے یہاں بہت سے ہیں۔ تمہیں ہماری جاگیر کی چیزوں کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ ہمارے پاس پانچ کاریں ہیں۔ دو ٹرک ہیں۔ جرمنی سے منگوائے ہوئے دو ٹریکٹرز ہیں۔ اُن کی دیکھ بھال، تیل پانی کا جھگڑا۔ پھر حویلی کے مہمانوں کی دیکھ بھال وغیرہ۔ یہی کام ہوتا ہے ہمارے سٹیٹ منیجر کا۔ یہاں انگریز بھی آتے جاتے ہیں اسی لئے ہمیں انگریزی سمجھنے والا آدمی چاہئے تھا۔ بہرحال تم جاگیر کے ملازم ہو گئے ہو۔ اب جاؤ۔ اگلی باتیں تمہیں منشی جمعہ سمجھا دے گا۔''

یہ ملاقات بڑی جلدی ختم ہو گئی۔

مجھے سب کام سمجھنے اور اُس کی ذمہ داری لینے میں دو دن لگے۔ فی الحال تو کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میں نے منشی جمعہ کے ساتھ جاگیر بھی دو دفعہ دیکھ لی تھی اور وہاں کام کرنے والوں کی بستی بھی۔ یہ جاگیر اور بستی ہندوستان پر حکومت کرنے اور اپنے ملک کی جمہوریت اور فلاحی ریاست کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے انگریزوں کی منافقت اور دوعملی کی ایسی تصویر تھی جس کا تصور، اُس وقت کے برطانیہ میں رہنے والا کوئی انگریز شاید ہی کر سکتا ہو۔

کلونت کور کا گاؤں یہاں سے بمشکل دو میل رہا ہوگا۔ میرے پاس ہمہ وقت پانچ گاڑیاں رہتی تھیں اور میں ان میں سے ہر گاڑی ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ مجھے دو ہی دنوں میں علم ہو گیا تھا

کہ عمر حیات کے ڈرائیور اول درجے کے چور اور بے ایمان تھے۔ان میں سے تین مسلمان اور دو سکھ تھے۔جھوٹے مرمتی ثبوت اور پٹرول اور ڈیزل کی چوری اور سب سے بڑھ کر شہر سے علاقے میں واپسی کے وقت جب وہ اکیلے ہوتے تھے، سواریاں لاد کر ان سے پیسے وصول کرنا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن چونکہ میرا کام ضرورت کے وقت تیار گاڑیاں مہیا کرنا تھا تو میں نے بھی اس طرف سے آنکھیں بند رکھیں۔شاید میرے لاشعور کے کسی تاریک گوشے میں یہ احساس ہمیشہ زندہ رہا کہ غریبوں کا خون نچوڑ کر اپنی دولت میں اضافہ کرنے والے اس جاگیردار کے ساتھ جو ہو رہا تھا، ٹھیک ہو رہا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔سردیاں ڈھل چکی تھیں اور سرسوں کی فصل کے پیلے پھول تا حد نظر ہلکی ہوا میں لہریں لے رہا تھا جب میں ریل کی پٹری پر چلتا کلونت کور کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔بس میں اُس سمت چل رہا تھا۔میرے ذہن میں آنے والی ساعتوں کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔مجھے علم نہیں تھا کہ میں کلونت کور سے کیسے رابطہ کروں گا یا اُسے کیسے پتہ چلے گا کہ میں اُس کے گاؤں پہنچ چکا ہوں۔ریل کی پٹری کچھ ہی دیر میں مجھے اُس ریلوے سٹیشن تک پہنچانے والی تھی جہاں میری کلونت سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ریلوے سٹیشن کی سرخ چھت والی عمارت مجھے جلد ہی دکھائی دینے لگی۔میں پٹری کے ساتھ چلتا رہا اور پھر دو قدم اُونچے پلیٹ فارم پر چڑھا۔

ریلوے سٹیشن پر اس وقت ایک اندھے فقیر، دو کتوں، دُور بیٹھا اپنی لال قمیص سے جوئیں نکال کر مارتا قلی اور ایک میلے کچیلے لباس والے انگریز کے سوا اور کوئی نہ تھا۔انگریز ایک سنگی بنچ پر بیٹھا تھا اور سگریٹ پیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔میں دوسری سنگی بنچ پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔میں نے فیصلہ کیا تھا کہ سگریٹ ختم ہوتے ہی گاؤں کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ریلوے سٹیشن پر پیپل کے دیوہیکل درخت قطار میں کھڑے تھے اور پٹری کے ساتھ ہی این ڈبلو آر کے مخفف والی پتھر یلی تختی بھی دکھائی دے رہی تھی۔میں سوچنے لگا اس وقت کلونت کور کہاں ہوگی؟ پھر میں نے دیکھا، انگریز اپنی جگہ سے اُٹھا اور نرم قدموں سے میری جانب بڑھنے لگا۔پہلے میں سمجھا شاید وہ ٹانگیں سیدھی کرنے کے خیال سے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے لیکن وہ میرے قریب رکا اور مسکرا کر بولا۔

''میں دو گھنٹوں سے یہاں ریل کا انتظار کر رہا ہوں اور تم پہلے انسان نما دکھائی دیئے ہو؟''

میں نے حیرت سے کہا۔

''انسان نما؟ وہ سامنے ایک قلی بھی تو بیٹھا ہے۔اس کے علاوہ ابھی یہاں سے تین چار دیہاتی ریلوے لائن پار کر کے سٹیشن کی دوسری طرف گئے ہیں۔''

انگریز ہنسا تو اُس کے ادھ کھائے دانت دیکھ کر مجھے بڑی کراہت محسوس ہوئی۔وہ بولا۔

''تم ان لوگوں کو انسان سمجھتے ہو؟''

ٹھنڈا غصہ میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور میں نے تلخی سے پوچھا۔

''انسان نہیں تو اور کون ہیں؟''

انگریز نے سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالا، ایک سگریٹ منتخب کیا اور بولا۔

''تم غصے میں آ گئے حالانکہ تمہیں ایسا کرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں تھی۔ہاں میں نیٹوز کو انسان نہیں سمجھتا۔سوائے چند ان کے جنہیں ہم نے انسان بنا دیا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ اس ادھیڑ عمر اور کمزور جثے والے انگریز کی گردن مروڑ کر وہیں ڈال دوں لیکن میں نے ایسا کرنے کے بجائے کھڑے ہو کر کہا۔

''جو نیٹوز تمہارے سامراجی ملک کو ڈیڑھ سو برس سے پال رہے ہیں، جن کی محنت پر تمہارے ملک کا ہر گھر دولت سے بھر گیا ہے، تمہیں انہیں انسان نہیں سمجھتے؟''

نفی میں سر ہلانے کا مطلب تھا کہ وہ ایسا ہی سمجھتا تھا۔اُس نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔

''ہر فاتح قوم کو حق ہے کہ وہ اپنے مفتوحین کو جیسا سمجھے، ویسا ہی بیان کرے۔''

میں نے کہا۔

''تو تم مجھے انسان سمجھتے ہو؟ شکریہ۔''

وہ ہنسا اور سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر بولا۔

''میں نے انسان نہیں، انسان نما کہا تھا۔''

میرا غصہ اب اندھیر ابن کر مجھے اندھا کر چکا تھا۔میں نے انگریز کا گریبان پکڑا اور نفرت سے کہا۔

''کتیا کے بچے۔اب تم نے ایک لفظ بھی کہا تھا میں تمہیں مار کے اسی ریلوے لائن پر ڈال دوں گا۔''

میری توقع کے عین برعکس انگریز نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔وہ مسلسل مسکراتا رہا اور اپنا گریبان نرمی سے چھڑا کر بولا۔

''احمقوں کا یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہے۔وہ دلیل کے جواب میں گریبان پکڑ لیتے ہیں۔بہر حال تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔میرے خیال میں ریل آ رہی ہے۔میں اُس کی آواز سن سکتا ہوں۔''

ریل کی آواز میں بھی سن سکتا تھا۔میں نے گھوم کر دیکھا۔بہت دُور سے اُڑتا دھواں بھی یہی کہتا تھا کہ ریل آ رہی تھی۔میں اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکنا چاہتا تھا۔میں جو اپنی محبوبہ سے ملنے نکلا تھا اس

انگریز سے لڑنے نہیں، اپنا موڈ درست کرنے میں مجھے شدید دشواری پیش آ رہی تھی۔میں چلا اور انگریز کی آواز پر رکا۔وہ بولا۔

''تم سے دوسری ملاقات جلد ہی ہوگی۔''

میں نے گھوم کر دیکھا اور زمین پر تھوک دیا۔میں ریل کی گڑگڑاہٹ محسوس کر سکتا تھا۔شاید وہ پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی لیکن میں نے گھوم کر نہیں دیکھا اور تیز قدموں نے کلونت کور کے گاؤں، چوروں والے پنڈ کی طرف بڑھنے لگا۔(جاری)

« • »

C/o: Dr. Rehana Iqbal
Hazara Road, Hasan Abdal
Dist. Attock 47000 Pakistan

اقبال حسن آزاد
کا
چوتھا
افسانوی مجموعہ
اوس کے موتی
زیر طبع

● نعیم بیگ

پیغام آفاقی: ایک تعارف

پیغام آفاقی اردو ادب کے ایک نابغہ روزگار شخصیت، بہتر ان انسان و ادیب و شاعر تھے۔('تھے' لکھتے ہوئے عجیب سا محسوس ہو رہا ہے)۔آج صبح ان کی رحلت پر ملال پر دنیائے اردو ادب میں ایک کہرام مچ چکا ہے۔جہاں ان کے خاندان اور ذاتی حلقہ احباب میں غمناک اور سوگوار فضا چھائی ہے وہیں حلقہ احباب ذوق لاہور پاکستان اور پروگریسو اردو رائٹرز اکیڈمی، عالمی فری لانس رائٹرز اور عالمی ہیومن رائٹس واچ کمیشن کے ممبر ہونے کے ناتے سے میں ذاتی طور پر اور ان عالمی اداروں کی طرف ان کے انتقال پر گہرے دکھ و رنج کا اظہار کرتا ہوں۔

پروگریسو اردو رائٹرز اکیڈمی کی انتظامیہ نے رسمی طور پر انکی رحلت پر تین دن کا سوگ منانے کا فیصلہ کیا ہے۔(وہ اکیڈمی کے ابتدائی قابل عزت و صد احترام معزز رکن تھے) آج سے تین دن تک اکیڈمی کی وال دیگر ادبی سرگرمیوں کے لئے بند رہے گی اور صرف محترم پیغام آفاقی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی خاطر وہ تمام ادبی فن پارے، تاثرات، تبصرے، مضامین جو پیغام آفاقی صاحب یا ان کے فن پر لکھے گئے ہیں وہی پیش کئے جائیں گے۔ممبران ان کی کتب سے اقتباس یا ان کے افسانے بھی پیش کر سکتے ہیں۔

اکیڈمی ان کے اعزاز میں تیسرے دن (سوموار کی شام) ایک تعزیتی اجتماعی اجلاس منعقد کرے گی جس میں معزز ممبران اکیڈمی و دیگر فورمز اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔جس کی صدارت ایک سنیئر ممبر اکیڈمی کریں گے ان کے نام کا اعلان بھی اُسی روز کر دیا جائے گا۔

تمام ممبران اکرام نوٹ فرمالیں۔

پیغام آفاقی صاحب کا مختصر تعارف

ان کا قلمی نام پیغام آفاقی جبکہ اصل نام اختر علی فاروقی تھا۔وہ ۱۹۵۶ء میں موضع چاپ، ضلع سیوان، بہار (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سیوان میں اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی جہاں انہوں نے انگریزی ادب میں بی۔اے۔آنرز اور تاریخ میں ایم۔اے۔کیا وہ مشہور زمانہ ادیب

قاضی عبدالستار و شہریار اور مورخ عرفان حبیب کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے زمانے میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لٹریری سوسائٹی کے سکریٹری رہے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے زمانے میں دو ناولٹ اور چند افسانے اور کچھ نظمیں لکھیں جنہیں زبردست پذیرائی ملی اور ان کے کچھ افسانے اور نظمیں موقر رسالوں جیسے 'آہنگ'، 'آہنگ' اور 'تحریک' وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ ان کی یہ ابتدائی تخلیقات اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انہوں نے ابتدا سے ہی ترقی پسند تحریک یا جدیدیت سے متاثر ہوئے بغیر اپنے لئے نئی راہ نکالی اور ان کی یہ روش آگے چل کر وہاں کے آزاد خیال نوجوانوں کے ایک کارواں میں تبدیل ہوگئی۔ طالب علمی دور کے بعد وہ کل ہند امتحان میں شریک ہوکر پولس سروس میں آگئے اور اس کے بعد وہ بیشتر دہلی میں مقیم رہے ہیں۔ اردو اور ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ان کی شہرہ آفاق حیثیت ان کے ناول 'مکان' کی اشاعت سے قائم ہوئی جس کے سر اردو ناول کی تجدید نو کا سہرا جاتا ہے۔

یہ ناول نہ صرف اردو میں ایک بڑی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے

بلکہ سنہ ۲۰۱۲ء میں اس کو امریکی حکومت کی مشہور ادبی تنظیم National Endowment for the Arts نے دنیا کے چند عظیم ناولوں کے طور پر منتخب کر کے امریکی عوام کے مطالعے کا حصہ بنانے کے لئے ترجمہ کا فیلوشپ دیا جو امریکی ادیب و شاعر Matt Reeck نے کیا ہے اور اس کے اقتباس مشہور امریک رسالہ LINESTWO نے بطور خاص شائع کیا۔ اس کے علاوہ یہ ناول فیمنزم کے موضوع پر دنیا کے چند اہم کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پیغام آفاقی کا دوسرا ناول 'پلیتہ' سنہ ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا جس کو مکان کی طرح ہی پذیرائی ملی ہے اور اسے بھی موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے منفرد تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'مافیا' کے نام سے بھی چھپ چکا ہے اور ان کا شعری مجموعہ 'درندہ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

قطعہ

فاضلِ علم و فن ہوئے رخصت
جن کا پیغام بھی تھا آفاقی
فکشن و ناول اور نقد و نظر
کام کیا نام بھی تھا آفاقی

۲۰ راگست ۲۰۱۶ سید انور جاوید ہاشمی

● محمد علم اللہ

آہ! پیغام آفاقی

حسرت رہی کہ 'تم' سے دوبارہ نہ مل سکا

اب کوئی شام نہیں آئے گی ان آنکھوں میں
تیری کرنوں نے جلا ڈالی ہیں پلکیں میری
پیغام آفاقی

پاکستان سے نوجوان ادیب باسط آزر کا میسج آیا ''ایک دوست سے علم ہوا کہ آپ سے پیغام آفاقی صاحب کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں، سو برائے مہربانی، اگر ان کے بارے میں ریسنٹ اپڈیٹ ہو تو آگاہ کیجئے گا'' آزر کی بات سے مجھے اس بات کا اندازہ ہی نہ ہوا کہ ان کے ریسنٹ اپڈیٹ سے کیا مراد ہے۔ میں نے بھی استفہامیہ انداز میں ریسنٹ اپڈیٹ کا مطلب؟ لکھ کر انھیں جوابی پیغام بھیجا۔ گویا میں خود جاننا چاہتا ہوں کہ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟۔ آفاقی صاحب کی بہادری، ہمت اور حوصلہ نے اس بات کا انداز ہی نہ ہونے دیا تھا کہ وہ بیمار تھے۔ حالانکہ انھیں کینسر جیسا مہلک مرض لاحق تھا، لیکن ان کے بہت سے قریبی دوستوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کی ایک کیمو تھراپی بھی ہو چکی ہے۔

ابھی باسط آزر کا جواب آیا نہیں تھا کہ میں نے فیس بک کھولا تو دیکھا آفاقی صاحب کے چاہنے والوں کی قطار لگی ہے، ان کے دوستوں اور عزیزوں کی صف کھڑی نظر آئی، جو ان کی صحت و عافیت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ پیغام آفاقی صاحب کے کینسر کے عارضہ میں مبتلا ہونے کی خبر سن کر ایسا لگا جیسے یہ بیماری مجھے لاحق ہوگئی ہے۔ میرے اندر خوف و ہراس کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پھر بھی خداوند قدوس کی ذات سے امید تھی کہ اللہ آفاقی صاحب کو ٹھیک کر دے گا اور وہ بہت جلد شفایاب ہو کر ہمارے درمیان موجود ہوں گے۔ مگر ''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے''۔

ع الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

انتقال کی خبر سن کر دل دکھ سے بھر گیا۔ ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھا کہ اب

آفاقی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ایک ہوک سی دل میں اٹھی اور جانے کیا کیا باتیں یاد آتی رہیں، دیر تک ان کے بارے میں سوچتا رہا، ان کا مسکراتا چہرہ، آنکھوں کے سامنے یوں پھرنے لگا جیسے اب آفاقی صاحب کوئی نئی داستان چھیڑنے والے ہیں، محفل جمی ہے اور سب ہمہ تن گوش بیٹھے ہیں۔ سخن سنجوں کو کیا پتہ تھا کہ داستان گو اتنی جلدی آناً فاناً سب کو مایوس و غمگسار چھوڑ کر، ہمیشہ کیلئے چلا جائے گا۔ نگری کے اس پار جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔ آفاقی صاحب نے ہمیں سوچنے کا بھی موقع نہیں دیا کہ ہم ان سے انھیں کے الفاظ میں کہتے۔

رات تاریک تر ہو رہی ہے، مٹ رہا ہے ستاروں کا جلوہ
ہو گئے غم کے بادل نمایاں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو
چھا گئی ہر شجر پہ اداسی، سو گئے آج بلبل کے نغمے
کر کے تم سارے گلشن کو ویراں، ٹھہرو ٹھہرو کہاں جا رہے ہو

آفاقی صاحب اس صدی کے ان قد آور لکھاریوں میں سے تھے، جن پر بجا طور پر زمانے کو ناز ہو سکتا ہے۔ میری ان سے فیس بک کے ذریعہ شناسائی ہوئی اور یہ شناسائی اس قدر بڑھی کہ میں ان سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا، کہ جس شخصیت کو میں نے محض کتابوں میں پڑھا، رسالوں اور اہل علم کے ذریعے سنا اور جانا ہے وہ شخصیت کیسی ہوگی؟۔ قریب سے جاننے کی جستجو بڑھ گئی اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ان سے ملاقات ہوئی اور وہ ملاقات یادوں کا درپن بن گئی۔ جب کسی شخصیت سے بالمشافہ ملاقات نہ ہوئی ہو تو اس شخصیت کا ایک ہیولہ ہمارے ذہن میں بن ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن میں بھی ایسا ہی کچھ اختر علی فاروقی المعروف پیغام آفاقی مرحوم کے تعلق سے تھا کہ پولس ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والا یہ افسر بھی شاید ہمارے ملک کے عام پولس والوں سے ملتا جلتا ہوگا، رویہ بھی ویسے ہی کرخت اور غصہ والا ہوگا وغیرہ۔

مگر جب ان تک رسائی ہوئی اور میں نے ان کو قریب سے دیکھا تو وہ کوئی اور ہی مرنجان مرنج قسم کی سدا بہار شخصیت تھی، علم و ادب کا ایک کوہ گراں، شفقت و محبت کا پیکر، باذوق، آرٹ اور فن کا پارکھ۔ ہمیں دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا اور سیدھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ چند منٹ بعد ہی انواع و اقسام کے ناشتے، چائے اور گفتگو کا دور شروع ہوا۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام، شام سے رات ہو گئی، ہم باتوں میں اس قدر محو ہوئے کہ گذرے وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ ادب کی جب بات نکلی تو آفاقی صاحب نے قدیم سے لے کر جدید اور اسلوب سے لے کر تکنیک تک پوری بساط بچھا دی۔

ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

تہذیب، تاریخ اور ثقافت کا تذکرہ ہوا تو کئی صدیوں کو آئینہ کر دیا، فلم اور اس کے تکنیک پر بات نکلی تو ایسی ایسی باریکیاں اور نکات پر گفتگو ہوتی رہی کہ مجھ جیسا طفل کتب محض سننے پر ہی اکتفا کر سکتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی صورتحال اور ان کے مسائل کا حل، آزادی کے بعد لٹریچر کا رول، ہندوستان پاکستان کے ادیب و شاعر۔ کہاں کیا تخلیق ہو رہا ہے؟ اس وقت کس قسم کے ادب کی ضرورت ہے؟ نوجوانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟، عمر رسیدہ افراد کو کیا کرنا چاہئے؟۔ ادیب اور شاعر کیا کر رہے ہیں اور ان کو کیا کرنا چاہئے؟ ایک وسیع جہان موضوعات تھا جس پر باتیں ہوتی رہیں۔ برسوں سے میرے ذہن میں پلنے والے انتشار، فلسفہ، تاریخ اور نہ جانے کن کن موضوعات کیا رے میں میرے الم غلم سوالات بھی تھے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ انھوں نے میرے سارے سوالات کے جوابات انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ دیے۔

آفاقی صاحب کو ان سے ملاقات سے قبل میں محض ادیب اور ایک سرکاری افسر کے طور پر جانتا تھا اور حیرت بھی کیا کرتا تھا کہ پولس ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والا بندہ ادب سے کیسے جڑ سکتا ہے کہ یہاں تو ''انیس خیس نہ لگ جائے آگینوں کو'' والی بات ہے، لیکن شوق، ہمت اور جستجو انسان سے کیا کچھ نہیں کروا دیتی۔ آفاقی صاحب ایک عمدہ نثر نگار کے ساتھ ساتھ خوش بیان شاعر بھی تھے۔ ملاقات کے دوران جب انھوں نے اپنا شعری مجموعہ درندہ میرے ہاتھوں میں تھمایا تو دبے لفظوں میں میں نے ان سے کہا'' آپ نے اس کا نام 'درندہ' کیوں رکھا یہ تو انتہائی غیر شاعرانہ نام ہے؟''

تو آفاقی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا کہ اسی لئے تو یہ نام رکھا ہے، پھر وضاحت کی کہ دراصل یہ استعارہ ہے 'رقیب' کا۔

پیغام صاحب ادب میں پروپیگنڈا کے شدید مخالف تھے۔ اعزاز و انعام کو انھوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ ان کا ماننا تھا کہ ادیب کا اصل اعزاز اس کے قارئین ہیں۔ ان کے ناول کے سلسلے میں میں نے کہا کہ آپ اس کو پن گوئن یا آکسفورڈ جیسے کسی بڑے ادارے سے کیوں نہیں چھپواتے؟ تو انھوں نے کہا کہ اچھے پکوان کی خوشبو خود بخود دور تک پھیلتی جاتی ہے، اس کے لئے بڑے ہوٹل اور خوشنما بورڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا میں تو چاہتا ہوں میری کتاب گلی اور نکڑ میں چھپنے والے دونکے کے کاغذ میں چھپے، لیکن لوگ اس کو پڑھیں، اس سے بڑھ کر کسی اور چیز میں مجھے خوشی نہیں مل سکتی۔

آفاقی صاحب محض ایک اچھے ادیب ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ تھے، کتوں کے مشفق اور مربی، شاید ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے لوگ ان کے اسیر تھے، جس کا اندازہ ہند و پاک سمیت پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ان کی محبین، شاگردوں اور عزیزوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

آفاقی صاحب کو فلم اور آرٹ سے بھی بے حد دلچسپی تھی اس سلسلہ میں جے این یو سمیت کئی اداروں میں ان کا لیکچر انتہائی دلچسپی کے ساتھ سنا جاتا تھا، وہ جے این یو کے مہمان اساتذہ میں شامل تھے۔ انھوں نے ٹیلیوژن سیریل کی ہدایت کاری بھی کی تھی، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ وہ ماس کمیونی کیشن کے طالب علم تھے اور نہ ہی کبھی کسی فلم کی کوئی تربیت لی تھی، اس کے برعکس فلم کیطلبہ کو پڑھایا اور کئی ایسی تیمیں تیار کر دیں جو مختلف چینلوں اور میڈیا صنعت میں کام کر رہی ہیں۔ آفاقی صاحب نے اس کا قصہ کچھ یوں سنایا تھا۔

جب انھوں نے ناول لکھا تو اس کی بہت دھوم مچی، اسی درمیان ان کے ذہن میں فلم بنانے کا خیال آیا، لیکن جب انھوں نے اس خیال کو پکانا شروع کیا تو اس نے مستقل ایک سیریل کا روپ دھار لیا۔ انھیں دنوں دور درشن میں ڈائریکٹروں سے ٹینڈر طلب کیا گیا تھا کہ وہ اپنے پروپوزل ڈالیں، اتفاق سے انھوں نے پروپوزل ڈالا اور وہ پاس ہو گیا۔ لیکن پاس ہونے کے بعد سرد خانہ کا شکار رہا، کام جمع کرنے کی تاریخ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی، خیال آیا کسی ڈائریکٹر سے بات کر کے کام کرا لیا جائے، کیے بعد دیگرے کئی ڈائریکٹروں سے بات کی گئی، لیکن ان کے مزاج اور طبیعت پر کوئی ڈائریکٹر کھرا نہ اترا۔ آخر کار انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اس کو ڈائریکٹ کریں گے، اسکرپٹ لکھیں گے اور خود ہی ایڈٹ کرائیں گے۔ کئی مہینوں کی انتھک محنت اور مطالعہ سے انھوں نے ساونڈ، لائٹ، اسکرپٹنگ، ڈیزائننگ، میک اپ، سیٹ سازی پر معروف کتابیں منگائیں اور ساری کتابیں چاٹ ڈالیں، اپنے گھر کے بالا خانہ کو اسٹوڈیو بنایا اور کام شروع ہو گیا۔ ایکٹر، آرٹسٹ کی تلاش شروع ہوئی تو فیس اور ان کے نخرے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر انھوں نے نئی پیڑھی کو اس فن میں اتارنے کا فیصلہ کیا اور نوجوانوں کو اداکاری، مکالمہ اور جملوں کے زیر و بم سے متعارف کرانے لگے، یوں بہت جلد انھوں نے ایک ٹیم تیار کر لی اور سیریل بھی بن کر تیار ہو گیا، ان کے بقول اس سیریل میں کوئی بڑا یا چھوٹا اداکار نہیں تھا جو پہلے کہیں کام کر چکا ہو بلکہ سب کے سب ان کے ذریعہ ٹرینڈ کئے گئے نوجوان تھے، لیکن اس کے باوجود سیریل انتہائی کامیاب رہا اور لوگوں نے کافی پذیرائی کی۔ سیریل کا نام ''ٹوٹنے کے بعد'' تھا۔

آفاقی صاحب کی یہ بہت بڑی خصوصیت تھی کہ وہ نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کیا کرتے۔ خود میرے کئی افسانوں پر انھوں نے کئی مفید مشورے دئے۔ میں نے ان سے ایک مرتبہ مطالعہ کے لئے کچھ کتابوں کی نشاندہی کی گذارش کی تو انھوں نے کہا۔ پڑھنے سے زیادہ سوچنے اور سوچ کو لکھ ڈالنے پر توجہ دیں، آپ رائٹر ہیں پروفیسر نہیں، اور لکھنے کے لئے خیالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوچنے کی عادت ہی آپ کو بتاتی جائے گی کہ کیا پڑھنے کی ضرورت ہے ورنہ دنیا میں اچھی کتابیں اتنی ہیں کہ کئی عمریں گذر جائیں۔

ہمارے ہاں اردو ادیبوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے مصنفین کی کتابوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے، حالانکہ اس سے بہر حال قوت مشاہدہ اور فکر و فن میں اضافہ ہوتا ہے۔ آفاقی صاحب ایک اچھے قلم کار کے لئے دیگر زبانوں پر عبور کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے، اس کے لئے انھوں نے اکیسویں صدی فکشن کے تحت ایک ٹرانسلیشن اکیڈمی بھی تشکیل دی تھی، جس کا ایک صفحہ بھی فیس ٹیک پر بنایا تھا، وہ مجھے مستقل اس کے ایڈمن بن جانے پر ضد کرتے رہے، لیکن میں نے ان سے کہا وہاں تو خود ہی بڑے بڑے ماہرین زبان و ادب موجود ہیں میں اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا نہیں کر سکوں گا، تو انھوں نے مجھے سخت لفظوں میں سرزنش کرتے ہوئے کہا تھا، اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔ اور انگریزی کی چند سطریں (1) میں تحریر کی تھیں۔

خوف آپ کو کبھی بھی کامیاب نہ ہونے دے گا۔ پھر ہم خوف کیوں کھائیں۔ نتیجے دو ہی نکل سکتے ہیں یا تو ہم کامیاب ہو کر سرخرو ہوں گے یا پھر ناکام ہو جائیں گے۔ دونوں چیلنجوں کا زندگی کے ہر میدان میں مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہیے۔ پھر آپ محسوس کریں گے کہ دنیا آپ کی مٹھی میں ہے۔ انھوں نے مجھے آئی ایس کی تیاری کے لئے بھی کئی مرتبہ ابھارا، وہ اس وقت بھی ایسی ہی عزم و ہمت دلانے والے کلمات سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے، ان کا کہنا تھا پہلے جاب سیکیور کیجئے پھر چاہے جتنا چاہیں لکھیں۔

انگریزی اور دیگر زبانوں کے ادب سے انھیں اچھی واقفیت تھی۔ بات بات میں وہ اپنے سامعین یا قارئین کو موٹے موٹے نام لیکر مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہوں نے چیخوف، ہیگو، شیکسپیر، جیسے نابغہ روزگاروں کو پڑھا ہی نہیں بلکہ گھول کر پیا ہے۔

علی گڑھ اور ان کی یادوں کا بڑے دلچسپ انداز میں دیر تک تذکرہ کرتے۔ میری ان سے جب ملاقات ہوئی تو اور چیزوں کے علاوہ علی گڑھ سے متعلق بھی انھوں نے بہت ساری چیزیں بتائیں۔ کہنے لگے:

جب وہ علی گڑھ گئے تو انگریزی آنرس میں داخلہ لے لیا۔ لٹریچر کی کلاس بڑی مشکل محسوس ہوتی تھی کہ اس کے استعارات اور تشبیہات سے واقفیت نہ تھی، پھر انگریزی کے کچھ معروف ناولوں کو اٹھایا اور اسکے ترجمے، چند ہفتہ میں سارے پڑھ ڈالے اس سے اصطلاحات اور مفہوم کو سمجھنے میں کافی مدد ملی اور پھر وہ اس کلاس کے ٹاپر ثابت ہوئے۔

آفاقی صاحب دراصل ایک مہم جو شخص تھے جو کسی بھی چیز کو ایک مہم کے طور پر لیتے اور اس کو پورا کر کے چھوڑتے۔ میرے خیال میں ہر کامیاب آدمی کا ایسا ہی رویہ رہتا ہوگا۔ اس کے بغیر کامیابی شاذ ہی ملتی ہے۔

ناول کے مصنف کو تخلیق کار اس لئے کہا جانا چاہئے کہ وہ انسانی کردار تخلیق کرتا ہے اور ان

کرداروں کے لئے معاشرہ تخلیق کرتا ہے اور یہ تخلیقات اتنی توانا ہوتی ہیں اور ان کے اندر پنپنے کی ایسی طاقت پنہاں ہوتی ہے کہ اگلے موسموں میں وہی معاشرے کی شکل میں زمین پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں...... بلاشبہ آفاقی صاحب جسمانی طور پر ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن جب تک اردو ادب زندہ ہے ان کا پیغام آفاقی اور سنہری حروف میں نیر وتاباں رہے گا۔ اور ان کی فکر اگلے موسموں میں بھی گل کھلاتی رہے گی۔ بقول اقبال:

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

☆☆☆

حاشیہ

(1) انگریزی اقتباس جو آفاقی صاحب نے 7 جون 2015 رات آٹھ بجکر آٹھارہ منٹ پر فیس بک انباکس میں مجھے ارسال کیا۔

◂◂ ● ▸▸

E-26 Abulfazal Enclave,
Jamia Nagar, Okhla New Delhi. 110025
Mob No. : +91 9911701772

نام رسالہ: ہندستانی زبان (ممبئی)	نام رسالہ: زبان وادب
مدیر اعلی : سید علی عباس	مدیر : مشتاق احمد نوری
اشاعت: جولائی رستمبر ۲۰۱۶ء	اشاعت: جولائی ۲۰۱۶ء
قیمت: ۲۰ روپے	قیمت: ۱۰ روپے
صفحات: ۸۰	صفحات: ۸۰
ملنے کا پتہ: مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ نیتا جی سبھاش روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۲	ملنے کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چو ہٹہ اشوک راج پتھ پٹنہ

● سید عمران بلخی

Towards understanding of novel "Makan" as case study

The review on novel Makan in Urdu and English of a unique writer who stands quite distinguished globally and makes Urdu stand comfortable in literary galaxy and horizon of world literature

The emerging strong writers like Rahman Abbas get equally induced by his novels as he gets induced with Milan Kundra and Franz Kafka his recent Novel Rohzin is an example One can read my review on my time line wall and at Rahman Abbas time line he copied and posted The creator of Makan is well known as Paigham Aafaqi

To me English translation is not the very close translation as Novel is much more deeper in original Urdu "Makan"

Unfortunately most of the time Urdu criticism is using cylindrical vision limiting the field and wide angled peripheral vision is totally unseen I do not understand how come this literary retinitis pigmentation blocks the literary vision.

That is why I raise the similar issues in my paradigm shift writes.

I am keeping more focus to the original Urdu Novel as Translation has to be further improvised to catch the letter and sprit

Makan ... A case study

Human action is a kind of magic, an astonishing ability to think of something and thereby make it happen. ... have one property we don't often appreciate in the cognitive toolkit of the standard ... Consider that magical act of turning on the light .

A writer is a human design engineer. The literature is an intuitive technology

We create literature through literary technology...

We write the write, a process is involved, further this process requires tools and technology to happen. The writer minds the mind through it's write for him literature is the tool he crafts and drafts the society and society thus is nothing but reflection of literature.

The good and unique element of literary product is it's time lessness and space lessnes it creates time , it creates space it fits into time and space it gels into both and it generates the time and space of it's own it is free from Time and space hold although writer lives in an era and a geography and his writings or writes are in an era and a geography. He remains in a boundary of time and space but he is boundary less and beyond time and space

His characters and narrative cant be hold, the engineering he does may create the boundaries of space and time it has flexibility and control.

In order to graph these all an understanding of literary creation is a must

Let us take Novel Makan and explore further.

TOWARDS UNDERSTANDING OF NOVEL.

What goes on when we hold a novel in our hand?

Generally following actions can be witnessed as they come in place.

1) We touch and feel, if the book is hard print and if it is PDF soft print than visually we get kinesthetic feel i.e. we see cover, see side notes and move to commentary.

We try to touch in a glance. Want to know and feel what exist within. Want to quench the query that comes in mind and get convinced that novel is worth reading.

We ensure that It is surely packed with stuff that needs the time and energy and Requires the internal and external intellectual presence and further it will add value to life.

We try to find what is there in it for me or us. So we do the initial

surface surfing.

We do the glance reading.

We Turn the pages around and smell the pages if it is hard copy we allow our eyes to become our kinesthetic sense receptors. We build a preliminary opinion about Novel.

2) Reading the commentary or having preoccupied Information regarding writer or novel or both, and based on preliminary conceptions which may be raw perception of the Novel first thing that we do is take decision to read now.

We decide when to read or what should be the timing, also we prioritise our reading i.e. we started doing programming of our self, fixing a programming that enables us to make our self understand how to deal with novel and what level of interpersonal relationship is to be developed with writer and the novel.

We sublimely programme our selves to manage The absorption of the energy that will emerge from the text, content, narrative and the treatment.

3) The content, text and narration lead us towards involvement. It is the reader and his own developed literacy level, along with his literary knowledge that under goes with the representation that novel has of the reality.(As words or sentences that text and narration have, are only mere representation of reality not the reality itself e.g. if narration has description of pain, the pain does not exist in reality but representation of pain exist.

The representation may induce pain to reader if it has forceful or effective representation, the agony may be felt and this induction creates involvement.)

4) As the involvement starts the complexities start such as reprogramming of when and how starts. Here comes the neurology the postures the body and mind management. As novel is unique form of creation which gives individuality to literature.

It is not a movie or any other form of art that holds the reader and asks them to stay at a particular place or frame of time and further requires more continuity.

Novel can be read in disruption in breaks in discontinuity at the readers pace and convenience. Nothing will disrupt the .reading. Once the involvement comes things get more easier. The reading experience becomes pleasure full. even in disruption and discontinuity.

The disruption rather leads to processing and reprocessing of the representations and the information based on representation goes more deeper to the level of understanding sublimely.

5) As the understanding starts getting developed, the neurology gets programmed by the linguistics that a content, text and narrative has.

The neurology such as excitement, relaxation, worry, anxiety, phobia, enchantment, exclamations, adornment, appreciations, pleasure, gloom, sorrow, apathy, empathy etc. can be seen when reading of novel is in progress as the induction takes place encountered with the believe that reader has.

For example If in any novel a character is an atheist, and the description represent the detail of forceful denial of God and His statements.

If the narrative packed with logics and rational narrations continually mocks God and the build up in the text is the narration against theistic believes, then, if the reader is a nonbeliever he will enjoy and feel pleasure as he sees the character as one of them but if the reader is a believer each representation will hurt him deep.

He or She will have conflict and that will induce grief in him.

If the character is highly assertive and representation of his reality is extremely forceful then the reader who is a believer may feel deeper anxiety and it may be that he abandons the reading totally and further he can develop hate relationship with the character , with the representation of reality in the text and with the narration and it may be that he starts

hating the creator of that character i.e. the novelist itself.

As writings of Salman Rushdie are seen by many Readers, because it confronts to the believes of many readers, We witnessed in past that The conflict raised the religious ,social and political issues around the world too, and resultantly he had the bounty on his head.

Similarly the issues dealing with taboos and morality will create a particular neurology of the individual or of society or masses.

6) As the novel is continued with reading, the established neurological involvement, impact the reader psyche.

The neurology further creates the psychology, the level of transformation depends on the forcefulness, effectiveness and assertiveness of the novel. It is all based on Configuration, Formulation, Structure, Architecture, the Social Engineering and behavioural order that novel has.

The representation of reality in a novel works sublimely to induce change. The novel makes the change in the internal system of the reader through the deeper structure these all together and in totality catalyses the configuration, formulations and in process actions that do the Human Design Engineering.

7) As the reading or re reading of Novel goes on, the deeper structure, starts playing its role. The reader experiences transformed structure from surface structure of the content, text and narrations of the novel emerges the deeper structure giving sense, meanings, perceptions ,thoughts and neuronal development.

Surface structure makes the reader move to the deeper structure the understanding goes at the level of thought creation and psyche development, and thus the psychology is developed.

As the psychology is developed it further grooms perception which is totally personal as it comes from personal system intelligence.

And as the novel gets further processed within, the common perception is developed which comes from collective social intelligence.

The change occurs, these created effects and cause that caused the change bring transformation that transcend in biology. The visible change will appear in the biological behaviour of the reader or groups of reader.

8) As the Biology starts getting development the change in biological system or order occurs.

Which ultimately develops the belief.

The information on biological change due to a text, narration, or the content can be traced back from Avicenna days.

The work of "Ibn-e-sina" and other psychiatrist till modern days assert the role of lingual text and narration.

This becomes the basis of the believe that the biology creates.

As it starts developing individual believe based on individual perceptive psychology and individual system intelligence and collective believe based on common perceptive psychology the social intelligences develops the mass psychology and collective consciousness.

Thus the collective and individual biological phenomena and social behaviour is witnessed by society and community .

This way The social engineering is done by the novel the society takes shapes.

Thus the society emerges as the image of literature society is the reflection of literature not the vice versa.

As we go from one to eight points stated above the process flow of understanding of novel is evidently clear.

All eight points are step of the process map of the reading, understanding and adopting process of novel. It is clearly demonstrating the process of human design engineering being done through a novel.

The reader that has gone through the process of reading makes the journey of understanding and adopting of a novel and he witnesses the novel as an instrument of social change. To the reader Now the role of Novel is more clear. He or she is more demanding now.

The reverse process equally holds true i.e. The believes creates biology. The biology creates psychology and the psychology creates neurology and further neurology creates representation of experience either in real or virtual world. So the reverse Human Design Engineering also takes place.

A well groom novel is masterly crafted to do these two functions simultaneously.

The reading of the Well groomed novel is bit complex as too many things go in parallel such as understanding of the process and process of understanding they both move parallel, the narrative and floats of diction at one hand and the growth of character and narrations that works for development on the other hand establishes the two vectors,

As in physics law of parallelogram of vectors give a resultant vector similarly these two work in a well groomed novel too. The two vectors that I identified may have two different inclined communication Angles but resultantly a third vector of perception emerges due to these vectors .

Effective communication through these human design engineering are the master design development that evolves in superior communication.

A well groom novel clearly works to get the desired outcome of human design engineering based on communication .

The author is the human design engineer he sets it's deliverables at his own discretion.

The design comes to perfection when character achieve eternity and become immortal.

The whole phenomenon has three plane where these vectors work. The three planes are 1)conscious, 2)subconscious, and 3)unconscious.

Now the phonetics ,the imagery, the narrative play role in trance-formation as they stimulate senses the treatment, the presentation,

the configuration of text, and the linguistics all develop the character along with the narrative and plot. As character gets developed it develops the narrative simultaneously .

Meanings come from pre recorded sensual perception stored at all the three planes.

The Words and sentences as they are mere representation of reality not the reality itself work as guide so they (Conscious, Sub conscious and Unconscious) choose the most relevant meaning.

Here it is important to recall that all comes through the resultant vector the two identified vectors. above work to do the required engineering and re engineering or the reverse engineering.

As these come to existence and clarity of communication is established, the transformation takes place, it can be internal or external, It can be experienced in virtual or real frame it can create neurology or psychology it all depends on impact that reader takes or absorbs And the force and energy that the resultant vector has.

The whole process can go through reverse engineering and here comes the interchangeability.

The well groomed novel do all these with great ease.

The author Is the architect of the human design engineering who dose the social engineering through his novel. The human design architecture becomes the basis of structural design development of text, narrative and content. Based on this human design engineering is also done by the author.

As the author plays various role in creation of the well groomed novel he is seen as agile and proactive craftsman.

He is compelled to do so because he has to create a master piece through his writing.

This is his desired out come. Greater the conviction the greater are the results.

Novel "makan" a case study:

Now let us go back to Makan why the writer questions the integrity of the various structures of novels and why he wants to get his own novel and its structures to go for integrity audits? As he is sure of its quality he insists on qualitative evaluation.

The well grown writer do not. Compromise with quality. They ensure it is designed safely as the impact of well groomed novel is like enormous energy accumulated at an epicenter. It can give tremors and jerks.

The Stored energy in a novel if channelized can be the Source Of power (as geothermal energy can be tamed into power grid) so can be the Energy stored in a well groomed novel.

It is the. Moral responsibility of the author to deliver the quality product to society and individuals.

The critiques have moral obligation to do the quality audit of the process and the products in order to identify improvement.

As quality is to continually improve so criticism is dynamic and not stationary function in literature.

Both process and the product design are the dynamic function of creative writing so is the quality audit in literature.

Now as we know that The Stored energy if channelized can be the Source Of power (as geothermal energy can be tamed into power grid) so can be the Energy stored in a well groomed novel. this can work to stimulate social change and give empowerment to underprivileged and have-nots.

In "Makan" the traceability of empowerment exist in its characters.

Both process and the product design are the dynamic function of creative writing so is the quality audit in literature done through critical analysis dynamically on established quality criteria .

No creation is same it can be similar so is the critical study and analysis how is it possible to do same analysis for different creations in

such cases. If it happens then either criticism is bias or the critics are bias.

It is very difficult to understand that without establishing criteria how on the basis of merely superficial comparison the creations are evaluated and just junked or put as junk.

Each time as I think to write on merits and quality of any creation, each time I have to establish the Design criteria before I evaluate the product.

Some of the Design criteria for critical analysis of "Makan" on Pentagon vectors.

1. The design Shall justify the nomenclature and symbolizations
2. The design Shall demonstrate the. Justification of treatment
3. The design Shall justify the narrative and the development
4. The design Shall demonstrate and provide evidential support to establish that no character is overdone and are part of social structure to lead desired social engineering.
5. The design Shall have defined human design architecture and shall formulate basis of social engineering done through these human design architecture.

Now we will get Pentagon of vectors each will be the Resultant of the vectors discussed above at the start and here in this novel("Makan") in order to get the impact analysis and to get quantum of energy that can accumulate and develop concentrative value that further can stimulate change.

We will have to work out resultant vector the focused perception, as in physics and dynamics we apply Pentagon of vectors so here too we will have to do for the impact analysis.

The vectors have to be quantified and directionally identified and be dimensional on the parameters of social engineering dynamics.

As per the evaluation criteria requirement in "makan" the feminine energy and masculine chauvinism will be predictive elements of these social engineering dynamics at surface. Has the deeper structure

grown to the level of struggle of oppressed.

Has it gone to the level of community clash, class struggle community survival effort and other human struggle and survival phenomenon? Are these the deeper structure of the narration and text along with the content of the novel demonstrate the universal demand?.

The validation of design on the developed design criteria.

1. The design Shall justify the nomenclature and symbolizations

The name of Novel is Makan. which means a dwelling place for a family which can be termed as smallest unit of society and can be extended to or elongated and exaggerated to the various symbol as larger as universe and space and as small as house.

In case of space if the space is identified as "Makan" then the story of "Makan" will be struggle of earth dwellers and the aliens. The occupier of "Makan" Kumar can be any alien civilization and Neera will be symbol of defender or struggler to get the control and possession back, she will be the symbol of existing world civilization of Human race. In this case surely the character Neera becomes the representational figure as the defender of "Makan" i.e. the earth and So she symbolizes herself as the world civilization under occupancy of the Alien who intend to throw out the real inheritors of the earth like Kumar tries to do with Neera in "Makan"..

The occupier Kumar can be any nation who intend to throw out the original citizen and Neera will be representing the defender nation. Neera can be the red Indian or the aborigines the "Makan" can be the story of formation of USA or can be story of post colonial Modern Australia. It can be the story of Ireland Neera being symbol of Irelanders can be seen as struggle symbol.

Neera can be.the representation of oppressed communities such as Indian Muslims, Pakistani Hindus, Shias or Ismailies or Qadianies or other minority groups or community or communities continually being threatened and oppressed by some crazy majority leadership or group or

religious fanatic group who are working to throw them out or forcing them to live as second class citizen making them remain aloof to nation growth and development and they further want them to be eliminated from India or Pakistan kumar will be the representation of crazy majority leadership or group or fanatic religious group.

The struggle and fight between Kumar and Neera can be the representation of conflict of civilization and it goes deeper to war on terror making contemporarily relevant. The Novel is crafted in such nomenclatures and symbolization that it has multi dimensional expansion and multilateral process of expansion. All these are rooted and knitted in the narrative and text and the content of the novel. It can be easily observed with a paradigm shift .

Neera can be Tamilian of Sri Lanka or the oppressed minority community of Mayamar. Neera can be seen in middle east and can be symbol of struggle against oppression in Middle East. This justify the nomenclature and symbolization.

2. The design Shall demonstrate the Justification of treatment

The Treatment of text content and the narration are well justified in "makan" as nothing ambiguous exist. it goes on with great fictional clarity. The Environment ,Ecology, Neurology, Psychological conditioning and neuro linguistic programming the reasoning and cause and effect narrative all are treated well with a unique language which is very different than other contemporary or pre and post "Makan" Novels. None can have doubt the treatment in novel and interface between the narration text and content is well woven balanced and in equilibrium. As the novel has extension arms so it was the treatment which if would have failed would have done catastrophe as the novel has been handled by the human design engineering expert his familiarity with processes (specially fictional induction process and multilateral process) and the control required through treatment eliminates the danger of shabby treatment and faulty discourses. To know it more one has to be with the novel with a

different paradigm. light is only seen when one gets to the various dimensional self.

3. The design Shall justify the narrative and the development

As the language and the grammar of "Makan" is very different totally non existential not like earlier it is working on simple parts of speech like it has abstract nouns and concrete nouns it has masterly played the verbs to be noun and also same goes to verbs that helps the design and crafts become a masterly craft so the language of "Makan" is unique it works to represent internal and external destructions distortions abrasions and further reconstruction alignments and clarity beyond the surface structure of representation through deeper structure of representation so the narrative development had the danger to get astray but it did not happen its development gives the float and matches to the character and environment of the novel.

At the state where in novel Alok gets transformation through fictional induction of the key Character Neera there was the danger that philosophical narration may do distortion of the text as well as narrative but it did not happen and narration remain intact with same laminar flow through the orifice of narration to craft the required development throughout the narrative the design was maintained with balance and equilibrium.Such display of craftsmanship and expertise of Human Design Engineering is adorable.

It influences the reader as well as the character which does the fictional induction within and outside the novel it induces the mind of the reader and fictional induction goes to the state where expansion becomes evident and novel turns to be symbol of struggle between oppressor and oppressed haves and have-nots where basic right is encroached and has to be fought back to have it back. So novel has justification and it justifies the narrative and the development.

4. The design Shall demonstrate and provide evidential support to establish that no character is overdone and are part of social structure to

lead desired social engineering.

Each character in the novel be it Neera or her cousin Soniya, Alok Ashok, the occupier Kumar and Nayer are the representation of reality they are magically realized and are at their balance which maintain the equilibrium and even minor characters are nicely trimmed and shaped.

The grafting and crafting is such that if any character would have been developed beyond its proportion the essence of novel would have endangered itself of losing its control as one character balances the other so Alok, Neera and Soniya cannot be enlarged nor the Ashok and Kumar in the novel. The supportive characters equally play their role in generating balancing and equilibriums..

The danger was to manage the energy and energy zone of the characters so if in any novel any character if ever overdone than the energy that it carries is either leaked or explodes. It is analogous to the phenomenon of nuclear power station there is always a danger of radiation blast if it is not in a control environment.

The characters in a novel are to be handled with same caution which they are been done in short stories if they are not micro managed than they cling to enlargement over shadowing the support characters.

In order to elaborate I will let you recall the Film Sholey where Salim Jawed had over done the character of Gabbar every child remembers his dialogue and the character Jay and Veeru are marginalized including the pivotal character of Thakur. very few remember their dialogues.

The script of Sholey was well knitted even the minor charecters had havey explosive energy.

As a film requires a single character or characters to be overdone and magnified in order to be hit or super hit but if it would have been written other than the cinematic script say as novel it would have been having the fate of a mediocre novel but as a film it was a super hit when scripted. It happened because that is the requirement of a film script so

over done characters create hype and hype generates viewer ship which produces money for film makers it makes sense there in script but same becomes unpleasant experience in novel craft.

So and Similarly the super novels has to create balance and equilibrium not the magnification or not allowing to let the character be overdone.

"Makan" had endangered itself several time in the course of development to be seduced to character enlargement and being overdone because it was carrying the high consolidated energy of influence but one can see the balance when suggestively described about the transformation of Neera into an influencer from a non influencer.

The management of transformation by eliminating the danger of explosion of transformation is laid in the novel for intellectual visions and through these character management the novel expands beyond character without being over done as the symbolization goes from individual to Mankind.

The reincarnation of Neera remained normal the Metamorphosis that she had remained normal too and every aspects were balanced that was the equilibrium required to make it superb. Here the master craftsmanship and Human design engineering expertise of the author can be seen.

5. The design Shall have defined human design architecture and shall formulate basis of social engineering done through these human design architecture.

The human design Architecture is from very beginning well defined narrative symmetry and asymmetry had balance narration the narrative interiors and details were well done the lingual landscape was well developed in the plot. The story had well crafted aesthetics and sensual experiences were transmitted with well developed social colors.

The way the story grows the society gets nude in the eye of the reader. He or she hates and loves the character and become the part of

novel. Here is the involvement that works for fictional induction process. The narrative magic is fully demonstrated as the human values and life philosophies are seen in character development. The social change and the individual influence that makes the change and the loops of change along with the chain reaction and the counter reaction in behaviorism of characters raises the human design structure to the required elevation slowly turning the experiences of characters into universal experiences.

The Human design architecture expands and story elongates from individual to society from society to societies from individual to social community from communities to nation and nation to globe. The transition is so smooth. simple sentences that even a eighth grader will easily understand is the master craftsmanship. The magical realism enchants and mesmerizes the reader. Philosophical induction done through surrealistic disclosers is again unique which adds the enchantment as the human design architecture develops in the novel.

The metamorphosed character Neera by sitting on the metamorphic rock making herself a part of the panorama leads the merger to the earth scenario like global geopolitical transformations transitions and fair and fault plays being the part of whole. She incites and inspire to link her part of story to the entire earth here architecture of the novel creates larger human design.

The way Neera coops with her hostile environment turns negatives to positives. She transforms negation to affirmation. She builds optimism and hope out of pessimism and cynicism which is the design prospective and it is the core of future discourse by which the human design Architecture gets further validated.

The paradigm Shift in reading..

Now as we have gone through the process of understanding of Novel through "Makan" we see that a paradigm shift makes the difference. Neither the fiction writers are in the frame of past nor the reader they both are dynamic entity now. And now in the era of

information explosion vast development in communication technology the spinning energy of knowledge that is embedded into the reader mind and body behaviorism has a different discourse of the novel reading and its understanding. It is not simple now. A well groom novel develops the reader plane and now the readership demands more value inF the literary product.

The demand is to know the complexities of the existing culture ,identities, geopolitical scenario, larger designs and the self, the Human and the Subhuman and Super Human within a Human. The focus is Humanity. The cry is more for quality literature and literary leadership. The requirement to that leadership is to lead to solutions and change management. The writers have to play their role in such demanding situation.

The literary creation has to be original and authentic catering to demand a formula based writing or mirror image of a craft and appearance of photocopying of the popular creations are no more taken to be a product that has the value engineering. The critiques have the role too they have to lead the reader to develop readership quality as well as demand the requirement compliance from the writer. The collaborative leadership of critique and the writer is the need of the world we live in.

Mediocre literature is a junk literature now. We will have to think twice before we pen them Now.

« ● »

C/o Zeba Imran Balkhi
A-5 Flat No: 401 Al-Madina Complex
Millatnagar Lokhandwal
Andheri West Mumbai-400053

● رقیہ نبی

ناول ''مکان'' کی نیرا کے ساتھ جذباتی ومعاشرتی تشدد اور اس کا تخلیقی ردعمل

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ عورت کو ضعیف الجنس اور ناقص العقل سمجھ کر زمانہ قدیم ہی سے اس کا استحصال کیا جاتا رہا ہے، اسے دوسرے درجے کی مخلوق بھی قرار دیا گیا۔ گھر ہو یا گھر سے باہر کی دنیا سماج کے استحصالی رویوں اور تشدد سے کسی نہ کسی طور اب بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ان کے حقوق کے لیے آوازیں اُٹھنے لگیں تو بہت حد تک اس کی حالت میں سدھار آیا لیکن تشدد اب بھی جاری ہے، ہاں صرف اس کے طریقے بدل گیے ہیں۔

اُردو ادب کی بات کی جائے تو یہاں دیگر سماجی برائیوں کی طرح عورت پر ہو رہے تشدد کو نظم سے زیادہ نثری ادب کے ذریعے سامنے لایا گیا۔ اور نثری ادب میں ناول ایک ایسی صنف ہے جس میں صنف نازک کی زندگی اور اس کے ساتھ ہو رہے تشدد کو بہترین طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی عورت سے متعلق ان گوشوں سے پردہ اُٹھایا گیا، جہاں عورت کی تخریب کے پیچھے کارفرما عوامل واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اردو ناول نے عورت کی بھلائی کے لیے انتہا درجے کی برائیوں کی جڑ تک ہماری رسائی ممکن بنائی۔ جہاں ہمیں سماج میں پل رہی برائیوں سے نفرت تو ہوتی ہے لیکن اس عورت سے ہمدردی کا جذبہ اُمڈ آتا ہے جو ان برائیوں سے جڑی ہیں یا جسے ہم ان برائیوں کی وجہ سمجھنے لگے تھے۔ جیسے رسوا کی امراؤ جان ادا، عصمت کی معصومہ، قدسیہ، شمن، خدیجہ مستور کی عالیہ، چغتائی وغیرہ۔ ان سب میں ہمیں تشدد کی مخالفت ملتی ہے لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد پیغام آفاقی اپنا شہکار ناول 'مکان' لکھتے ہیں جس میں 'نیرا' تشدد کی مخالفت کرتی نظر نہیں آتی بلکہ وہ تشدد میں پنہاں توانائی کو اپنے لیے توانائی کے سرچشمے میں تبدیل کر لیتی ہے۔ دیکھا جائے تو ناول 'مکان' کا پورا تخلیقی نظام اس کے مرکزی کردار کی انفرادی خصوصیت پر کھڑا ہے۔ نیرا کے تشدد کے خلاف ردعمل پر ڈاکٹر مولا بخش لکھتے ہیں:

''مکان کی ہیروئن نیرا فلمی قسم کی بغاوت سے کوسوں دور ہے بلکہ وہ عورت کی جملہ خصوصیتوں کو لیے ہوئے اکیسویں صدی کی ایک ایسی لڑکی نظر آتی ہے۔ جس کے انقلاب میں چیخ نہیں آج کی نیو کلیائی اور برقی ذہن کی کارفرمائی ہے۔ نیرا کی شکل میں عورت کا ساختیہ پیشتر ناولوں سے یکسر منفرد دکھائی دیتا ہے۔۔۔ نیرا جو میڈیکل کی طالبہ کی صورت میں پیش کی جاتی ہے، ڈاکٹر تو نہیں بن پاتی۔ مگر اپنے عصر کا ڈاکٹر ضرور بن جاتی ہے اور تہذیب انسانی کا پارکھ ضرور بن جاتی ہے۔ اگر کمزور ناول نگار ہوتا تو اس ناول کا نام نیرا ہی رکھتا۔ آفاقی صاحب کے اس کردار کو اردو کا منفرد اور اچھوتا کردار کہا جا سکتا ہے اور ناول کا ایک موضوع عورت کے اندر کی بے پناہ صلاحیتوں کا اظہار بھی قرار دیا جا سکتا ہے جسے مزید نئے امکانات سے ہمکنار کرنا اس ناول کا مقصد ہے۔!

اردو ناول کا معیار اور مکان، ص ۶۲، مشمولہ مکان، بن اشاعت اول ۲۰۰۴

اس ناول کے پہلے ہی باب میں یہ صورتحال اُبھرتی ہے کہ نیرا کا باپ مر گیا ہے، جوں ہی وہ اکیلی ہو جاتی ہے تو کرایہ دار 'نمار' نے اس کے عورت ہونے کو اس کی کمزوری سمجھ کر مکان ہڑپنے کی سازشیں رچی اور جیسا کہ فطری بات ہے 'نیرا' مدد کے لیے اپنے جاننے والوں کے پاس جاتی ہے، جہاں اس کو مدد نہیں ملتی۔ لیکن وہ اس کے بعد نہ روتی گڑگڑاتی ہے نہ قوت مدافعت کھو کر بیٹھ جاتی ہے۔ بلکہ اس کی چشم بصیرت روشن ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میں نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا وہ سب کچھ ٹوٹ کر گر چکا ہے اور اب جو کچھ دکھائی دے رہا ہے یہی میرا مکان ہے، مجھے اب اپنے مکان کا دوڑ دوڑ کر، چھو چھو کر ،اور اس کی دیواروں کی ان دیکھی دوریوں کا سفر طے کر کے ان کا از سر نو ادراک کرنا پڑے گا''ع مکان، ص ۶۰۔ بن اشاعت ۱۹۸۹

یہی سے نیرا کے اور مکان کے اندر نیرا کے مدرکہ نظام کی ایک ایسی انجینئرنگ شروع ہوتی ہے جس کا رُخ اس قلب ماہیت کی طرف ہے جو مسلسل نیرا کو زندگی کی عملی اور تخلیقی بصیرت کے مدارج سے گزارتی ہے اور وہ ایک ایسے عمل پر گامزن ہوتی ہے جس میں کوئی دھند نہیں ہے۔ اس سے آگے قدم قدم پر پورا ناول اسی طرح کے ردعمل کی داستان ہے۔ بار بار اس کے ذہن پر صرف اسی وجہ سے گہری چوٹ لگتی ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور ہر شخص اس کو اسی نظر سے دیکھتے ہوئے اس کی ذات اور اس کی جائیداد کا استحصال کرنے کی نیت اور کوشش کرتا ہے۔ اور ہر بار وہ ایسی چوٹ سے بصیرت اور طاقت اخذ کر کے اپنے کو مضبوط

ترکرتی جاتی ہے۔وہ دوسرے کرداروں سے یوں مختلف ہے کہ وہ تشدد کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ تشدد میں پنہاں توانائی کو اپنے لیے توانائی کے سرچشمے میں تبدیل کرلیتی ہے۔اس لیے وہ اس سلسلے میں کسی سے شکوہ کرتی نظر نہیں آتی بلکہ وہ کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے اور جب سمجھنے لگتی ہے کہ اس تشدد سے بچنا ہے تو اس کائنات کو سمجھنا ضروری ہے، جس میں وہ پیدا ہوئی ہے اور اس کائنات کے ساتھ اس کا رشتہ وہی ہونا چاہیئے جو ایک سائنسداں کا ہوتا ہے۔یہاں پہنچنے کے بعد تشدد کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہونے لگتا ہے۔نیرا کے تشدد کے خلاف ردعمل کے تعلق سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''کمار اور نیرا کے مابین جدو جہد اور احتجاجی رویوں کی سرگزشت کا نام مکان ہے۔اس جدو جہد میں اپنے ایقان، صداقت،موت سے بے خوفی اور استقامت کیکے ذریعے نیرا کامیاب ہو جاتی ہے۔غالبًا پہلی بار کسی ناول نگار نے ایک ایسا کردار دیا ہے جو ہر قوت کے مقابلے میں زیادہ قوت ور نکلا۔بالخصوص نسوانی کردار کو اتنی مضبوطیاورا ستقلال کے رنگ میں رنگ کر شاید پہلی بار پیش کیا ہے۔''۳

اردو ناول کے اسالیب،ص ۳۰۵۔سن اشاعت ۲۰۰۶

ناول مکان کی نیرا کہیں بھی دنیا کے لوگوں کے رحم وکرم اور انصاف وغیرہ جیسے جذبات وخیالات پر بھروسہ نہیں کرتی۔وہ اپنے مشاہدوں اور تجربوں کے بعد اس جال سے پوری طرح باہر نکل آئی ہے اور ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں اشیا کے درمیان مضبوط اور کمزور کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے،یعنی وہ معاشرے کو اس طرح دیکھتی ہے جیسے وہ ایک پیڑ ہو یا کوئی مشین ہو جس کے تمام پرزے یکساں طور پر اہم ہوتے ہیں اور معاملہ صرف اپنی اہمیت اور دوسروں کی فطرت کو پہچاننے کا رہ جاتا ہے۔پندرہ ابواب پر مشتمل ناول مکان کے تیسرے ہی باب میں نیرا کے خلاف مختلف زیادتیاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن حواس باختہ ہونے کے بجائے وہ ان زیادتیوں کے پیچھے چھپی ہوئی ذہنیت کا تجزیہ شروع کر دیتی ہے اور تجزیہ کرنے کا یہ عمل آگے چل کر اس قدر مربوط اور مختلف الجہات ہو جاتا ہے کہ ناول کے آگے کے ابواب میں وہ کمار کے اوپر ذہنی طور پر بھاری پڑنے لگتی ہے اور کمار کے وہ حربے ناکام ہونے لگتے ہیں جو اس مفروضے پر قائم ہیں کہ نیرا ایک عام انسان اور عورت ہے اور اس کا ردعمل وہی ہوگا جو ایک عام انسان یا عورت کا ہوتا ہے۔اور اب اس کا ٹکراؤ نیرا کی بصیرت سے ہوتا ہے۔نیرا کے اندر موجود resistance اس پر ہو رہے حملوں کو مسمار کر دیتی ہیں اور پھر پوری خود اعتمادی کے ساتھ وہ آگے بڑھ جاتی ہے:

''تم سمجھتے ہو کہ میں ایک کمزور انسان ہوں، میں عورت ہوں۔میں ایک سمندر ہوں

کہ جس میں پورا کا پورا پہاڑ غرقاب ہو سکتا ہے لیکن میں جو کچھ اپنے اندر سہتی ہوں اس سے نئی چیزیں جنم لیتی ہیں۔میں کوکھ ہوں، میرے اندر جو عکس پیدا ہوتا ہے وہ محض خیال نہیں ہوتا۔۴ ناول مکان،ص ۸۰

نیرا پر ہو رہی ذیادتیوں کے سلسلے میں جب نیرا حسب دستور تھانے میں شکایت لکھوانے جاتی ہے تو اس کی حوصلہ شکنی کی نیت سے جو کمار اور پولیس افسر کی سازشوں کا حصہ ہے، اس سے انتظار کروایا جاتا ہے لیکن تجزیہ سے جو بصیرت کی روشنی نیرا کو حاصل ہوتی ہے اس سے وہ اس بات کا بھانپ جاتی ہے اور تھانے سے اُٹھ کر واپس چلی آتی ہے۔وہ تھانے میں بیٹھ کر سوچنے لگتی ہے:

''میں انتظار کر رہی ہوں یا وہ انتظار کروا رہا ہے؟۔۔۔میں یہاں کیوں ہوں؟ تاخیر ہونے کے باوجود یہاں کیوں رکی ہوئی ہوں؟ اور یہ میری طرف توجہ کیوں نہیں دے رہا ہے؟ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے اور اسے یقین ہے کہ میں اس لیے اس کا مجبوراً انتظار کروں گی کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور وہ مجھ سے جتنی دیر تک چاہے انتظار کروا سکتا ہے اور پھر جیسے یکایک ہی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔''۵ ناول 'مکان'،ص ۵۳

آگے چل کر نیرا مدد کے لیے عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹاتی ہے لیکن عدالتوں کی حقیقت کو سمجھتے بھی اس کو دیر نہیں لگتی۔اس کے علاوہ اس سے ایک مخلص انسان 'الوک' سے بھی جو ایک پولیس افسر ہے ذہنی و جذباتی مدد ملتی ہے۔لیکن مافیائی داؤ پیچ اُسے بھی چھین لیتے ہیں۔یہ واقعہ نیرا کے لیے کچھ ایسا تھا جیسے وہ کسی اونچے چٹان سے پھسل پڑی۔اس کے اندر ایک بھونچال آتا ہے لیکن یہ بھونچال جس طرح آیا تھا اُسی طرح چلا بھی جاتا ہے اور نیرا اس واقعے کے اندر سے بھی روشنی دریافت کر کے نکلتی ہے:

''اگر اشوک نے الوک کو مجھ سے چھین لیا تو کیا ہوا؟ اس نیرا کو کون چھین سکتا ہے جو چراغ بن کر میرے اندر جل رہی ہے۔۔۔الوک ہی کیا جب میرے اندر الوک جیسے انسانوں کو بجا دینے والا مضراب ہوگا تو میری زندگی کے اردگرد ایک کیا پچاسوں الوک پیدا ہوں گے۔کون ہے جس کے اندر ایک الوک نہیں۔۔۔اس دنیا میں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں انسان ہیں جو اس الوک کی طرح ہے اس سے میں پہلی بار آفس میں ملی تھی۔اور اگر ان کے دل پر جمی ہوئی گرد کی پتھریلی چٹانوں میں بارودی سرنگیں بچھا کر کوئی نیرا دھماکہ کرے تو چٹانیں گرد بن کر اُڑ جائیں گی اور ہر الوک کے

اندر سے ایک نیا آلوک نکلے گا۔''٦ ناول مکان، ص ٣٩٦

یہی وہ مقام ہے جہاں اس کے اندر ایک نہایت گہری جذباتی، ذہنی اور روحانی تبدیلی جنم لیتی ہے، جو ایک رزمیہ کی سی وسعت رکھتی ہے اور اس پورے عمل سے گزر کر ایک ایسی شخصیت تعمیر ہو جاتی ہے جس کے سامنے وہ ساری چالیں، وہ سارے رویے، وہ سارے فلسفے بیکار ہو جاتے ہیں جو عورت کو یا کسی بھی کمزور انسان یا قوم یا طبقے کو استحصال کے عمل میں تھکا دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔

نیرا کے حوصلے کو توڑنے کے لیے کمار اور اس کی بیوی آشا نیرا کی دماغی تناؤ اور دل کی مریض ماں کو پریشان کرتے ہیں، مار پیٹ پر اتر آتے ہیں لیکن نیرا کا ردعمل وہ نہیں ہے جو ایک عام انسان کا ہوتا ہے۔ نیرا کا ردعمل حیرت انگیز اور چونکانے والا ہے۔ ایک ایسا ردعمل جو کسی روایتی اخلاقیات کا پابند نہیں۔ وہ اپنی سوچ کو مزید آگے بڑھاتی ہے:

> ''ماں ماں ہی رہے، چاہے زندہ یا مردہ۔ لیکن اس نئے رشتے کو میں تسلیم نہیں کروں گی جس میں انہیں تالا بنا کر میری کلائیوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہ خطرہ کہ میری ماں مر جائے گی کمار کے ہاتھ میں ایک تالے کی طرح ہے جو وہ میری کلائیوں میں ڈالے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ماں ماں نہیں رہ جاتی اور اس سے میرا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔''٧ ناول مکان، ص ١٧١

دراصل نیرا نے ایک لڑائی کو جو معاشرتی، مالی اور جسمانی طاقت کی بنیاد پر لڑی جا رہی تھی، ایک ذہنی جنگ میں تبدیل کر دیا اور یہ فلسفہ سامنے لے کر آ گئی کہ ذہنی طور پر دنیا کے سارے انسان برابر ہیں۔ نیرا نے زندگی کا یہ عملیاور جنگی فلسفہ کسی کتاب، کسی دوسرے کردار یا گرو سے نہیں سیکھا بلکہ اس نے کارگہ حیات میں عملی طور پر شریک ہو کر اس کی ایجاد خود کی۔ اس کے لیے وہ جن جن نشیب و فراز سے گزری وہ سفر یقیناً بے حد جانکار تھا لیکن اس نے اس سفر کو مسئلہ سمجھا ہی نہیں۔ کیوں کہ وہ دراصل پوری کائنات کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھ لینا چاہتی تھی، کچھ اس طرح کہ وہ اس مقام پر پہنچ جائے جس کا اظہار اس نے ناول کے آخری پیراگراف میں کیا ہے:

> ''کائنات ان پہاڑی وادیوں کی طرح ہے۔ تم اپنی جگہ بدلتی ہو تو تمہارے لئے اس کی شکل بدل جاتی ہے۔ تم اس کے قدموں تلے آؤ گی تو یہ تم کو کچل دے گی۔ تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ گی تو یہ تم کو زندگی کی بلندیوں کی سیر کرائے گی۔''٨
>
> ناول مکان، ص ٤٣١

مکان کی یہ ہیروئن شروع میں ویسی ہی ایک عام عورت ہے جیسی عموماً عورتیں ہوتی ہیں اور دور تک اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو ایک روایتی عورت کے ساتھ رکھا جاتا ہے لیکن آخری منزل تک پہنچتے ہوئے مطلع صاف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے رویئے کے سبب ایک چیلنج بن چکی ہے۔ ١٩٨٩ء میں شائع ہونے والے اس ناول کی ہیروئن نے وہ انقلاب برپا کیا ہے کہ اب زندگی کے ہر مقام پر دس بیس نیرائیں مل ہی جائیں گی۔ دراصل ادب محض سماج کا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ سماج بھی بڑے ادب کا آئین ہوتا ہے یعنی آج کا بڑا ادب کل کا معاشرہ بن جاتا ہے۔ یہ بھی محض ایک روایتی طریقۂ فکر تھا کہ بہتوں نے نیرا کو ایک عورت کے طور پر دیکھا جب کہ دراصل نیرا ایسے تمام کمزور انسانوں کی ہیروئن ہے جن پر تشدد ہوتا ہے اور جن کا استحصال ہوتا ہے۔ ادب کا یہ روایتی رویہ کہ اگر عورت میں کوئی غیر معمولی صلاحیت دیکھی جائے تو یوں کہا جاتا ہے کہ اس نے ''عورت ہو کر'' ایسا کام کر دکھایا، دراصل ایک محدود سوچ ہے۔ جس طرح عورت کمپوٹر چلا سکتی ہے، نیٹ پر کام کر سکتی ہے۔ اُسی طرح معاشرے میں اپنی جنگ بھی لڑ سکتی ہے۔

ادب کے ٹھیکے داروں کو یہ چسکا لگا ہے کہ وہ ایسے مضامین لکھیں اور قارئین کو پیش کریں جس میں عورت کی مظلومیت کی لذت ہو۔ لیکن مکان کی نیرا اس لذت سے پاک ہے۔ مکان کے پہلے اور بعد میں بھی ناولوں میں عورت کا بہادر کردار پیش کیا گیا ہے لیکن نیرا کی پہچان یہ نہیں کہ وہ بہادر ہے بلکہ اس کی پہچان یہ ہے کہ وہ انجینئر ہے۔ پیغام آفاقی نے بہت ہی تخلیقی تدابیر سے کام لیتے ہوئے ایک ایسے کردار کو زندگی کی یہ مہم سونپی، جو میڈکل کی طالبہ ہے۔ ایک سائنسی ذہن رکھنے والا کردار، غیر جذباتی کردار جسے مسئلے کو جذبات سے باہر آ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ معاشرتی اور جذباتی تشدد کے تئیں نیرا کا ردعمل مختلف ہے۔

«●»

PHD Reserch Scholar
Moulana Azad National
University, Hyedrabad

● پیغام آفاقی

جمیلہ کا وجود

جمیلہ نے کب خواب دیکھا تھا کہ اس کی آواز ریڈیو اور ٹی۔وی۔ پر نہ صرف اپنا سکہ جمالے گی بلکہ کروڑوں سامعین اور زندہ خبروں کے درمیان کھڑی اپنے لہجے کا بامعنی استعمال کر کے جدید ترین دنیا کے سب سے طاقتور ذریعہ ترسیل کو اپنی شخصیت کا اس طرح حصہ بنالے گی کہ اس کی آواز کے بغیر نیوز پھیکی دکھنے لگے گی۔ بہار کے اس دور دراز گاؤں میں پیدا ہونے والی اس آواز اور پروقار چہرے کی صلاحیت کو تو دراصل اس نوجوان نے ہی پہچانا تھا۔

وہ نوجوان خود بھی کم نہ تھا۔ کامرس کی کون سی کتاب تھی جو اس کے ؟ے مشکل تھی۔ کتابوں کو تو اس نے کبھی کوئی مسئلہ ہی نہ سمجھا۔ اور آسمانوں پر کمند ڈالنے کا خواب اس کی گھٹی میں تھا۔ میڈیا پر اس کی نظر تھی۔ جمیلہ کو دیکھتے ہی اس کو خیال آیا تھا کی اپنی اور جمیلہ کی جوڑی کو وہ ایک بہت بڑی طاقت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ بینک میں ایک بڑی ملازمت ملتے ہی اس نے جمیلہ سے شادی کر لی۔

جمیلہ سے شادی طے ہوتے ہی اس نے پلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کیا کیا کرے گا۔ جمیلہ ذہین تھی، خوبصورت تھی۔ اور سب سے بڑھ کر خود اعتمادی سے بھرپور تھی۔ اس نے جب جمیلہ کو بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ کا امتحان دینے کے لئے کہا تو جمیلہ کے اندر انکور پھوٹنے لگے۔ ایک ایسا شوہر ملنا اس کے قسمت کی بات تھی جو شوہر اس کے ماحول کی قدامت پرستی سے اس کو ہاتھ پکڑ کر باہر لے جانے کے لئے تیار تھا۔ جمیلہ نے اپنے گھر کے اندر سے ہی کتابوں کے زور پر بی۔اے۔ کا امتحان دیا۔ نتیجہ چونکانے والا تھا۔ وہ کالج میں اول آئی تھی۔

شہاب کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے جو سوچا تھا وہ سچ تھا۔ ایم۔اے۔ کے امتحان میں بھی جمیلہ اول آئی۔ یہ شہاب کے لئے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس کو تو اب یہ فکر لگی تھی کہ پٹنہ سے دلی کب پہنچے۔ وہ اپنے پٹنہ سے دلی کے تبادلے کی کوشش میں لگ گیا۔ اور اس دوران اس نے گھر میں ناولوں اور کہانیوں کی ڈھیر لگا دی۔

ایک دن وہ جمیلہ کو ریڈیو اسٹیشن لے گیا۔ وہاں وہ پروڈیوسر سے بات کر کے آیا تھا۔ وہاں جمیلہ کا آڈیشن ہوا۔ ریڈیو پر جمیلہ کی خوبصورت آواز نے فوراً ہی اپنی جگہ بنالی۔ وہاں کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے

شہاب کو مبارکباد دی اور اس بات کا اعتراف کیا کہ جمیلہ کی آواز نے وہاں کے ریڈیو اسٹیشن کے ماحول میں ایک نیا رنگ گھول دیا ہے۔ لیکن جس وقت وہ شہاب کو مبارکباد دے رہے تھے، شہاب کے کانوں میں جمیلہ کی آواز دوردرشن ٹی۔وی۔ سے ابھرتی سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر اس آواز کے ساتھ ہی جمیلہ کا چہرہ اسکرین پر ابھرا اور ملک کی کروڑوں نظریں خبروں کے سلوٹ کے دوران جمیلہ پر مرکوز ہو گئیں اور جمیلہ کے ساتھ دوردرشن کو وہ چہرہ مل گیا جس کی اس میں کمی تھی۔

دہلی کا تبادلہ ہوتے ہی شہاب اس کو لے کر منڈیہ ہاؤس پہنچا۔ جمیلہ کے ساتھ پٹنہ ریڈیو پر نیوز پڑھنے کے سرٹیفکیٹ تھے جو صرف اس کی فائل میں نہیں تھے بلکہ اس کے چہرے پر بھی دکھ رہے تھے۔ دہلی میں دریا کی طغیانی سمندر میں اتر چکی تھی۔ جمیلہ کو اندازہ ہونے لگا کہ یہاں کامیابی کے لئے صرف آواز اور چہرہ کافی نہیں تھے۔ لیکن اسے اپنی شخصیت کی طاقت کا بھی اندازہ تھا۔ اس نے ٹھان لیا کہ وہ کسی اور چیز کا سہارا نہیں لے گی۔

شہاب کو جو کامرس کا طالب علم رہ چکا تھا اور بنک میں ملازمت کرتا تھا یہ محسوس کرتے دیر نہیں لگی کہ عارضی طور پر نیوز پڑھنے کا کام ایک مزدوری جیسا تھا۔ اور جمیلہ جہاں پہنچی تھی وہاں مزید کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ اصل پیسہ تو سیریل اور دوسرے پروگرام بنانے میں تھا۔ اس پیسے کے سامنے تو بنک سے ملنے والی تنخواہ بھی کچھ نہیں تھی۔ اب اس کو اپنی نوکری اور جمیلہ کی نیوز ریڈنگ دونوں میں کمی دکھنے لگی۔ وہ دوردرشن پر سیریل پاس کروانے کے خواب دیکھنے لگا لیکن تجربے کی کمی کی وجہ سے اسے سیریل پاس کروانے میں کامیابی نہیں ملی۔ اس نے دوسروں کے سیریلوں میں جمیلہ کے لئے اینکر کا کام ڈھونڈ لیا۔

دہلی کی سیڑھیاں ذرا اونچی اونچی، دشوار اور پیچیدہ تھیں۔ لیکن چڑھنے والے چڑھ رہے تھے۔ شہاب نے جمیلہ کا داخلہ جے۔این۔یو۔ میں ایم فل میں کروایا۔ اور کتابوں اور رسالوں کی ڈھیر لگا دی۔ جمیلہ کو اپنے کیریر میں شہاب کا اس طرح ہاتھ پکڑ کر آگے لے جانا، جگہ جگہ اہم لوگوں سے اس کا تعارف کروانا، دشوار گزار راہوں سے آسانی سے لے کر گزر جانا، ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کی صلاحیت کے اظہار کے لئے مواقع پیدا کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اس کو اتنا اچھا شوہر ملا۔ اس نے شہاب کے بازوؤں میں وہ سب کچھ پا لیا تھا جس کی وہ تمنا کر سکتی تھی۔

شہاب نے اب بلندی کی دوسری گلیاں اور سیڑھیاں بھی دیکھ لی تھیں۔ بلند و بالا عمارتیں، قیمتی فلیٹس، کاریں، ہوٹلوں کے کھانے۔ یہ سب گویا اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے گھر میں ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی آمد بھی ہو چکی تھی۔ ایک مکمل خوبصورت فیملی بن چکی تھی۔ اب صرف ادھورے خوابوں کو پورا کرنا تھا۔ جمیلہ دل و جان سے شہاب پر فدا تھی۔ شہاب کی فکر پرور آنکھوں سے اسے بے حد پیار تھا۔ وہ کیا کیا نہیں سوچتا

تھا۔ کہاں کہاں نہیں جاتا۔ روز ایک نئے ارادے سے گھر سے نکلتا۔ اور شام تک کچھ نہ کچھ لے کر لوٹتا۔

ادھر جمیلہ نے بھی گھر کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں اور شہاب کے مالی منصوبوں میں حتی الامکان شرکت کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مالی ضرورتیں کئی طرف سے سر اٹھا رہی تھیں۔ بچوں کے اخراجات، مکان کا کرایہ، کوئی اپنا مکان لینے کے لئے پیسوں کی ضرورت، گھر میں کام کرنے کے لئے کمپیوٹر ٹیبل، ساتھ آنے جانے کے لئے کار۔ جمیلہ آمدنی والے کسی بھی کام سے انکار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ریڈیو اور ٹی۔وی۔ پر زیادہ سے زیادہ کام، سیریلوں میں اینکرنگ، اس کے لئے جگہ جگہ انٹرویو کے لئے جانا، بچوں کے لئے کھانا بنا کر جانا، اپنا کھانا ساتھ لے کر جانا۔ ادھر شہاب نے بھی جمیلہ کو ہر طرح سے آگے بڑھانے کی ٹھان لی تھی۔ اس کی پڑھنے میں مدد کرنا، لکھنے میں مدد کرنا۔ کبھی اسے یونیورسٹی چھوڑنا یا اسے لانا۔ کبھی ریڈیو اسٹیشن چھوڑنا یا اسے وہاں سے لانا۔

شہاب نے جمیلہ کے نام سے دوردرشن میں ایک دوسرا پروجکٹ بھی ڈال رکھا تھا۔ مل ملا کر سیریل پاس ہو گیا۔ پانچ دس لاکھ کا فایدہ کہیں نہیں گیا تھا۔ جمیلہ اینکرنگ کرلے گی۔ وہ کسی ٹیکنیشین کو لے کر شوٹ کر لے گا۔ پندرہ بیس دنوں کا کام تھا۔ باقی ایڈیٹنگ تو وہ خود دن رات محنت کر کرا کے کر لے گا۔ لیکن جب یہ سیریل بننے لگا تو جمیلہ کو اس میں مزہ نہیں آیا۔ وہ مشہور لوگوں سے خوبصورتی کے ساتھ بات تو کر لیتی تھی لیکن اس میں وہ شان کہاں تھی جو کروڑوں لوگوں کی ٹکی ہوئی نگاہوں کو اسکرین پر مخاطب کرنے اور ان کی توجہ کو اپنی شخصیت کی کشش سے باندھے رکھنے میں تھی۔ اس کو اپنے چہرے اور لہجے اور آواز کی طاقت کا پورا احساس تھا اور جب وہ نیوز پڑھتی تھی تو اسے اپنے بام عروج پر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ اس کو اپنے وجود کو دنیا کے ذریعے تسلیم کئے جانے پر ناز تھا۔ یہ سب کچھ اس کا اپنا تھا۔ اس میں کسی کا شیئر نہیں تھا۔ اس مرتبے کی وہ تن تنہا مالک تھی۔ جو چیزیں اس کو پیدائشی طور پر ملی تھیں اس کا یہ خالص مظاہرہ تھا۔ اور یہ سب سچ تھا، ایک ایسا سچ جس میں کسی ملاوٹ کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ تھی۔ صرف وہ۔ صرف جمیلہ۔ یہ سب کچھ ایک نام سے پہچانا جاتا تھا اور وہ نام تھا جمیلہ۔ اس اظہار سے جو مسرت کے چشمے اس کے اندر پھوٹے وہ اسے مزید نکھارنے لگے اور اس کے اس نئے کنفیڈنس نے اس کی شخصیت کو ایک سیلیبریٹی میں تبدیل کر دیا۔ وہ جہاں جاتی، جہاں بیٹھتی لوگ اس کا احترام کرتے۔ زندگی میں حاصل کئے ہوئے اس مقام سے وہ مکمل طور پر مطمئن تھی۔ اس کے مقابلے میں ان انٹرویوز میں کیا تھا جہاں صرف کیمرے اور ٹیکنیشینوں کی موجودگی میں لوگوں سے سوال کر کے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے مائکروفون پر ان کی آواز ریکارڈ کرتی تھی اور کیمرے پر اس کا چہرہ بھی نہیں آتا تھا۔ وہاں نیوز میں وہ دنیا کو بتاتی تھی اور دنیا سنتی تھی۔ ایسی بڑی بڑی خبریں کہ لوگ سنانے میں آ کر اس کے چہرے سے نظریں تک نہیں ہٹاتے تھے۔

نیوز کے چند منٹ جمیلہ کی زندگی کا وہ جنون بن گئے تھے کہ نیوز پر جانے کا ایک موقع بھی وہ

چھوڑنا نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ وہ اس کا ایک پر سرور نشہ بن چکا تھا۔ یہ ٹی۔وی۔ کا وہ مقبول اسکرین ہی تھا جس کی وجہ سے اسکے نام سے کروڑوں لوگ واقف تھے۔ اور وہ گمنامی کے اندھیرے میں جینے والوں کی طرح نہیں تھی۔ اور بات صرف نیوز کی نہیں تھی کہ نیوز تو اور بھی لوگ پڑھتے تھے، بات اس کی دلنشیں آواز اور دلکش چہرے کی تھی جس کا دنیا بغیر کچھ بولے معترف تھی۔

شہاب کی سوچ مختلف تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ وہاں نیوز میں جمیلہ کو ایک نیوز پڑھنے کے صرف پانچ سو روپئے ملتے تھے۔ اور یہاں اتنی دیر میں جمیلہ تیس ہزار کا کام کرتی تھی۔ اونچی اونچی عمارتوں کے درمیان کوئی فلیٹ لینے کے لئے پانچ سو روپئے سے کیا ہونے والا تھا۔ صرف پانچ سو روپئے۔ اور چھوڑنے کون جاتا ہے؟ بینک کا ایک سینئر منیجر۔ ٹھیک ٹھاک پیسہ آ تو گیا تھا۔ اب کیا ضرورت تھی وہاں کام کرنے کی پانچ سو روپئے کے لئے۔

حسین و جمیل جمیلہ اپنی بہت ساری خانگی معاملات میں الجھ ضرور گئی تھی لیکن یہ سب اسے بہت آسان لگ رہا تھا۔ کیونکہ وہ جو سب سے بڑا خواب دیکھ سکتی تھی، اور جو خواب دوسروں کے لئے ایک ناقابل حصول خواب ہو سکتا تھا، وہ پورا ہو چکا تھا، کروڑوں انسانوں کی نظروں میں ماہ کامل کی طرح دکھائی دینے کا۔ وہ کسی ایسی لڑکی سے زیادہ الگ نہیں تھی جو کسی سپر ہٹ فلم کی ہیروئن بن گئی ہو۔ یہ اطمینان اس سے مشکل سے مشکل خانگی مشغولیات کو برداشت کروانے کے لئے کافی تھا۔

سیریل بننے کے بعد جب پیسہ آیا تو شہاب نے ایک بار پھر اپنے گھریلو معاملات سے لیکر نوکری اور جمیلہ کی مصروفیات پر از سر نو غور کیا۔ جمیلہ لکچرر ہو جاتی تو بہتر تھا۔ اچھی تنخواہ، یونیورسٹی کا مکان، یہ سب کچھ بہت ٹھوس بنیاد بن سکتا تھا مزید آگے بڑھنے کے لئے۔ اور اس بنیاد کے مضبوط ہوتے ہی وہ اپنی نوکری سے آزاد ہو کر سیریل اور فلمیں بنانے کے اپنے نجی خواب بھی پورا کر سکتا تھا۔ اسے بھی نام کا شوق تھا۔ ایک افسر کو کتنے لوگ جانتے ہیں۔ سیریل کا ڈائرکٹر اور فلم پروڈیوسر ہونے کی بات ہی اور تھی۔ نہ جانے کتنی تمنائیں ابھی تک اس کے اندر چھپی ہوئی کروٹیں لے رہی تھیں۔ اب منزل بس تھوڑی ہی دوری پر دکھ رہی تھی۔ جمیلہ کے لکچرر بننے کے لئے کچھ ریسرچ اور کچھ لکھنا پڑھنا ضروری تھا۔ اگر وہ چند ادبی کتابیں لکھ دیتی تو یہ اس کو لکچرر کے پوسٹ کی مستحق بنا سکتی تھیں۔ پانچ سو روپئے کے لئے نیوز پڑھنا تضیع اوقات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے سوچا۔ جمیلہ نے ان دنوں میں کچھ بہت اچھے مضامین لکھے تھے جب ابھی شاہد اور رفیعہ کی پیدائش نہیں ہوئی تھی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد پانچ چھ سال یوں ہی ضائع ہو گئے۔ لیکن اگر وہ دوبارہ پڑھنا لکھنا شروع کر دیتی ہے تو ریسرچ بھی آسانی سے کر لے گی اور کچھ کتابیں بھی تیار ہو جائیں گی۔

اور اب جمیلہ کی ٹی۔وی۔ اور ریڈیو کی مشغولیت کی وجہ سے یہی کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ جمیلہ کی

مقبولیت کی وجہ سے اسے زیادہ سے زیادہ کام ملنے لگا تھا۔ شروع میں ہفتے میں ایک بار موقع ملتا تھا۔ اس کے بعد تین بار ملنے لگا اور اب پانچ بار ملنے لگا تھا۔ آفس کے اندر مقابلہ آرائی بھی شروع ہو گئی تھی کیونکہ اب عارضی طور پر کام کرنے والوں کو مستقل کرنے کے احکامات بھی آ گئے تھے۔ اور اب اچھی نیوز پڑھنے والی لڑکیوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ جمیلہ با اخلاق اور ذمہ دار سمجھی جاتی تھی۔ دن ہو یا رات کسی بھی وقت نیوز کے سلسلے میں ڈیوٹی لگنے پر وہ آ جاتی تھی۔ آفس کے ذمہ داران اس کے اوپر مکمل بھروسہ کر سکتے تھے۔ جمیلہ کی مقبولیت اور آفس میں اس کی برتری میں اس کے اس امیج کا بڑا دخل تھا۔ جمیلہ کے لئے اپنے اس امیج کو برقرار رکھنا ضروری تھا اور کام سے انکار کرنے کو اس کے اندر پیدا ہوتے ہوئے غرور کی پہچان سمجھا جا سکتا تھا۔

جمیلہ جب سے یہاں دوردرشن میں آئی تھی ایک شہزادی کی طرح رہی تھی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا اپنی محنت سے کیا تھا۔ اس نے کبھی بھی اس کے لئے نیٹ ورکنگ نہیں کی تھی۔ شہاب سے اسے بے حد محبت تھی اور وہ کہیں بھی شہاب کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ جو لوگ دور سے ہی اس کی بے حد قدر کرتے تھے اور اسے نیوز کا سپر سٹار مانتے تھے ان کی خوشامد کرنا اسے نہ زیب دے سکتا تھا نہ اس کی ضرورت تھی۔ دلی شہر میں رہتے رہتے اس کو یہاں کے اونچ نیچ کا بہت کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ نئی نئی لڑکیوں کے بارے میں وہ طرح طرح کے قصے سن چکی تھی۔ افسروں کی چاپلوسی کرنا، ان کے ساتھ شام میں خالی وقت میں ریستوراں وغیرہ میں گھومنے پھرنے جانا۔ اور اس کے عوض میں ایک آدھ کام لے لینا۔ لیکن ان تمام داؤ پیچ کے باوجود وہ لڑکیاں جمیلہ کے سامنے ابھر نہیں پائی تھیں۔ اور جمیلہ کو ویسا کچھ بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ سیدھے گھر سے دفتر آتی تھی اور سیدھے دفتر سے گھر جاتی تھی۔ دفتر جانے کے دوران وہ اپنا موبائل بھی شہاب کے پاس

طرح جلانے لگی۔ وہ ایک ایسی کامیاب ماڈرن عورت کا نمونہ پیش کرنا چاہتی تھی جو اپنی زندگی کو انتہائی خوب صورتی سے چلاتے ہوئے جدید زندگی میں اپنے کو ڈھال سکتی تھی۔ اس کی روح کی یہ چمک اس کے دو معصوم بچوں کے دلوں تک میں اتر گئی تھی جو اس کے پیار اور ایثار سے اس قدر متاثر تھے کہ انہیں وقت بے وقت ماں کا چھوڑ کر چلے جانا بالکل ہی تکلیف دہ نہیں محسوس ہوتا۔ وہ خوشی خوشی ماں کا انتظار کرتے اور اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے سائے کو محسوس کرتے تھے۔

اگر اس ماحول میں بچوں کو کوئی اجنبی چہرہ دکھتا تھا تو وہ شہاب کا چہرہ تھا جو حد درجہ غیر جذباتی تھا۔ ہمیشہ کوئی اونچی بات سوچتا رہتا، بڑی بڑی باتیں کرنا، جمیلہ کو مختلف طرح کے سجھاؤ دینا، کبھی کاغذوں پر کچھ لکھتا، کبھی کمپیوٹر پر بیٹھ جاتا، جمیلہ کو جو بھی وقت بچوں کے لئے ملتا اس کا بیشتر حصہ شہاب ضائع کر دیتا۔ جب بھی شہاب چھٹی لے کر گھر آ جاتا بچوں کو ایسا لگنے لگتا جیسے ماں ان سے چھن گئی ہو۔ وہ ماں جو تنہائی میں ہر لمحہ بچوں پر ہی دھیان لگائے ہوئے گھر کا ہر کام کرتی رہتی، اس کا ذہن شہاب کی بتائی ہوئی اسکیموں میں الجھ جاتا، وہ کبھی کوئی اسکرپٹ لکھنے بیٹھ جاتی، کبھی شہاب کی دی ہوئی کوئی کتاب جلدی جلدی پڑھنے لگتی، ان دنوں وہ عموماً بچوں کی تفریح کے سارے پروگرام کینسل کر دیتی تھی۔

گھر کے اندر کی اس کمی کو شہاب بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے اس کا پوری توجہ سے بھرپور تجزیہ کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر جمیلہ نیوز کے لئے جانا بند کر دے تو گھر کے معمولات نارمل پر آ جائیں گے۔ نیوز کے پیسوں کی اب کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اور سب سے زیادہ وقت اسی میں صرف ہو رہا تھا۔ نیوز کے اوقات غیر متعین ہونے کی وجہ سے گھر کے تمام معمولات بگڑ گئے تھے۔ جمیلہ بہت مشکل سے سب کچھ سنبھالے ہوئی

لئے، شہاب نے [illegible] کیا تھا۔ وہ تو برسوں سے، جب سے ان کی شادی ہوئی تھی [illegible] کے بنائے ہوئے اسکیموں پر، اسی کی رہنمائی میں ہر کام کرتی آئی تھی۔ یہ تو اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ فیصلہ کرے کہ جمیلہ کو کیا کرنا ہے۔ اسے ریڈیو پر نیوز پڑھنے کے لئے اسی نے کہا۔ اس کو ٹی۔وی۔ نیوز کے لئے وہی لے گیا تھا۔ اس نے جمیلہ کو بی۔اے۔، ایم۔اے۔، اور ایم۔فل۔ کرنے کے لئے کہا۔ جمیلہ نے ہر قدم پر اس کی بات مانی اور اسی سے جمیلہ وہ سب کچھ کر پائی اور وہ سب کچھ حاصل کر پائی جو اس نے پلان کیا تھا۔ جمیلہ کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے یہ تو اسی کو سمجھ میں آتا ہے۔ یہ فیصلہ اگر وہ جمیلہ پر چھوڑے ہوا ہے تو یہ تو اسی کی لاپرواہی ہے۔ اور اس کے نتائج اس کی اپنی غلطیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس میں جمیلہ کا تو کوئی رول نہیں۔ اب گاڑی کو اس پٹری سے نئی پٹری پر لے جانا ضروری تھا۔ جمیلہ کبھی کبھی بیمار پڑنے لگی تھی۔ یہ شاید اس کے بنائے ہوئے نقوش پر اندھا دھند، آنکھ بند کر کے پوری جفاکشی کے ساتھ عمل کرنے کا نتیجہ تھا۔ کہیں نا کہیں کچھ غلط ہو گیا تھا۔

شہاب کو سوچتے سوچتے جمیلہ پر ترس آ گیا۔ وہ اٹھا۔ جمیلہ کچن میں چپاتیاں بنا رہی تھی۔ وہ وہیں

جو ایک بات اس کو پریشان کرنے لگی تھی وہ اس کی مسلسل بڑھتی ہوئی ذمہ داریاں تھیں۔ جمیلہ کو اس بات کا مکمل احساس ہو چکا تھا کہ اس کی ذمہ داریاں اس کی گرفت سے باہر ہو چکی تھیں۔ لیکن وہ ہار ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ہار ماننا تو اس نے نہ کبھی قبول کیا تھا اور نہ وہ ہار کو تسلیم کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے اپنی بھرپور قوت کے ساتھ نبرد آزما تھی کہ اسی دوران شہاب کا تبادلہ شملہ ہو گیا۔ جمیلہ نے اس صورتحال کا مقابلہ ڈٹ کر کیا۔ اس نے بچوں کی دیکھ ریکھ سے لے کر یونیورسٹی اور ٹی۔وی۔ اسٹیشن تک ہر چیز کو مانو دھاگے میں پرو کر ایک مالا بنا لیا اور اسے اپنے گلے میں ڈال لیا۔

جاڑے اور گرمی کے موسموں کی طغیانی سے لے کر جاگنے اور سونے کے اوقات تک تمام چیزوں کو اس نے اپنے دام ہمت میں جکڑ لیا اور جسم و روح کی تمام تر قوتوں کو جمع کر وہ اپنے انگ انگ کو ایندھن کی

پہنچ گیا۔ جمیلہ کو آدھے گھنٹے کے لئے ریڈیو اسٹیشن جانا تھا۔ اس لئے وہ بجلی کی طرح کیچن کا کام ختم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی نوکرانی اس کی ہدایت پر جلدی جلدی برتن صاف کر رہی تھی۔

شہاب نے جمیلہ کے قریب پہنچ کر اس سے کہا۔

میں سوچ رہا ہوں، تم یہ نیوز والا کام بند کردو۔

کیوں۔ جمیلہ چپاتیاں سینکتی ہوئی بولی۔

تمہاری مشغولیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے تم اتنا سب کچھ نہیں کر پاؤ گی۔

ارے نہیں۔ جمیلہ اس طرح مسکرا کر بولی جیسے اس کا خوبصورت چہرہ شہاب کے اظہار شفقت سے پھول کی طرح کھل گیا ہو۔

تم کتنا کام کرلوگی۔

میں سب کرلوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔

صبح کی نیوز پڑھنے کا شیڈول آ گیا تو جمیلہ کو پانچ بجے صبح جانا پڑا۔ اس نے بچوں کو چار بجے صبح اٹھا کر تیار کردیا۔ کتابیں دیں۔ ناشتہ رکھ دیا۔ کپڑے پریس کئے۔ ہاتھ منھ دھلایا۔ یہ سب کچھ وہ اتنے پیار سے مسکراتے ہوئے، اپنی میٹھی آواز کا جادو جگاتے ہوئے کرتی کہ بچے نیند کی راحت کو بھول جاتے۔ جمیلہ کے جانے کے بعد وہ دیر تک اس کی موجودگی کے سحر میں گرفتار رہتے۔ تب تک جبتک اسکول کی گاڑی کا ہارن نہیں سنائی دیتا اور پھر اسکول چلے جاتے۔

آخر کار ایک دن جمیلہ بری طرح بیمار ہو ہی گئی۔ جو کچھ اس نے پچھلے دو تین برسوں میں نیوز پڑھ کر کمایا ہوگا اس سے زیادہ ایک ہفتے میں دواؤں اور الٹرا ساؤنڈ پر خرچ ہو گیا۔ شہاب کو ایک مہینے کی چھٹی لیکر آنا پڑا۔ یہ دن شہاب کے لئے بہت آزمائش کے تھے کیونکہ ان دنوں بیوی کی تیمارداری سے لے کر بچوں کو اسکول بھیجنے تک ہر بات پر اسے ہی دھیان دینا پڑتا۔ رفتہ رفتہ جمیلہ کی صحت بحال ہوگئی۔ چھٹی سے واپس جاتے ہوئے شہاب اسے نیوز کے لئے جانے سے منع کر گیا۔

چند دنوں بعد ٹی۔ وی۔ اسٹیشن سے فون آیا۔ جمیلہ سے رہا نہیں گیا۔ اس نے ہاں کردی۔ اور پھر وہی معمول شروع ہو گیا۔ لیکن بیماری کے آرام کے بعد ذہنی طور پر وہ دوبارہ تازہ دم ہو گئی تھی۔ دوبارہ نیوز اسکرین کے سامنے جاتے ہی اس کے اندر جیسے تازہ قوت بھر گئی۔

شہاب کو اپنے ذرائع سے معلوم ہو کہ دوردرشن پر کمیشن اسکیم کے تحت نئے سیریل پاس ہونے والے ہیں۔ وہ فوراً چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ اس بار وہ جمیلہ کو کچھ کہنے سے پہلے اپنا نیا سیریل پاس کرالینا چاہتا

تھا۔ سیریل کے لئے اسکرپٹ لکھنی تھی۔ بازار میں اسکرپٹ لکھنے والے موجود تھے۔ لیکن اس نے سوچا کہ جب یہ کام گھر میں ہی کیا جاسکتا ہے تو باہر پیسہ کیوں دیا جائے۔ اس نے جمیلہ کو موضوع بتا دیا۔ جمیلہ اسکرپٹ لکھنے پر لگ گئی۔

ادھر جمیلہ اسکرپٹ لکھنے پر لگی تھی ادھر شہاب کو بار بار خیال آتا کہ اگر وہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرلیتی تو بہت جلد لکچررشپ کے لئے دروازے وا ہو سکتے تھے۔

شہاب نے دیکھا، جمیلہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

کہاں جا رہی ہو۔

دوردرشن۔

مجھے بتایا نہیں کہ جانے والی ہو۔ تمہیں بتانا چاہئے تھا۔ تمہیں کب کہاں جانا ہے یہ تو فیصلہ مجھے کرنا ہوتا ہے۔ یہ میری سردردی ہے۔

میں نے سوچا آپ منع کریں گے۔

میں نے تو تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا۔ کب سے جا رہی ہو؟

دو مہینوں سے۔

تم نے فون پر بھی کبھی نہیں بتایا۔

بتانے کی کیا بات تھی۔ سوچا کوشش کر کے خود ہی دیکھ لوں کہ ہو پاتا ہے کہ نہیں۔ کرنا تو مجھے ہی ہے نا۔ میں نے دیکھا کہ کرسکتی ہوں اس لئے کر رہی ہوں۔

بتانے کی بات تھی۔ تم بتاتی تو میں تم کو بتاتا کہ میرا منع کرنا تمہاری بیماری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ میں نے پکا فیصلہ کرلیا ہے کہ تم اب نیوز پڑھنے نہیں جاؤ گی۔ تم نے ذکر کیا ہوتا تو میں تم کو بتا دیتا۔ سیریل میں بہت پیسہ مل جاتا ہے۔ دو مہینے کی کمائی میں پانچ سال کے لئے سکون ہو جائے گا۔ تم یہ اسکرپٹ مکمل کرو۔

میں آ کر کرلوں گی۔

میں اسے جلدی سے تیار کر کے جمع کرنا چاہتا ہوں۔

میں بات کر کے آجاؤں گی۔ دو چار دن کے لئے منع کردوں گی۔

ریڈیو اسٹیشن پر جمیلہ نے بات کی لیکن شیڈول بدلا نہیں جا سکا۔ صبح کی شفٹ کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ شہاب کو یہ خبر بہت ناگوار گذری۔

تم انہیں آج سے ہی منع کردو۔ کہ دو کہ بیمار ہو گئی ہو۔

ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔ وہ سمجھ جائیں گے کہ بہانہ کر رہی ہوں۔

سمجھنے دو۔ کیا کرنا ہے۔ تمہیں یہ کرنا ہی نہیں ہے۔

کرنا کیوں نہیں ہے۔ اتنا پیسہ کما تو لیا۔ اب پیسے کے لئے نیوز کے کام کو چھوڑنا کیا ضروری ہے۔ جیسے اب تک سب کچھ آگے بڑھا ہے ہم لوگ اور بھی آگے بڑھیں گے۔ کچھ کام پیسے دے کر بھی تو کرائے جاسکتے ہیں۔ میرا نیوز کا کام چھوڑنا ضروری نہیں لگتا۔

تم کو نہیں لگتا ہوگا لیکن مجھے لگتا ہے۔ تمہارے بارے میں ساری پلاننگ میں کرتا ہوں۔

جمیلہ کے ذہن میں یہ جملہ کانٹے کی طرح چبھ گیا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تمہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اسکرپٹ لکھو۔ ریسرچ پورا کرو۔

میں وہ بھی کرلوں گی۔ آپ جانتے ہیں میں کتنا کام کرلیتی ہوں۔ آپ کو میری محنت کرنے کی صلاحیت کا اندازہ نہیں۔

مجھے پورا اندازہ ہے اور میں اسی اندازے کی روشنی میں سارے فیصلے کرتا ہوں۔ اب تم یہ کام نہیں کروگی۔

ایسا کیوں؟ میں بھی تو سمجھوں۔

اب تم نے سوال کرنا شروع کر دیا۔

اچانک شہاب کے تیور بدل گئے۔

اب تمہارا سمجھنا بھی ضروری ہو گیا۔

اس میں کیا حرج ہے۔

تمہیں میرے فیصلے پر بھروسہ نہیں۔ تم سمجھتی ہو کہ میں غلط فیصلے کرسکتا ہوں۔ اور تم اس کو درست کرسکتی ہو۔ دیکھتی نہیں یہ بہت سارے کام اٹھانے سے تمہاری اور تمہارے اس گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔

لیکن میں نیوز پڑھنے جانا چاہتی ہوں۔ اسکرپٹ کسی اور رائٹر سے بھی تو لکھوالیا جاسکتا ہے۔

کیا ملتا ہے وہاں بھی جوڑا ہے۔

صرف پیسے نہیں دیکھنا چاہئے۔

مجھے اس سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس سے میری ایک پہچان بنی ہوئی ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کا مطلب میری پہچان کی موت۔ اور دنیا یہ سمجھے گی کہ وہاں مجھ سے بہتر لوگ آ گئے ہیں اور میں ہٹا دی گئی۔

تمہاری پہچان۔ تمہاری اس پہچان کی قیمت ہے پانچ سو رپئے۔

یہ اس لئے کہ وہاں لوگ پہچان کے لئے ہی کام کرتے ہیں۔ کئی پیسے والے گھروں کی لڑکیاں صرف

اسی وجہ سے یہ کام کرتی ہیں۔ اور شاید اسی لئے دوردرشن کو اس کام کے لئے زیادہ پیسے نہیں دینے پڑتے۔

تو تمہیں اپنی آواز سنانے اور چہرہ دکھانے کا بڑا شوق ہے پوری دنیا کو اور ان دیکھنے والوں کے لئے میری بات کاٹی جا رہی ہے۔

جی نہیں، میں آپ کی بات کاٹ نہیں رہی ہوں۔ میں سمجھا رہی ہوں۔ آخر میں بھی سماج کا ایک حصہ ہوں۔ اور اپنی ایک پہچان بنا رکھی ہے۔ اس طرح تو میرے وجود کا قتل ہو جائے گا۔

یہ جو تمہارا وجود ہے نا اسے میں نے پیدا کیا ہے۔ اور جو پیدا کرتا ہے اسے مارنے کا بھی اختیار ہوتا ہے کیونکہ وہی بہتر جانتا ہے کہ کب کیا ہونا بہتر ہے۔ مجھے معلوم ہے اس وجود میں کیا دھرا ہے۔

اس وجود میں میری روح کی حرارت ہے بلکہ میں جو اتنا کام کرلیتی ہوں یہ انرجی یہیں سے آتی ہے۔

اس کے شعلے کچھ زیادہ ہی تیز ہو رہے ہیں۔ میں ابھی بجھا دیتا ہوں اس آگ کو۔ مجھے پتہ ہے کہ میں جس گاڑی کو چلا رہا ہوں اس میں کیسے بریک لگاتا ہے۔

جمیلہ خاموش ہو گئی۔

تم نہیں جاؤ گی۔

مجھے مت روکئے۔ آپ سمجھئے۔

شہاب خاموشی سے جمیلہ کو گھورتا رہا۔

جمیلہ نے اپنا پرس اٹھایا۔ اپنا چہرہ ایک بار آئینہ میں دیکھا۔ شہاب کی طرف دیکھنے کی اس کی ہمت نہیں پڑی۔ وہ پرس لیکر چلتی ہوئی بچوں کے پاس گئی اور انہیں پیار کر کے دروازے تک گئی اور دروازہ کھولنے کے لئے کنڈی پر ہاتھ رکھا کہ شہاب کی آواز گونجی۔

اگر دراوازے سے قدم باہر نکالا تو سمجھو ہیں طلاق۔

جمیلہ وہیں کھڑے کھڑے سرد ہو گئی جیسے اس کی روح کھینچ لی گئی۔ وہ کھڑی نہ رہ پائی تو وہیں نیچے فرش پر بیٹھ کر برف ہو گئی۔ اب اس کا چہرہ نہ دروازے کی طرف تھا نہ اندر کی طرف۔ اس کی بے جان آنکھیں بغل کی دیوار پر ٹک گئی تھیں۔ اس کو گرتے دیکھ کر اس کے بچے دوڑ کر آئے اور اس پر جھک گئے اور اور پھر انہوں نے گھوم کر شہاب کو انتہائی نفرت بھری نظروں سے دیکھا جیسے وہاں جمیلہ کی لاش پڑی ہو اور وہ اپنی ماں کے قاتل کو دیکھ رہے ہوں۔

◄◄ ● ►►

● پیغام آفاقی

گلاس

ایک دن وہ آفس میں آکر اطمینان سے بیٹھا تو اسے پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے سامنے رکھے گلاس کا پانی پی لیا اور پھر چپراسی سے ایک گلاس پانی لانے کے لئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سکریٹری مانسی بھی آئی تھی جو میز کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔ مانسی کی نظر قلمدان پر لگے ایک قلم پر بیٹھے ایک پیلے رنگ کے اڑنے والے کیڑے پر پڑی۔ مانسی اس کو اڑانے کے بہانے انگلی سے چھونے لگی۔ ''اس کو انگلی سے نہ چھوؤ، یہ کاٹ لے گا۔ زہریلا ہوتا ہے۔'' اس نے مانسی کو منع کیا اور پھر اس نے ایک قلم کی نوک سے اس کیڑے کو چھیڑا کیڑا اڑنے کے بجائے قلمدان سے اتر کر میز کے شیشے پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اڑ گیا لیکن اس کے بعد وہ دوبارہ شیشے پر ہی آ کر بیٹھ گیا۔

اتنی دیر میں چپراسی پانی لے کر آ گیا۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ اور پیا اور ابھی پیاس باقی ہی تھی کہ پانی پینے کے دوران وہ کیڑا اڑ کر ٹھیک اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور ایک وقفے کے بعد ادھر ادھر چلنے لگا۔ اس نے کیڑے کو شیشے کے گلاس سے دبایا کہ وہ اس میں دب کر مر جائے لیکن وہ گلاس کے پیندے کی خالی جگہ میں صرف قید ہو کر رہ گیا۔ یہ گلاس بھی عجیب انداز کا تھا کہ اس کے پیندے میں گھونٹ بھر پانی کے برابر جگہ تھی۔ اب اس کیڑے کے پاؤں کے نیچے میز کا شیشہ تھا اور اوپر گلاس۔ وہ اس کیڑے کو دیکھنے لگا۔ بار بار اس کا جی چاہتا تھا کہ گلاس اٹھا کر پانی پی لے لیکن وہ گلاس نہیں اٹھا پا رہا تھا کیونکہ اس کیڑے کی قید و بند کی کیفیت کو دیکھ کر اسے خود اپنے اندر ایک عجیب سا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ موازنہ کرنے لگا۔

'وہ طبعی پیاس جس کو مٹانے کے لئے وہ گلاس میں رکھے پانی کو پینا چاہتا تھا وہ زیادہ طاقتور ہے یا اذیت میں مبتلا کیڑے کو دیکھنے کی لذت جس کو وہ بہت گہرائی سے محسوس کر رہا تھا۔'

ان لمحوں میں گلاس میں رکھا پانی اس کے لئے زندگی کے اجنبی نظام کے نقوش کو واضح کر رہا تھا اس لئے وہ چاہتا تھا کہ وہ کیڑے کو تب تک آزاد نہ کرے جب تک اس پر گزر رہی کیفیت اس مکمل علامت کو کھول نہ دے جو اتفاقاً اس وقت اس کے سامنے نمودار ہوئی تھی۔ وہ اس کیڑے کی اس کیفیت کو، اس کے

امید و بیم کے اس تناؤ کو کہ وہ اس قید سے نکل پائے گا یا نہیں اور اس کے اندر موجود بے یقینی کو گہرائی سے محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر وہ کون سی بات ہے جو اس کی اپنی پیاس سے بھی زیادہ اہم ہے اور جو اس کو گلاس نہیں اٹھانے دے رہی ہے۔ اب تک جو اس کا خیال تھا کہ خیال کمزور اور دکھائی دینے والی چیزیں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں اور اس نے جو گذشتہ دنوں کسی اخبار کے کالم میں پڑھا تھا کہ یادیں اور نا سٹلجیا تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ بامعنی نہیں ہوتیں یہ بات غلط ثابت ہو رہی تھی۔ اور وہ اس مشاہدے کے دوران یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ انسان اندر اندر اس کائنات کی چیزوں اور انسانوں سے جو رابطہ محسوس کرتا ہے وہ حقیقی اور کافی مضبوط ہوتا ہے۔ گلاس اب بھی سامنے تھا اور اس کے نیچے کیڑا اچل رہا تھا۔ قید اس کیڑے کو جیسے بھیانک لگ رہی تھی۔ وہ نکلنے کے لئے تیزی سے دوڑ بھاگ کر رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ چکا تھا کہ 'اگر یہ سب کچھ ایسا ہی رہا تو اس کی زندگی کو باقی رکھنے کے ذرائع منقطع ہو جائیں گے۔'

''وہ پریشان کیوں ہے؟؟'' وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جس طرح یہ قید اچانک آ گئی ہے اسی طرح یہ اچانک ختم بھی ہو جائے گی۔ لیکن وہ کیسے جانے کہ یہ ختم ہو بھی جائے گی؟ اگر نہیں ختم ہوئی تو یہ جو قید تھی وہ مستقل قید کی صورت میں تو اس کی موت بن کر آئی ہے۔ 'وہ شیشے کے باہر جھانکتا رہا۔ چاروں طرف وہی سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہی قلمدان، وہی چھت، وہی پنکھے، وہی الماریاں، وہی پردے۔ وہی کلنڈر، وہی میز پر پڑا ہوا پلاسٹک کے پھولوں کا گلدان، وہی کھڑکیاں جن سے باہر درختوں کی پتیاں دکھائی دے رہی تھیں اور وہی لڑکی جو اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اور وہی شخص جو سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور جس کے چہرے پر رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جو بار بار گلاس کو دیکھتا تھا اور پھر اس کو دیکھتا تھا اور پھر اپنے آپ میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ دیکھتا رہا اور شیشے کے اندر ہی اندر چکر لگاتا رہا۔

اسے بار بار دھوکا ہوتا کہ وہ جدھر بڑھ رہا ہے ادھر کھلی ہوا ہے اور کچھ اور نہیں ہے لیکن جیسے ہی وہ بڑھتا ویسے ہی آگے ٹکرا جاتا اور تب اسے لگتا کہ وہ خالی دکھنے والی سمت تو کوئی ٹکرا جانے والی ٹھوس چیز ہے جو اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن جو وہاں مضبوطی سے موجود تھی۔ اور پھر اسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی تمام چیزوں پر شک ہو جاتا کہ ہو نہ ہو ہر طرف ویسا ہی کوئی ٹکرا جانے والا منظر ہو یا چیز ہو یا حد یں ہوں۔ اس شخص کی پھیلائی ہوئی جو اسے دیکھ رہا تھا۔ اس خیال کے آنے کے بعد تو اس نے ایک جگہ باقاعدہ اپنی ٹانگیں اٹھا کر اس دیوار سے زور آزمائی کرنے کی کوشش کی اور پھر وہاں سے چلا اور دوسری جگہ پر زور آزمائی کی اور پھر کئی جگہوں پر کی اور پھر جب دیکھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی راستہ نکلتا ہے نہ اس محنت سے اس کے ذہن میں کوئی نیا سوال پیدا ہو کر کوئی اور تدبیر دکھاتا ہے تو اس نے یہ محنت بند کر دی۔ اب وہ یونہی کھڑا ہو کر سوچنے لگا گویا سوچنے سے

کوئی فائدہ تھا اور پھر چکر لگانے لگا۔ اس بار وہ صرف چلتا رہا۔ دیوار کے سہارے، دیوار کو چھو چھو کر اور دیوار کے کنارے کنارے کہ جہاں دیوار ختم ہوتی ہے اس کا اس کو اندازہ ہو جائے اور پھر اس نے دیکھا کہ پورا گلاس آگے کھسک رہا ہے اور پیچھے سے شیشہ اس سے ٹکرایا تو وہ آگے بڑھا اور اس کی ایک ٹانگ اس شیشے میں دب کر ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ دراصل وہ کیڑے کی صورتحال میں کچھ مزید جہات کا اضافہ کرنے کے لئے گلاس کو کھسکا رہا تھا۔ اب کیڑا اس سمت کو بڑھنے لگا جس سمت میں گلاس اسے دھکا لگا رہا تھا۔ چلتے چلتے ایک جگہ دھکے کی رفتار کچھ کم ہوئی اور دوبارہ پھر تیز ہو گئی۔ وہ چاروں طرف اور اوپر کی جانب نگاہیں گھما کر اور اپنے جسم کو بچا بچا کر دیکھتا رہا کہ یہ سب کچھ جا کدھر رہا تھا کہ وہ اس کے مطابق ہی چل سکے اور جب اس کے جانے کی سمت کا اس کو کچھ کچھ اندازہ ہوا تو اس کی خود اعتمادی کچھ کچھ بحال ہوئی اور چلتے چلتے جب سب کچھ تھما تو وہ بھی تھم گیا۔ اب وہ نئے امکانات کی تلاش میں ادھر ادھر جھانکنے لگا اور جب جھانکتے جھانکتے تھک گیا تو ایک کنارے کھڑا ہو گیا اور تب اس نے دیکھا کہ اب وہ لڑکی اس آدمی کو انگلی کے اشارے سے بتا رہی تھی کہ اب وہ تھم گیا ہے۔ پھر جیسے دونوں اس کے تھم جانے کی اس حرکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کا تھم جانا اتنا معنی خیز تھا یا اسے معلوم ہی نہ تھا اور پھر وہ ایک کونے میں کھڑا حیرت سے اس شخص کو دیکھتا رہا جو اب کچھ لکھ رہا تھا۔

اسے اپنے اوپر کچھ لکھے جانے میں ہزاروں اسرار دکھائی دینے لگے۔ وہ شخص بار بار اسے اور اس کے اوپر کے گلاس کو دیکھے جا رہا تھا اور لکھے جا رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں اس کے لئے چائے بھی آ گئی۔ لیکن وہ چائے پینے کے بجائے لکھتا ہی رہا حتیٰ کہ چائے ٹھنڈی ہو کر شاید خراب ہو گئی کیونکہ لڑکی نے کچھ دیر بعد اپنے سامنے کی پیالی سے چائے پینی شروع کر دی اور جلد ہی خالی کر کے ایک طرف رکھ بھی دی۔ کیڑے کو یہ بات بہت پریشان کر رہی تھی کہ وہ شخص کیا سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اب اس کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ اتنی دیر میں وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ جب تک وہ اس گلاس میں ہے تب تک محفوظ ہے۔ ایک جگہ۔ اسے شیشے میں اپنی آنکھوں اور اپنے چہرے اور اپنے پیلے پیلے پنکھوں کا عکس دکھائی دیا تو اسے صاف صاف معلوم ہوا کی وہ شیشوں میں قید ہے۔ مانسی کی متجسس نظروں کو اپنے چہرے پر تھامے ہوئے اور قلم ہاتھ میں لئے ہوئے وہ اس کیڑے کو مسلسل دیکھ رہا تھا اور تب اسے محسوس ہوا جیسے ایک روح اس شیشے کے قید خانے میں گھری ہوئی لاچار نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور وہ وجود کے عناصر سے نبرد آزما تھی کہ کس طرح اس میں آزادی کی سوراخ کھود سکے اور عناصر تھے کہ اپنی جگہ سخت، بے حس اور بے جان تھے اور پھر بھی اس کو گھیرے ہونے میں پورا پورا انہیں کا رول تھا اور اس رول میں وہ مستعد تھے۔ جامد اور خاموش، لب سلے ہوئے۔ جیسے کہتے نہ ہوں لیکن جانتے ہوں کہ صرف وہی شخص ان کو اٹھا سکتا ہے جو سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس روح کو اگر کسی کی تلاش ہے، اگر وہ کسی چیز کو چھو کر اس کا ادراک کرنا چاہتی ہے کہ وہ ٹھنڈی تھی القلب

ہے اور کیسے اس میں نرمی آئے گی تو وہ یہ جان لے کہ یہ چیز خود اس شخص کی اپنی روح تھی جو سامنے بیٹھا تھا۔

وہ تحریر کر چکا تھا: میں تمہیں اس وجہ سے آزاد نہیں کر رہا ہوں کہ تم متحرک ہو اور میں مردہ ہوں۔ تم مجھے اپنی کوششوں کو دیکھتے دیکھتے ان کے زیر اثر متحرک ہو جانے دو۔ اپنی مایوسیوں کے مواد سے میرے اوپر جو موٹی موٹی پرتیں جم گئی ہیں انہیں پگھل جانے دو کہ میں بھی ان سے آزاد ہو کر تمہاری طرح متحرک ہو جاؤں، ان دیواروں کے خلاف، ان دیواروں کے روبرو جو دیواریں مجھے گھیرے ہوئی ہیں کہ مجھے بھی تو تمہاری ہی طرح کسی نے زمین و آسمان کے بیچ ڈال دیا ہے۔ تم چاہتے ہو کہ میرا دل پسیج جائے اور میں تم کو چھوڑ دوں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہیں اس شیشے میں گھرا ہوا رکھ کر تمہارا دم گھٹا کر، تڑپا تڑپا کر اور تمہاری کوششوں کو بے معنی ثابت کرتے ہوئے تمہیں اسی میں ختم کر دوں گا۔ اور اس میں سے صرف تمہاری بے جان لاش نکلے گی۔

تم سمجھتے ہو کہ یہ گلاس میں نے تمہارے اوپر رکھا ہے؟ یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ تم یہاں گرے اور اس وقت میں پانی پی رہا تھا اور میں نے تمہارے اوپر یہ گلاس تم کو مار ڈالنے کے لئے نہیں رکھا تھا لیکن تم مرنے کے بجائے اس میں قید ہو گئے۔ یہ میری منشا نہیں تھی۔ یہ تو یونہی ہو گیا اور تمہارے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ یونہی ہو رہا ہے اور تم اس ہو جانے میں قید ہو۔ اس نے کیڑے کی ان بڑی بڑی آنکھوں سے جو اس لمحے ظہر کراسی کو دیکھ رہی تھیں، نظریں ملائیں۔ اگر میرا خاتمہ قید میں ہو سکتا ہے تو تمہارا خاتمہ قید میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس کے چہرے پر پالگلوں جیسا تاثر ابھرا۔ کیڑا بچارہ کسی بکری کے بچے کی طرح معصومیت سے دیکھ رہا تھا، اس امید میں کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اور اب اس کی مدد کرے گا۔

اس نے چاہا کہ وہ کیڑے کو مار دے لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا کیونکہ اس کے لئے اسے گلاس کو اٹھانا پڑتا اور گلاس کو اٹھاتے ہی کیڑا اڑ سکتا تھا۔ میں تمہیں اس گلاس کے نیچے ہی چھوڑوں گا جب تک تم مر نہ جاؤ۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے کیڑے کے نام موت لکھ دی ہے لیکن موت اس کے ہاتھ میں بھی نہیں تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ اس کی دی ہوئی موت کیسے ہے جبکہ وہ کیڑے کو مار نہیں سکتا۔ وہ کیڑا اب اس کی طرف سے نا امید ہو کر منہ پھیر چکا تھا اور راز سر نو دیواروں کے معائنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اسے اپنے خدائی کا زعم مسمار ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اگر وہ گلاس کو اٹھاتا ہے تو کیڑا اڑ جائے گا۔ اگر گلاس کو یونہی چھوڑ کر چلا جائے تو چپراسی ٹیبل کو صاف کرتے وقت گلاس اٹھائے گا اور کیڑا اڑ جائے گا۔ وہ گلاس کو اسی طرح چھوڑے رہنے کا حکم بھی نہیں دے سکتا کہ لوگ اسے اس کے دماغ کا خلل سمجھیں گے۔ کیڑا بار بار گلاس کے شیشے کے اوپر کسی سرکش مکڑے کی طرح پاؤں پھینک کر کھڑا ہوتا رہا اور زور پر زور لگاتا رہا۔ اس نے عاجز آ کر پانی سے بھرا گلاس پینے کے لئے اٹھا لیا۔

◂◂ ● ▸▸

تبصرے

نام کتاب: بھائی گیٹ کارو بن گھوش
مصنف: امین صدرالدین بھایانی
صفحات: ۲۱۰
قیمت: تین سو روپے
مبصر: فارس مغل، کوئٹہ

ایک ایسے دور میں جہاں وقت نکال کر کتاب ہاتھ میں لینا اور پھر اسکا مطالعہ کرنا کسی قاری کے لئے سہل عمل نہیں رہا وہاں جو کتاب اس کے زیرِ مطالعہ ہے اگر اس کے ذوق پر پورا اترنے سے قاصر رہتی ہے تو وقت کے ضیاع پر وہ اس مصنف کو دوبارہ کبھی پڑھنے کی زحمت نہیں کرتا۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ امین بھایانی صاحب کے تمام افسانے قاری کے لئے راحت و آنند کا سامان باہم مہیا کرتے ہیں یہ کتاب ایک عمدہ نثر پارہ ہے خوبصورت زبان و بیان سے مزئین دل کو چھو لینے والی کہانیاں ہیں۔

کہتے ہیں جس معاشرے میں ادب تخلیق ہو رہا ہو اس کا عکس اس کے بطن میں ہونا لازمی ہے۔ یہاں چونکہ مصنف مشرق و مغرب دونوں انتہاؤں کے موسموں سے آشنا ہیں اس لئے افسانوں میں دونوں معاشروں کے ذائقے ملتے ہیں۔

افسانوں کے تکنیکی پہلوؤں پر نظر دوڑائیں تو قریباً تمام افسانوں میں وحدت تاثر پایا جاتا ہے۔
افسانوں کے پلاٹ سیدھے سادے ہیں۔
کہانیوں میں موجود کردار پلاٹ پر حاوی دکھائی دیتے ہیں۔
تمام افسانوں میں کرداروں کی تعداد بہت کم اور معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔
تمام افسانے حقیقی زندگی سے قریب تر ہیں۔

گو کہ کوئی بھی افسانہ غیر ضروری طوالت کا شکار ہو تو قاری کا اکتا جانا فطری عمل ہے لیکن مصنف کے زیادہ تر افسانے طویل ہونے کے باوجود قاری کو بوریت کا شکار نہیں ہونے دیتے ادبِ عالیہ کے کسی بھی قاری کے لیئے افسانے کی سطحیت کا اندازہ لگانا مشکل عمل نہیں ہوتا اس ضمن میں مصنف کے افسانے بیانیہ

طرزِ تحریر کی عمدہ مثال ہیں ایسی تحریروں میں اکثر ادبیت کا فقدان نظر آتا ہے لیکن مصنف کے افسانے با آسانی ادب پاروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں اس کی مثال ان کا اس کتاب میں شامل سب سے بہترین افسانہ 'بھائی گیٹ کارو بن گوش' ہے جس میں اتنی ادبی چاشنی ہے جو قاری کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔

ان افسانوں میں ایک افسانہ بھی ایسا نہیں ہے جو جنسی نفسیات کا احاطہ کرتا ہو اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مصنف کا رجحان سماجی اور گھریلو زندگی کے دائرے میں مقید ہے وہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریزاں دکھائی دیتے ہیں جن موضوعات پر ہمارے سماج میں انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں لیکن اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان موضوعات کو چھیڑے بغیر کوئی قلمکار ادیب کہلانے کے لائق نہیں ہوتا امین صاحب موضوعات کا چناؤ بہت سوچ سمجھ کے کرتے ہیں یوں بھی انسان کا وجود دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں سے تکمیل پاتا ہے کچھ دائیں کچھ بائیں اور کچھ ادبا دونوں بازوؤں سے کام لیتے ہیں امین بھایانی صاحب کو فی الحال میں دائیں بازو کا ادیب مانتا ہوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو ادیب امریکی ریاست فلوریڈا کے ڈے ٹونا بیچ کے آس پاس رہائش رکھتے ہوئے بھی اپنے مرشد اے حمید کی طرح رومانیت کے طابع ساحل کی چہل پہل سے متاثر ہو کر کوئی رنگین افسانہ تحریر نہ کرے (اگر کیا ہو تو منظرِ عام پر نہ لائے) تو ایسے میں، میں فاضل مصنف کو دائیں بازو کا کہنے میں حق بجانب ہوں۔

میں اگر اس کتاب میں شامل چند افسانوں کو ایک جملے میں بیان کروں تو تصویر کچھ یوں بنے گی

افسانہ 'احمد انکل کے بچوں کا کیا ہوا'...... بچپن کی یادداشتوں کا بیانیہ ہے
افسانہ 'ٹیکسی ڈرائیور'...... عورت کے پاس صرف بدن نہیں ذہن بھی ہے
افسانہ 'گڑ کی ڈلی'...... علاقائی لب و لہجے میں غربت کے ماروں کا بیانیہ
افسانہ 'بھائی گیٹ کارو بن گوش'...... ایک امر افسانہ
افسانہ 'سیلف میڈ'...... فکرِ معاش میں رشتوں کے الجھتے دھاگوں کا بیانیہ
افسانہ 'امید بہار'...... زخموں سے نڈھال کراچی کا المیہ

ہر ایک افسانہ رشتوں میں گندھا ہوا ہے سماج کا ترجمان ہے ہر افسانے میں کہانی کے ساتھ زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے تمام تحریریں ہماری سماجی حقیقتوں کو بیان کرتی ہیں حساس شعور رکھنے والے دماغوں پر دستکیں ہیں کوئی بھی حقیقت ادباء سے تحریر میں اظہار چاہتی ہے اور فاضل مصنف بھی اسی راہ کے مسافر ہیں۔

یوں تو کچھ عرصے سے امین بھایانی صاحب سے مختلف فیس بک فورمز پر آمنا سامنا ہوتا ہی ہے لیکن کتاب کے آخر میں ان کا انٹرویو ہے جو میرے لئے نیا تجربہ تھا کہ کتاب میں موجود چودہ افسانے پڑھنے

کے بعد مصنف کی شخصیت کو جاننے کا موقع بھی ملا کہ ایک تخلیق کار تخلیق کے مرحلوں میں کیا کیا سوچتا ہے اس کے ذہن اور دل کے کینوس پر کیسے خیالات نقش ہوتے ہیں۔ المختصر

یہ کتاب واقعی ایسی جادوگر ہے کہ جسے پڑھ کر قاری کا ادبی ذوق مہمیز ہوتا ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر امین بھایانی صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ایک خوبصورت دل کا مالک اور قابل افسانہ نگار جس کی تحریر کسی بھی افسانہ یونٹ کی شان بڑھا دیتی ہیں آج ان کی کتاب نہ صرف میرے سامنے دھری ہے بلکہ کتب فروشوں کے پاس بھی دستیاب ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ کراچی کے امین بھایانی کا سفر بھائی گیٹ کے روبن گوش تک کیسا رہا ہے تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا...... بہت ہی دلچسپ!

☆☆☆

نام کتاب: دیوار
صنف: افسانہ
مصنف: جاوید نہال حشمی
تعداد: پانچ سو
قیمت: ۲۰۰ روپے
صفحات: ۱۶۰
رابطہ: 9830474661
مبصر: اقبال حسن آزاد

''دیوار'' اردو کے کہنہ مشق ادیب جاوید نہال حشمی کا اولین افسانوی مجموعہ ہے جس میں کل ملا کر تیرہ افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

نئی صبح، روبوٹ، دیوار، امیج، جواری، پرورش، لہو کا درد، تپش، تھرڈ امپائر چو ہنگم، کرچیاں، Besieged اور آنچ۔ یہ تمام افسانے ۱۹۸۷ء اور ۲۰۱۴ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ یعنی ان کا افسانوی سفر ستائیس برسوں پر محیط ہے۔ لیکن ان کا قلمی سفر بہت پہلے یعنی ۱۹۸۱ء ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ اول اول انہوں نے بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں لکھیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے سائنسی مضامین پر بھی طبع آزمائی کی...... انشائیے بھی لکھے اور ڈرامے بھی۔ ان کا ڈراما ''رجنی'' خاصا مقبول ہوا اور اسے کئی بار اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا۔

زیرِ نظر مجموعے میں مصنف کے عرضِ حال ''اپنی بات'' کے علاوہ کئی نامور لوگوں کی تقاریظ بھی

شامل ہیں۔ شموئل احمد، انیس رفیع، علی احمد فاطمی، فیروز عابد اور عاصم شہواز شبلی نے ان کے افسانوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں فلیپ پر اردو کے مستند افسانہ نگار صدیق عالم اور ماہنامہ انشاء (کولکاتا) کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز کی قیمتی آرا بھی شامل ہیں۔ ان تعارفی مضامین کی اہمیت و افادیت کی اپنی جگہ مسلّم جگہ لیکن ان میں ایک خرابی کی صورت بھی مضمر ہے۔ مثلاً جاوید نہال حشمی کا ایک کامیاب افسانہ ہے ''کرچیاں''...... اس افسانے کی کافی تعریف ہوئی لیکن جناب انیس رفیع نے اس افسانے کی افہام و تفہیم میں ساری کہانی کھول کر رکھ دی اور اس کے بعد جب میں نے افسانہ پڑھنا شروع کیا تو سارا لطف زائل ہو گیا۔ یہ ایک پُرتجسس نفسیاتی افسانہ ہے۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب شموئل احمد نے جس ہنرمندی کا ثبوت دیا ویسی ہنرمندی جناب انیس رفیع نہ دکھلا سکے حالانکہ وہ خود بھی ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔

جاوید نہال حشمی کے افسانے عام روش سے ذرا ہٹ کر ہیں اس لیے زیادہ متوجہ کرتے ہیں۔ اردو میں سائنس فکشن کی بڑی کمی ہے۔ جاوید نہال حشمی نے اس جانب توجہ کی ہے اور عمدہ افسانے پیش کیے ہیں۔ 'روبوٹ' اور 'Besieged' ایسے ہی افسانے ہیں لیکن افسوس کہ انہوں نے اس قسم کے افسانے زیادہ نہیں لکھے۔ اس مجموعے میں شامل کئی افسانے اساتذہ کو ذہن میں رکھ کر لکھے گئے ہیں جن میں استاد کو اعلیٰ کردار کا حامل دکھایا گیا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی ایسے لوگوں کو بدنام کرنے کی سازشیں بھی ہوتی ہیں اور یہ سازشیں اکثر کامیاب ہوتی ہیں۔

جاوید نہال حشمی کے افسانوں میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ ان کی نگاہیں زندگی کے مثبت پہلوؤں پر مرکوز رہتی ہیں۔ 'نئی صبح'، 'جواری'، 'پرورش' اور 'امیج' ایسے ہی افسانے ہیں۔ شروعاتی دور کے افسانوں میں ان کے ان کا انداز بیان سادہ تھا اور وہ اپنی بات راست انداز میں کہہ دیا کرتے تھے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں پختگی آتی گئی اور ان کے افسانے زیادہ معنی خیز ہوتے گئے۔ 'روبوٹ'، 'چو ہنگم'، 'کرچیاں'، اور 'Besieged' فنّی حسن کا نمونہ ہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ آئندہ ان کے افسانوں میں زیادہ پُرکاری، تہہ داری اور تخلیقیت دیکھنے کو ملے گی۔ نیک خواہشات کے ساتھ!

☆☆☆

نام کتاب: پیچھا کرتی آوازیں
صنف: افسانہ
مصنف: نعیم بیگ
مبصر: سید صداقت حسین۔ کراچی

ولیم ورڈزورتھ نے تحریر کے بارے میں کہا تھا کہ " Fill your paper with the breathings of your heart" عالمی ادب میں جنھوں نے اپنے دل سے تحریروں کو زندگی بخشی ان کے نام رہتی دنیا تک لیئے جاتے رہیں گے۔ اعلیٰ ادبی اظہار جہاں انسانی سوچ کو نئے زاویئے فراہم کرتا ہے وہیں ایک نئی روشن صبح سے روشناس بھی کراتا ہے ایسا ادب جہاں کسی شخص کی زندگی کا ایک اہم اور دلچسپ پہلو پیش کیا جائے جس میں ابتدا، ارتقا اور خاتمہ ہو جو انسان کو زندگی کے نئے پہلوؤں سے قریب تر کردے اسے ادبی اصطلاح میں ایک سچی اور حقیقی کہانی کہا جاتا ہے۔

مکمل افسانوی انداز لیئے یہ تحریریں اور انکے رنگ حیات آفرینی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ جس میں کسی ایک واقع کو بنیاد بنا کر کہانی کی تشکیل کی گئی ہو اور جس میں حقیقی زندگی کے کسی ایک جز کو لے کر کہانی بُنی گئی ہو۔ جس میں وحدت تاثر ہو، کہ پڑھنے کے بعد ذہن میں صرف ایک تاثر رہ جائے۔ رواں صدی میں ہمارے ادب نے اس حوالے سے کچھ نئی کروٹیں بدلی ہیں۔

معاشی انقلابات نے جہاں سماج پر گہرے اثرات مرتب کیئے ہیں وہیں ادب میں جمہوری شعور کی بیداری کے وہ عناصر بھی شامل ہوگئے جس نے دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا اور صدیوں کی محرومیوں، آرزوؤں اور خوابوں کو نئے معنی عطا کردیے۔ اس حوالے سے میں جب بھی نعیم بیگ کے افسانے پڑھتا ہوں تو وہ مجھے اس معیار پر پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں زندگی کی حقیقتیں ادب میں بڑے آب وتاب سے جلوہ گر ہیں۔

نعیم بیگ کے افسانوں کا مجموعہ ''پیچھا کرتی آوازیں'' ان کے فنی شعور کی وہ علامتیں ہیں جو قارئین ادب کو کثیر الجہتی عنوانات اور ان کی تشکیلات سے گزار کر فہم وادراک اور معنیاتی وسعتوں کے حیرت انگیز وسیلے عطا کرتی ہیں۔

نعیم بیگ صاحب نے اردو افسانے کو داستانوی ماحول سے نکال کر اس کا رشتہ زندگی سے قائم کیا۔ جہاں زندگی انکی کہانیوں میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا جہاں تہذیبی مظاہر کو عمدگی سے برتتی ہے وہیں مقامی فضا اور اردگرد کے ماحول کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں وہ شخصی اور اجتماعی لاشعور، معاشرتی صورت حال، سیاسی منظرنامے اور زندگی کے دوسرے مسائل اور وارداتوں کے بیان کی متنوع صورتیں پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

عالمگیریانے پر فکر کے مضبوط دھارے موجودہ معاشی نظام پر اپنی تنقیدی گرفت کو مستحکم کرتیدکھائی دیتے ہیں۔ کیپٹلزم کے منفی اثرات، جس کے نتیجے میں سماج کی دگرگوں حالت، ثقافتی اکھاڑ پچھاڑ اور شہری صارفیت پسند نفسیات نے ادبی منظرنامے کو یکسر تبدیل کر کے رکھدیا ہے۔ وہیں اس صورتحال میں حساس

قلمکار استعماریت اور اسکی پروردہ قوتوں کو علامتی حصار میں لیکر کاونٹر کر رہا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب میں استعماریت، جبر واستبداد، کے خلاف ایک سرد جنگ جاری ہے۔ جسکے علامتی محاذوں پر نظریاتی دانشوروں کا پہرہ ہے۔ نعیم بیگ اس سرد جنگ میں اپنی فکری قوتوں اور شعوری امکانات کے ساتھ ڈٹے دکھائی دیتے ہیں۔ ادب کا یہ نڈر سپاہی نا صرف میدان ادب میں جانفشانی سے لڑ رہا ہے بلکہ ایک ایسی نظریاتی فورس کو بھی تربیت دے رہا ہے جو سماجی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر لڑنے کا عزم رکھتی ہے۔

مذکورہ کتاب نعیم بیگ کے ایسے ہی فکری رجحانات کا اظہار ہے جو ادبی خودمختاری اور جمہوری ادب کا حسن ہے۔ ''پیچھا کرتی آوازیں'' نعیم بیگ صاحب کے علمی اور ادبی تجربوں سے حاصل کردہ نتائج کو اخذ اور انکے ماخذ کو سمجھنے میں نا صرف ذہنی وسعت کا باعث ہے بلکہ یہ ان تجربات کی روشنی میں ظہور پذیر کامیابیوں کو دیگر سماجی اکائیوں میں بھی خوبصورتی سے منتقل کر رہی ہیں۔

آج کی پوری معاشیات پر استعماری قوتوں کا قبضہ ہے۔ سرِ دست ان قوتوں کے زہرناک شکنجوں سے پوری انسانیت کو آزاد کرانا محال نظر آتا ہے اور دنیا میں کسی درجہ میں کوئی اجتماعی کوشش بھی نہیں دکھائی دیتی۔ مگر ایسے میں عالمگیر ادب جاگ رہا ہے جو اس نظام کی فراست کے آگے ایک بند باندھنے کی پوزیشن میں ہے۔ نعیم بیگ صاحب کی بیشتر کہانیوں کے تانے بانے اسی نظام کی خرابیوں کو طشت از بام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نعیم بیگ نے بہترین ادب کی ترجمانی کرتے ہوئے اس بات کے ثبوت فراہم کردیے ہیں کہ استعماریت کی گہری سیاہ رات میں بھی کاونٹر نیریٹیو سوچ اپنی پوری قوت کے ساتھ جاگ رہی ہے۔

ایک سچا ادیب اپنے ماحول اور ملک کی حقیقی صورتحال کا آئینہ ہوتا ہے۔ نعیم بیگ صاحب کی حب الوطنی ان کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ انکی دوررس نگاہیں اپنے مخصوص ادب میں جن پیشگوئیوں کا ذکر کر رہی ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔ نعیم بیگ کے دلوں کو چھو لینے والے موضوعات، انکی سیاسی فہم اور تدبر، اور ادبی فلسفیانہ روایات کے روشن پہلو میری اور تمام قارئین ادب کی سوچوں کو مہمیز کرتے رہیں گے۔

امن، محبت، سلامتی، علاقائی اور بین الاقوامی دوطرفہ تعلقات اور باہمی دلچسپی کے امور انکے کالمز کے محور ہیں۔ وہ ادب میں اعلیٰ قدروں کے ترجمان ہیں اسی لیئے عالمی افق پر انکی ادبی، سماجی اور سیاسی خدمات کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

''پیچھا کرتیں آوازیں'' پسے ہوئے پرولتاری طبقے کی آہوں سسکیوں کی بازگشت ہے جسکی صدا پر نعیم بیگ کا قلم لبیک کہہ رہا ہے۔

☆☆☆

نام کتاب: راج سنگھ لاہوریا
صنف: ناول
مصنف: اقبال حسن خان
مبصر: نعیم بیگ

بیسویں صدی کا آخری ربع پاکستان بننے کے فوراً بعد اس خطہ میں آنے والی نسل کے لیئے کچھ ایسا عجیب تھا جہاں تقسیم سے پہلے کی اخلاقی اقدار اپنی جوانسالی کے ساتھ پیدا ہونے والی نئی آفات کا سامنا کر رہی تھی وہیں بنتے ہوئے نئے سماج میں ایک معاشی ادھم مچا ہوا تھا۔ ہجرت کے غم میں مبتلا مہاجر اپنے ننگے جسموں کو پہلے دن سے ہی ڈھانپنے کی کوشش میں تھے اور پہلے سے یہاں مقیم آنے والوں کا استقبال تو کر رہے تھے لیکن معاشی زبوں حالی میں مبتلا، احساسِ کمتری کا شکار سیاسی ابتری انکا بھی المیہ تھا۔

تقسیمِ ہند اپنے اندر بہت سے نظریاتی پہلو لیئے ہمہ جہت و ہمہ صفت عناصر ترکیبی کو پناہ دیئے اپنی تہذیبی اور لسانی رویوں کی مدہم ہوتی آنچ کا آخری بھڑکتا ہوا شعلہ تھا۔ نئے آدم کی تخلیق میں گمشدہ تہذیبوں کی آنچ کو انڈسٹریل دنیا نے مدہم اور محدود کر دیا تھا۔ ترقی پسند تحاریک جہاں نو کی تلاش میں تھیں ہند کے دونوں منقسم حصوں میں ادیب پہلے اور بعد کے واقعات کو فکری رنگ سے شعوری طور پر نہ صرف ہم آہنگ کر رہے تھے بلکہ انسانیت کی بگڑتی صورت کو اپنے فکری ادراک کے بل بوتے پر نئے معنوں سے روشناس بھی کروا رہے تھے۔ اسی فکری عمل میں ایک نوجوان ادیب اقبال حسن خان سن اسّی کی دہائی میں اپنے آدرش لیئے ادب کی دنیا میں نئے امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔ روائتی کہانیوں سے ہٹ کر اپنے پورے سماجی، تہذیبی اور لسانی امکانات کو اپنے قلم کی نوک پر لاتا ہے۔ ڈرامہ اسکا پسندیدہ عشق تھا۔

وہ ڈھکے کی چوٹ پر سیاسی عوامل پر بھی بات کرتا ہے اور اسکے اثرات لیئے جو عناصر تہذیب کی لسانی اور معاشی تشکیل میں پس رہے ہوتے ہیں ان پر کھل کر بات کرتا ہے۔ وہ تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں آئے ایک بڑے شہر لاہور کی تہذیبی طور پر منقسم معاشرت پر قلم اٹھاتے ہوئے جھوٹ کی تہہ در تہہ پرتوں کو یوں اپنے قلم سے کھول دیتا ہے کہ دن۔ م راشد کو کہنا پڑا۔ ''کہ ہماری تہذیب اب اتنی بوسیدہ ہو چکی ہے کہ اسے کسی میوزیم کے سپرد کر دینا چاہیئے۔''

اس ناول میں اقبال حسن خان بہت سے سوال بھی اٹھاتا ہے۔ جن کے جوابات ابھی تک تشنگی کا شکار رہے ہیں۔ اور شائد ایک مزید صدی ان جوابات کو دیتے گزر جائے۔

راج سنگھ لاہوریا کے پیشِ لفظ میں خود کہتا ہے۔ ''تشکیل پاکستان کیوں ہوئی؟ پاکستان کا بننا کیا تھا؟ یہ

مسلمانوں کے حق میں ایک مثبت قدم تھا یا سازش؟ علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر تھی، جناح صاحب کی محنت یا ضد؟'' لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ''ہزاروں برس سے کسی ایک سرزمین پر رہنے والے خاص طور پر مشرقی پنجاب کے مسلمان اور مغربی پنجاب کے ہندو اور سکھ جس کرب سے گزرے ہیں وہ اپنی جگہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ وطن سے جدائی، بیواؤں سے جدائی اور اپنی اس مٹی سے جدائی جو رزق کا وسیلہ بھی تھی، کوئی آسان فیصلہ نہ رہا ہوگا۔''

پھر انہی سوالات کا جواب دیتے ہوئے اقبال حسن خان کا قلم اسقدر تیزی سے زرعی تہذیب کی لسانی تشکیل اور اس کے نئے شہری اور فکری افق کو بے نقاب کرتا ہے کہ قاری واہ واہ کر اٹھتا ہے۔ ایسے ایسے واقعات جو غیر محسوس طریقے سے اپنی لسانی، جذباتی، احساساتی اور سیاسی بصیرت کو زبان دیتے ہیں کہ مروجہ حوالے عش عش کر اٹھیں۔ ضامن بھائی کا کردار وہ حقیقی کردار ہے جو تشکیل نو میں اپنی جگہ بناتا ہے لیکن جس طرح سے اقبال حسن خان کا قلم اسے قرطاسِ ابیض پر اتارتا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ ان کے کردار یوں تو سماجی اور سیاسی شعور کے کسی فارمولے کے مقید نہیں ہیں لیکن جن خطوط پر وہ اپنی انسانی زندگی کا سفر جاری رکھتے ہیں وہاں علامتوں کی تشریح کا ایک شمہ نہ ہونے والا سلسلہ ملتا ہے۔

خوشگوار پیرا ہن، کشادہ لمحات اور متنوع لسانی تراکیب انکی تحریر کے ایسے پہلو ہیں جسے قاری اپنی نظروں کے سامنے متحرک محسوس کرتا ہے۔ زمانی لحاظ سے یہ ناول تقسیم ہند کے فوراً بعد کے حالات سے مرقع ہے لیکن یہ انہی کے قلم کا خاصہ ہے کہ اسے یہ کئی ایک دہایوں کے بعد نہ صرف کنسیو کرتے ہیں بلکہ ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔

انکا مکالمہ قاری کو الجھاتا نہیں بلکہ خوشگوار تاثر کے ساتھ جزیات سے ادبی حظ دیتا ہے۔ ان کی تحریر پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ اسی زمانے کا ایک فرد ہے۔ دہلی کی زبان اسکی تراکیب اسکی کلاسیکٹ اور حسیاتی لفظی تصاویریوں سامنے آتی ہیں کہ انکا جمالیاتی حسن اور نمایاں ہو جاتا ہے۔

آخر میں میں یہ ضرور کہونگا کہ ہجرت کا کرب اور معاشی استحصال میں پھنسے جبر کا شکار خطے کے دونوں طرف کے عوام ہوئے ہیں اور یہی شائد اقبال حسن خان کا ذاتی کرب بھی ہے جسے انہوں نے اپنے قلم سے قاری تک پہنچا دیا۔ میں انہیں اس ناول پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس ناول کو ایک سے زائد بار بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

« • »

ثالث پر تبصرے

● **غلام نبی کمار**
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونورسٹی، 7053562468،
gnkumardu@gmail.com

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ یہاں مختلف طبقوں، فرقوں اور مذاہب کے لوگ رہتے ہیں جو مختلف زبانیں بولتے ہیں لیکن اردو واحد ایسی زبان ہے جو بلا تفریق و تمیز اور ذاتی و نسلی بھید بھاؤ کے ہر مذہب، کلچر اور تہذیب کی نمایندگی بڑے ہی طمطراق انداز میں کرتی ہیں۔ یہی وہ زبان ہے جو ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس میں ہر چھوٹا بڑا اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کی ترسیل اور ترجمانی بنا کسی مشکل کے بہت ہی آسانی سے کر سکتا ہے۔ اردو زبان کو فروغ اور بقائے دوام بخشنے میں رسائل و جرائد نے ایک اہم اور قابلِ ذکر رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے مختلف اوقات میں وقتاً فوقتاً نامور اور معتبر و موقر رسائل کی اشاعت ہوتی رہتی ہیں۔ جو ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، دو ماہی، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ وغیرہ وقفہ کے اندر شائع ہوتے ہیں۔ ان میں ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی، اقتصادی، معاشی، تہذیبی، اخلاقی اور ثقافتی وغیرہ جیسے موضوعات پر مضامین اور دیگر تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ رسائل و جرائد قاری کی دلچسپی اور تفریح کا پورا سامان فراہم کرتے ہیں۔

ادبی صحافت کے میدان میں سرزمین بہار متنوع حیثیت کی حامل ریاست بن گئی ہے۔ ابتدا سے تا حال یہاں اتنے رسائل و جرائد کا وجود ممکن ہوا ہے۔ کہ بہار کی سرزمین کو تاریخ کے پنوں میں اندراج کرانے اور اسے زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ حق تلفی ہوگی اگر ان ادبی جریدوں کے نام نہ لئے جائیں جو آج کے قارئین حضرات کے دل، دماغ اور ذہنیت پر اپنی گہری چھاپ چھوڑنے کے علاوہ اپنا گہرا تاثر قائم کر رہے ہیں۔ یہ رسائل اردو زبان و ادب کے مشہور و معروف شعراء، ادبا، افسانہ نگار اور ناقدین حضرات وغیرہ کے زیرِ سرپرستی شائع ہو رہے ہیں۔ کون ہے جو بہار اردو اکاڈمی کے ماہنامہ رسالہ ''زبان و ادب'' کے معیار سے واقف نہیں ہے، کون ہے جو سہ ماہی ''در بھنگہ ٹائمز'' کا معترف نہیں ہے، کون ہے جو سہ ماہی ''جہان ادب'' کا دلدادہ نہیں ہوگا۔ اور کون ہے جو سہ ماہی ''ثالث'' کے علمی و ادبی تدبر اور وقعت

آمیزیت کا پرستار نہیں ہے۔ مذکوہ رسائل بالترتیب جناب مشتاق احمد نوری صاحب، جناب منصور خوشتر صاحب، جناب مشتاق احمد صاحب اور جناب اقبال حسن آزاد صاحب کے زیرِ نگرانی استقلال کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن یہاں پر زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان رسالہ ''ثالث'' پر تبصرہ کرنا مقصود ہے۔

رسالہ سہ ماہی ''ثالث'' جو اردو کے قادر الکلام شاعر، معروف ادیب و مصنف، اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار، معتبر ناقد، نقد آور محقق، جہاں دیدہ مبصر اور ادبی صحافت کے معمار محترم اقبال حسن آزاد صاحب کی ادارت اور زیرِ نگرانی میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے میں موصوف کی حیثیت بانی اور مدیر اعزازی کی ہیں۔ جبکہ مدیر ثالث آفاق صالح اور نائب مدیران (معاونین) کے فرائض طیب رضا اور اعجاز رحمانی انجام دے رہے ہیں۔ ''ثالث'' کے اب تک آٹھ شمارے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس کا ہر شمارہ کتابی سلسلہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ رسالہ زیرِ ISSN 2348-1129 نمبر جیسی خصوصیت کا حامل بھی ہے۔ بلا شبہ سہ ماہی ''ثالث'' کا وجود اردو کی ادبی صحافت کے روشن مستقبل کی جانب پیش رفت کہا جا سکتا ہے۔

''ثالث'' کے جلد نمبر ۲ کا شمارہ نمبر ۸ اس وقت زیرِ تبصرہ ہے۔ جب ہم اس رسالے کی فہرست مشمولات پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادب کی بیشتر اصناف کو شاملِ رسالہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جس سے یہ رسالہ قارئین حضرات کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوا ہے۔ گزشتہ شماروں کی طرح مذکورہ شمارہ بھی حسبِ معمول بشاش بشاش تحریروں سے جا بجا مزین نظر آتا ہے۔ اس کے فہرست عنوانات میں حمد و نعت، غزلیں، نظمیں، مضامین، اعتراف، گوشۂ انتظار حسین، خاکہ، افسانے، مکالمات، فلیش فکشن، ناول کا ایک باب، تبصرے اور مکتوبات وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس شمارے میں نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی قلمکاروں نے بھی اپنے تخلیقی اور فنی جواہر کا بھرپور مظاہرہ پیش کیا ہے۔ جو کہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ''ثالث'' نے نہایت ہی کم مدت یعنی قلیل عرصے میں نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی شہرت کا پرچم لہرایا ہے۔ لکھاریوں میں امتیاز نہ برتتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے تخلیق کار و قلمکار نے رسالے میں جگہ پا کر اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ جو کہ رسالے کی کامیابی کا ایک اور جواز پیدا کرتا ہے۔ گویا نئے لکھاریوں کے لئے بھی حقیقی معنوں میں ایک عمدہ پلیٹ فارم قائم کرنے کی ایک جاندار کوشش ہے۔ جو قابلِ سراہنا بھی ہے اور قابلِ ستائش بھی۔ یقیناً اس کامیابی کا سہرا ادارہ ''ثالث'' کے متحرک و فعال منتظمین کے سر ہی باندھا جا سکتا ہے۔

''ثالث'' کے شمارہ نمبر ۸ میں پیش کی گئی تحریرات اور نگارشات کی ابتدا ''اداریہ'' سے لکھ کر کی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ اداریہ کو کسی بھی رسالے کی جان قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اردو رسائل کے

اداریہ نویس اداریہ میں ہمیشہ سے اہم ادبی مسائل، واضح نقطہ نظر اور تصور خیال کو اجاگر کرتے آئے ہیں اور حقیقت میں مذکورہ شمارے کے اداریہ سے بھی اداریہ نویسی کی حق تلفی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں حق شناسی ادا ہو جاتی ہے۔ جس میں افسانے میں دلچسپی پیدا کرنے والے بنیادی عناصر کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس اداریہ میں افسانہ، افسانہ کے بیانیہ، اس کے ٹریٹمنٹ اور اس کے لفظیاتی نظام پر گرفت حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ کی فنی وفطری خوبیوں اور دلچسپ موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ تجریدی اور علامتی قسم کے افسانے پر بات کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ایسے افسانے لکھنا کوئی معیوب نہیں ہے لیکن افسانہ نگار کو چاہئے کہ اس قسم کے افسانوں میں ایسی علامتیں استعمال کی جائیں جو شناسا ہو اور افسانے کے حسن کو بڑھانے میں معاون و مددگار ہوں تا کہ قاری افسانے کو پڑھتے ہوئے لطف اندوز ہو جائیں۔ اداریہ کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس میں عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور ترکی کے الفاظ بھی شامل ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں اردو کی گرامر سر تا سر ہندی ہونے کی بات کہی گئی ہے اور ثبوت کے طور پر ہندی کے کئی الفاظ مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں جس کا ہمیں اصرار بھی ہیں۔ بعض ناقدین اور قارئین افسانہ نگار کو خالص اردو اور حسب منشا زبان کے استعمال کے دائرے میں مقید رکھنا چاہتے ہیں اور غیر ملکی زبان کے الفاظوں کے استعمال کو معیوب سمجھتے ہیں جو کہ افسانے کے فن اور اس کے حسن کو مجروح کر دینے کا موجب بنتا ہے۔ زبردستی کے ٹھونسے ہوئے الفاظ خواہ وہ کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں افسانے کے حسن کو بگاڑ دیتے ہیں۔ برعکس اس کے افسانے میں مقامی زبان کے الفاظ اور مکالمے اسے مزید دلکشی عطا کرتے ہیں۔

اداریہ کے بعد ''مہمان اداریہ'' میں ڈاکٹر منظر اعجاز نے ''متن سے مکالمہ'' کے عنوان سے ایک نہایت ہی عمدہ موضوع کو چھیڑا ہے۔ جس میں انھوں نے ابتدا میں تخلیق کار سے تنقید نگار بننے کی صراحت کی ہے اور لکھا ہے کہ اسے تخلیق کار کی حیثیت کسی طرح کمتر نہیں ہوتی بلکہ اسے تخلیق کار کی ترقی یا پروموشن سے منسوب کیا جائے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ قرأت ہی متن کو بے معنی یا بامعنی بناتی ہے اس حوالے سے بعض اہلِ ادب متن کی قرأت کے حوالے سے کئی سوال اٹھاتے ہیں کہ متن کو کیسے پڑھیں اور کیسے نہ پڑھیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایسے پڑھیں اور ایسے نہ پڑھیں۔ جبکہ ادب کی تخلیق ہو یا تنقید بہر صورت دانش و بینش کا مطالبہ کرتی ہے۔ ادب یا تخلیقی متن کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے والا قاری اپنے ادراکی قوت کی بنیاد پر متن سے اپنے ہی طور پر معنی اخذ کرتا ہے۔ گویا یہ بھی میلان طبع پر منحصر ہے۔ اداریہ نگار لکھتا ہے کہ متن ساز یا متن نگار بھی اپنے طور پر خوبیوں کی وضاحت کرتا ہے اور قدر و قیمت بیان کرتا ہے لیکن بہر حال اس کا مال بازار کے رجحان پر منحصر ہے۔ جس کا احساس و ادراک اسے خود بھی ہوتا ہے۔ قاری کو اس سے سروکار نہیں کہ مصنف یا شاعر کے

دل میں کون سا خیال پیدا ہوا، یا وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ قاری اپنے طور پر تخلیق کا مفہوم مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض متن سے معنی کا جہاں پیدا ہوتا رہے گا اور متن کے حوالے سے متن نگار کا وجود زندہ و پائندہ رہے گا۔

سابقہ شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی حمد و نعت کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے محمد شفیع الرحمٰن شفیع صاحب کے نعتِ شریف بعنوان ''حمد باری تعالیٰ'' سے رسالے کے مشمولات کی ابتدا کی گئی ہے۔ واقعی اس نعتِ شریف کو پڑھ کر دل لبریز اور سرشار ہوتا ہے۔ جس میں موصوف خالق اللہ تبارک تعالیٰ کی اپنے مخلوقات کو عطا کی گئی بے شمار نعمتوں اور لازوال تحائف کا نام گنوا کر لاکھ لاکھ شکر بجا لائے ہیں۔ ان کا دوسرا نعتِ شریف بھی پُر اثر ہے۔ غزلیات میں سلطان اختر، رحمان حفیظ، افتخار حیدر، اشرف یوسفی، عظیم فاطمی، انجم عثمانی، صدف اقبال، طارق متین، ذوالفقار نقوی، منصور خوشتر، مسلم نواز، اصغر شمیم اور دیا جیم جیسے صاحبان کی تخلیقی کاوشیں رسالے کی زینت بڑھانے میں خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ مذکورہ شاعروں کی غزلوں کے میرے چند پسندیدہ مطلعے ملاحظہ ہوں:

فسانہ ختم تھا روشن رہی تحریر مدت تک
ہمارے رو برو تھی خوش نما تصویر مدت تک (سلطان اختر)

خانہ برباد ہوئے بے در و دیوار رہے
پھر بھی ہم ان کی اطاعت میں گرفتار رہے (سلطان اختر)

یہی موقع ہے چلو حد سے گذر جانے کا
راستہ کوئی نہیں لوٹ کے گھر جانے کا (طارق متین)

کوچۂ یار کے اب جور و ستم یاد نہیں
شوقِ دل، راہ گذر، شہرِ صنم یاد نہیں (منصور خوشتر)

زخمِ شب دیکھ کیسے رفو ہو گیا
چاند تیری طرح ہو بہو ہو گیا (دیا جیم)

متذکرہ بالا غزلوں کے علاوہ تقریباً تمام شاعر و شاعرات کی غزلوں کا فن مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ غزلوں کے بعد شہناز شاذی کی دو بہترین نظمیں ''اسم'' اور ''اس طرح بھی ہوتا ہے'' کے عنوان سے بھی رسالے میں شامل ہیں۔ حصہ مضامین میں ''سہیل عظیم آبادی پر پریم چند کے اثرات'' ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا تحریر کردہ بے حد عمدہ مضمون ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے سہیل عظیم آبادی کو پریم چند اور یلدرم اسکول کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی کے چند مشہور افسانوں پر

سرسری گفتگو کرنے کے علاوہ افسانوں میں اپنائے گئے ان کے نظریات، موضوعات، مکالمات اور کردار نگاری وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دیہی اور شہری قسم کے افسانوں کی تخلیق پر بھی ان کے عبور ہونے کی مضمون غمازی کرتا ہے۔۔ مضمون

نگار لکھتے ہیں کہ سہیل عظیم آبادی کو پریم چند کے ساتھ تقابل یا موازنہ کرتے ہوئے انہیں پریم چند کی روایت کا امین، پریم چند کا افسانوی وارث اور پریم چند کے رنگ کا افسانہ نگار کہا جانے لگا۔ جو بالکل درست نہیں۔ جس کو موصوف نے مثالوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ یہ ادبی اعتبار سے انفرادی نوعیت کا حامل مضمون ہے کیونکہ اس نوعیت کے مضامین آجکل کے رسائل میں کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خصوصاً سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کے حوالے سے نئی باتوں کا علم ہوا ہے۔ فرحان دیوان علیگ کا مضمون ''سرسید کی تعلیمی سرگرمیاں'' میں سیر سید کی تعلیمی سرگرمیوں اور ان کے فکری نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے دورِ حاضر میں ان کی تعلیمی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالنے کی جاندار کوشش کی گئی ہے۔ اس حصے کے دیگر مضامین میں ''تحقیق اور اس کے مسائل'' از نوشاد کامران اور ''شبلی کی تنقید پر حالی کے اثرات'' از محترمہ ممتحنہ اختر کے مضامین بھی بصیرت افروز و معلومات افزا ہے۔ مزید ادارہ ''ثالث'' نے ''اعتراف'' اور ''امکانات'' کا ایک نیا سلسلہ قائم کر کے قارئین کی توجہ کو اپنی جانب مائل کیا ہے۔ اوالذکر میں مضامین جبکہ آخرالذکر میں افسانے پیش کئے گئے ہیں۔ اعتراف میں شامل مضامین ''طارق متین: احساس سے اسلوب تک'' از راشد طراز اور ''اسرار گاندھی کے افسانوی فکر و فن میں تخلیقیت افروزی'' از اجے مالوی جیسے مضامین بھی دلچسپی سے شرابور ہیں۔ طارق متین جو کہ عصرِ حاضر کے ایک اہم شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ مضمون نگار نے طارق متین کو معاصر تخلیقی حسیت کا نمائندہ شاعر قرار دینے کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کی سطح پر صاحب اسلوب کے درجے پر فائز ہونے جیسی آرا سے بھی باور کرایا ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ نگار نے موصوف کی تخلیقی انفرادیت کی چیدہ چیدہ خصوصیات کو بے حد خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ اگر قارئین حضرات اسرار گاندھی کے افسانوی فکر و فن سے واقف نہیں ہوئے ہوں تو اجے مالوی کا مضمون موصوف کے افسانوی سفر کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ اجے مالوی یوں تحریر فرماتے ہیں:

''اسرار گاندھی نے عصرِ حاضر کے تقاضوں اور ضرورت سے اپنی آنکھیں نہیں چرائی ہیں بلکہ انھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہیں اور اپنے اردگرد کے ماحول کے ساتھ ساتھ زندگی کے نت نئے تجربات سے بصیرت و آگاہی حاصل ہیں اور ان کو اپنے افسانے کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے''۔

حال ہی میں اردو زبان کے مشہور افسانہ نگار انتظار حسین اس جہاں فانی کو خیر آباد کہہ گئے۔ اس طرح اُن کے اعزاز میں اس شمارے میں ایک خصوصی گوشہ شائع کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا

ہے۔ جس کی ابتدا ''کوائف'' انتظار حسین سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ''انتظار حسین سے ایک گفتگو'' کے عنوان سے انٹرویو شامل کیا گیا ہے۔ یہ انٹرویو رسالہ ''شب خون'' الہ آباد، شمارہ ۱۹۶، جولائی ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اسے ''ثالث'' میں اسرار گاندھی صاحب کے توسط سے بشکریہ ''شب خون'' کاپی کر کے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو میں میزبان شمس الرحمٰن فاروقی اور رپوٹر کی خدمات کے فرائض چودھری ابن النصیر نے انجام دی ہیں۔ جبکہ انٹریو کے شرکا میں میزبان اور رپورٹر کے علاوہ ضیاء الحق، ساجد رشید اور اسرار گاندھی قابلِ ذکر احباب بھی شامل ہیں۔ عمر فرحت کا مضمون ''انتظار حسین کا فسانوی چلن'' کے موضوع پر مشتمل ہیں۔ چونکہ انتظار حسین افسانوی دنیا کا ایک بہت بڑا، معتبر اور شہرت یافتہ نام ہے۔ ان کے افسانوی ادب کا جائزہ ایک بسیط مقالے کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن مضمون نگار نے بھی ان کے معروف افسانوں جیسے آخری آدمی، زرد کتا، کچھوے، شہر افسوس، کایا کلپ وغیرہ کا تجزیہ سرسری ہی سہی لیکن جس انداز میں کیا ہے وہ ان کے زیرک مطالعہ کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انتظار حسین کے افسانوں میں اسلوب، ہیئت اور تکنیک کے جو تجربے ہوئے ہیں اور جو موضوعات انھوں نے اپنے تخلیقات میں برتے ہیں کو نہایت شستگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ رافد اویس بھٹ نے اپنے مضمون ''انتظاریات: مضمرات و ممکنات'' میں اپنے شعور کی کارفرمائیوں اور تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کو بروئے کار لا کر انتظار حسین کی تخلیقی، موضوعی اور فنی شعور کا عرق ریزی کے ساتھ محاکمہ کیا ہے۔ ایک جگہ یوں تحریر کیا ہے۔

''افسانے کے اسالیب کی بات ہو یا موضوعات کی، دونوں سطحوں پر وہ نئے پن کے متلاشی رہے ہیں۔ اُن کی اہمیت صرف اس بات میں مضمر نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہجرت اور افراد کا تہذیب و ثقافت سے کٹ جانے جیسے عناصر کا ذکر اکثر کیا ہے۔ ہاں البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ناقدین نے انتظار حسین کی تحریروں میں مذکورہ عناصر کو لے کر اپنی تنقیدی صلاحیت کا فرض ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریریں ابھی بھی مکمل تفہیم کی تلاش میں ہیں۔ انہیں چند ایک موضوعات میں قید کرنے اور اُن کی شخصیت اور تحریروں کو محدود کرنے کے بجائے اُن کی تخلیقات کو کلی طور پر پرکھنے کی ضرورت ہے تا کہ اُن کی مکمل تفہیم ممکن ہو سکے''۔

اس حصے کا آخری مضمون ''سماج ادب کا آئینہ ہے'' سید عمران بلخی کا تحریر کردہ ہے۔ یہ ایک تاثراتی نوعیت کا دو صفحوں پر مشتمل ایک ایک چھوٹا سا مضمون ہے۔ اس خصوصی گوشے کے لئے انتظار حسین کی تخلیقات سے ایک خاکہ بعنوان ''اے حمید: افسانہ نگار جو پہلوان بنتے بنتے رہ گیا'' اور ایک افسانہ ''پسماندگی'' کے عنوان سے جیسی دو تحریریں اخذ کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے نمائندگی کے لئے انتظار حسین کی ایسی دو تحریروں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں اُن کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

اس شمارے کے حصہ ''افسانے'' میں شامل سات افسانوں میں ''تحفہ'' (عتیق الرحمٰن)، ''کچھ حقیقت کچھ فسانہ'' (عطاء الرحمٰن خاکی)، ''غریب آباد'' (سید کامی شاہ)، ''سسکیاں'' (سلمٰی جیلانی)، ''نسل'' (نسترن احسن فتیحی)، ''خلیج'' (نوشابہ خاتون) اور ''گرہن گاتھا'' (فارحہ ارشد) قابلِ ذکر ہیں۔ مزید تین افسانے حصہ ''امکانات'' میں بعنوان ''سچا'' (ہما فلک)، ''سگنل'' (احمد عرفان) اور ''الّو کا پٹھا'' (فرحانہ صادق) بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ جس سے شمارے میں افسانوں کی کل تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ غریب آباد، نسل، سسکیاں اور خلیج جیسے افسانوں کے موضوعات عصرِ حاضر کی پیڑھی پر موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو نہایت ہی کسمپرسی، مفلسی، لاچاری و بے چارگی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اُن کے دلوں میں بھی تمنائیں اور خواہشات پلتی ہیں اور مشکل سے ہی اُن کے خوابوں کی تکمیل ہو پاتی ہے اور غریب سے غریب آباد کے خواب کی تعبیر کبھی خواب بن کے ہی رہ جاتی ہے۔ افسانہ ''غریب آباد'' میں افسانہ نگار نے غریب کی ایسی زندگی کو چپکلی جیسے حقیر کیڑے سے خوف کھاتے دکھایا ہے۔ افسانہ ''سسکیاں'' میں فسادات، بدامنی، قتل و غارت گری، ہجرت اور تہذیبی قدروں کی ہورہی پامالی کے موضوع کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ ''نسل'' میں سماجی طبقے کے اُن افراد کو جو اپنے آپ کو پڑھا لکھا، باشعور، مہذب یافتہ اور اعلیٰ درجے کا حامل تصور کرکے بے زبان اور کمیاب جانوروں کا جنگل میں جاکر بے تحاشا شکار کرکے اپنے تفریح کا سامان سمجھتے ہیں، پر گہرے الفاظ میں طنز کیا گیا ہے اور بعد میں اس گناہِ عظیم کا مجرم جنگل میں رہنے والے ایک بے گناہ غریب، نادار، مظلوم اور مفلوک الحال انسان کو قرار دیا جاتا ہے۔ جن سے کسی حد تک جنگلات کا تحفظ بھی ممکن ہے۔ اس شمارے کے دیگر افسانوں میں بھی عمدہ، دلچسپ، تجسس کُن اور منفرد موضوعات کی عکاسی کی گئی ہیں۔ نہ صرف موضوعات بلکہ یہ افسانے پلاٹ، کردار، مکالمے، اظہار و زبان و بیان وغیرہ کی سطح پر بھی قاری میں مطالعہ کے تئیں تحریک پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر سب افسانوں کے حوالے سے انفرادی طور پر بات کی جائے تو یہ تبصرہ اور زیادہ طوالت کا متقاضی ہوگا۔ ''فلیش فکشن'' کو ہندوستان میں ابھی کچھ جریدوں نے ہی اہمیت دی ہے جن میں ''ثالث'' بھی پیش پیش ہیں۔ اس شمارے میں اس موضوع کے تحت ڈاکٹر سہیل کی تحریر ''ایلین'' نے جگہ پائی ہے۔ اس میں تقسیم کو انسانی زیست کا ایک بہت بڑا المیہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ چاہے زمین کی تقسیم ہو یا اپنوں کی تقسیم، خاندانوں کی تقسیم ہو یا وراثتوں کی تقسیم۔ غرض تقسیم ہر حالت میں تباہی و بربادی اور انسانی جان و مال کی زیاں کا سبب بنتی ہے۔ ''ناول کا ایک باب'' میں اقبال حسن خان کے ناول ''راج سنگھ لاہوریا'' کا ایک باب شائع کیا گیا ہے۔ جس کا سلسلہ مسلسل کئی اقساط تک جاری رہنے والا ہے۔ ناول کے اس حصے میں قاری جس استغاثہ کا طالب تھا حقیقتاً اُس کا صد فیصد حق ادا ہوا ہے۔ ناول نگار نے

جس خوش بیانی سے ناول کو آراستہ پیراستہ کرکے اور اس کے غرض و غایت کی ایضاح کی ہیں اُسے ناول کے مطالعہ کو طبیعت مائل ہوجاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہلِ زبان اور اولوالباب حضرات اس کی کُمک کے ساتھ ساتھ اس کی توثیق بھی کریں گے۔ کتابوں پر شائع کیے گئے تبصرے رسالہ ''ثالث'' کی خوبی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ جن تین کتابوں پر تبصرے ہوئے ہیں ان میں چمن در چمن (ڈاکٹر سکندر اعظیم)، آواز (حسین مجروح) اور مجتبیٰ حسین بحیثیتِ مزاحیہ خاکہ نگار (ارشاد آفاقی) شامل ہیں۔ جن کے تبصرہ نگار بالترتیب ڈاکٹر منظر اعجاز، نعیم بیگ، اور ڈاکٹر ریاض توحیدی ہیں۔ مزید برآں ''ثالث'' کے شمارہ نمبر (۷) پر جن اہلِ قلم حضرات کے تبصرے شائع ہوئے ہیں ان میں نعیم بیگ، سلمٰی جیلانی اور عین تابش شامل ہیں۔ ''مکتوبات'' کے عنوان سے نو اُدبا کے خطوط رسالے کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔ جن کے مکتوب نگار ولی عالم شاہین، راشد جمال فاروقی، ذکی طارق، اسرار گاندھی، نوشابہ خاتون، عشرت ناز، شاہین کاظمی، نگار عظیم، ڈاکٹر سید سرفراز الہدیٰ قیصر قابلِ ذکر ہیں۔ اس رسالے کی دفاع میں ہر اعتبار سے پاکیزگی کی سند پیش کی جاسکتی ہے۔ ''ثالث'' کی خوبیوں اور تعریفات کا سلسلہ یہی پر نہیں تھمتا بلکہ اس میں ادب کی مختلف اصنافِ سخن سے متعلق کتابوں، رسائل جرائد اور ادبی خبروں کی تشہیر بے حد اعلیٰ پیانے پر کی جاتی ہے۔ اقبال حسن آزاد صاحب نے رسالے کے نام سے اشاعت کا اپنا باقاعدہ اور باضابطہ ادارہ بھی قائم کررکھا ہے جہاں سے یہ رسالہ شائع کیا جاتا ہے۔ ''ثالث'' کے لئے اعلیٰ کوالٹی کے کاغذ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی معیار کا اعلیٰ جریدہ رسالہ سہ ماہی ''ثالث'' کا ہر شمارہ دوسو سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہوتا ہے جو کہ اس کی ضخامت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہر شمارہ نہایت ہی دیدۂ زیب اور من موہ لینے والا ہوتا ہے۔ مذکورہ شمارے کا سرورق دیدنی ہے جس کے پُشت پر انتظار حسین کی بے حد خوبصورت تصویر بھی ثبت ہے۔ اس رسالے کے ہر عام شمارہ کی قیمت ۱۲۵ روپے رکھی گئی ہے جو رسالے کی ضخامت اور معیار کے اعتبار سے نہایت ہی کم ہے۔ یقیناً قارئین حضرات کے لئے یہ دام قابلِ قبول ہوگا۔

قارئین حضرات کو اس بات سے آگاہ کراتے ہوئے کہ ''ثالث'' کا اگلا شمارہ یعنی جلد نمبر ۲ کا شمارہ نمبر ۹-۱۰، مشترکہ شمارہ کہلائے گا جو ''فکشن نمبر'' پر مشتمل ہوگا۔ جس میں اردو کی ایک داستان سے اقتباس، ناول کا ایک باب، ایک مکمل ناولٹ، چنندہ اور غیر مطبوعہ تازہ افسانے، متعدد غیر مطبوعہ افسانچے، فلیش فکشن اور مائکرو فکشن کی مثالیں پیش کی جائیں گی اور داستان، ناول، افسانہ، افسانچہ، فلیش فکشن اور مائکرو فکشن پر تنقیدی مضامین مضامین شامل ہوں گے۔ اس خاص شمارے کی ضخامت ۴۴۴ صفحات ہوگی اور قیمت صرف ۳۰۰ ہندوستانی روپے۔ غیر ممالک سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی اس سے بہ آسانی حاصل کرسکتے ہیں۔

اب آخر میں گنگا جمنی تہذیب کی پاسدار اردو زبان کے دشمن عناصر حضرات کو اپنی آرا سے واقف

کراتے ہوئے جو اردو زبان کی غیر تسلی بخش ترقی اور زوال پذیری کی بات کررہے ہیں اور اس کے تئیں مؤثر اقدام اُٹھانے اور لائحہ عمل بنانے کے لئے متفکر ہیں۔ مزید ایک طرف اردو زبان کی وسعت، اس کے فروغ، اس کی بقا اور اس کے تحفظ کی بات کرتے ہوئے تھکتے ہی نہیں ہے اور دوسری جانب اردو زبان کے خدمت گذاروں کے حوصلے پست کرنے میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ دراصل اردو زبان کا دائرہ کار بہت وسیع ہے اور اس کی متنوع حیثیت غیر محدود ہے۔ دراصل یہ بات یہاں پر کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی۔ کیونکہ ''ثالث'' کے معیار اور اس کے بانی اور مدیرِ اعلیٰ اقبال حسن آزاد صاحب کی ہمت کو کئی دشمن عناصر نے للکارنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اِن کی اولوالعزمی، علوہمتی، غیر معمولی قوتِ ارادی اور کارشناسی نے اُنہیں شرمسار کرنے پر مجبور کردیا۔ شاید ایسے اردو داں دشمنان سمجھتے ہیں کہ نام نامی رسالہ یا اس کے منتظمین کو تنقید کا نشانہ بنا کر اُن کی شخصیت نمایاں ہوں گی۔ لیکن یہ شہرت کا نہیں بلکہ اُن کی تذلیل کا باعث ہیں۔ اسطرح رسالہ ''ثالث'' آج بھی بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ مسلسل شائع ہورہا ہے۔ اور اس کی ترقی میں کوئی کم و کاست یا رخنہ نہیں پڑا ہے بلکہ یہ رسالہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوکر اپنی مسافت طے کرتا جارہا ہے۔

«●»

● نعیم بیگ

ثالث شمارہ ۸ اس بار اپنی روائتی تاخیر کو شکست دیتے ہوئے بروقت پہنچ گیا ہے۔ ان دو ملکوں کے درمیان سفر کرنے والے ادبی جرائد بالعموم راستے کی کٹھن دشواریوں کو عبور کرتے ہوئے اپنے آپ کو جا بجا پڑھواتے ہوئے منزل تک پہنچتے ہیں جہاں ان کے چہروں پر تھکن کے آثار اور جسم پر چھیتھڑے نظر آتے ہیں......

تاہم اس بار گی ثالث اپنے پوری آب و تاب سے پہنچا...... مشمولات میں ''ثالث'' نے ایک جہاں آباد کیا ہے اور سب سے اہم گوشہ انتظار حسین ہے۔ میرے تئیں ثالث نے انتظار حسین کے انتقالِ پرملال پر بہت عمدگی سے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان سے گفتگو، عمر فرحت کا مضمون 'انتظار حسین کا افسانوی چلن' 'انتظاریات، مضمرات و ممکنات' از رافد اویس بھٹ 'سماج ادب کا آئنہ دار ہوتا ہے' از سید عمران بلخی اور انتظار حسین کے دو فن پارے خاکہ اور افسانے کی صورت میں اس گوشے کو بقعۂ نور کرتے ہیں۔ مضامین کی فہرست میں بشمول ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کئی ایک اہم نام نظر آتے ہیں۔

شعریات میں سلطان اختر، رحمان حفیظ افتخار حیدر منصور خوشتر جیسے اہم نام شامل ہیں۔

افسانوی دنیا میں نسترن احسن فتیحی سے لیکر سلمٰی جیلانی اور فارحہ ارشد، عتیق الرحمٰن، سید کامی شاہ،

ہما فلک جیسے نام اپنی پوری چمک دھمک کے ساتھ فروزاں ہیں۔

اقبال حسن خان کا ناول 'راج سنگھ لاہوریا' ایک باب اور خاکسار کا حسین مجروح کے نئے شعری مجموعے ''آواز'' پر ایک تنقیدی جائزہ شامل ہے۔

یہاں میں ثالث کے اداریہ پر ضرور کچھ کہنا چاہونگا۔ اقبال حسن آزاد چونکہ خود بہت کامیاب اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ لہذا انکی گہری نظر ہمیشہ سے افسانہ میں ہوتی ہوئی تبدیلیوں پر رہی ہے۔ آج کے لکھے جانے والے افسانوں میں قارئین کی دلچسپی اور علامت و تجرید کی بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں......

''تو پھر وہ کونسی خوبی ہے جو ہر قسم کے قاری کو پسند آتی ہے اور کئی افسانہ نگار مقبولِ خاص ہوجاتے ہیں۔ وہ ہے اسکا بیانیہ، اس کا ٹریٹمنٹ، اسکا لفظیاتی نظام یا ڈکشن...... افسانے میں کونسا لفظ کہاں پر کونسا معنی پیدا کرے گا اسکا ادراک افسانہ نگار کو ہونا چاہیئے......''

اس اداریہ میں انہوں نے آگے چل کر تجرید اور علامتی افسانے پر بھی گفتگو فرمائی ہے جو نئے لکھنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ہے''

مجموعی طور پر اس بار ثالث ایک نئے انداز اور قاری کی دلچسپیوں کا سامان لئے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ ثالث کے لئے نیک تمنائیں۔

«●»

● ارشد عبد الحمید (ٹونک)

شمارے میں ''مضامین'' کے عنوان سے چار تحریریں شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے سہیل عظیم آبادی پر پریم چند کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ مقالہ بھرپور ہے اور سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری کے متعدد پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہے۔ اسلم جمشید پوری کا خیال ہے کہ سہیل عظیم آبادی کو پریم چند سے متاثر افسانہ نگار کہنا ان کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوا کیوں کہ وہ کئی اعتبار سے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ اس کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اسلم جمشید پوری نے سہیل عظیم آبادی کے بہت سے رومانی اور جنسی مسائل پر مبنی افسانوں کا ذکر کیا ہے اور دیگر خصوصیات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

فرحان دیوان علیگ کا مضمون سرسید کی تعلیمی سرگرمیوں کو گلوبلائزیشن کے حوالے سے دیکھتا پرکھتا ہے۔ مضمون کارآمد تو ہے لیکن بہتری کی گنجائش بھی موجود ہے۔

نوشاد کامران کا مضمون تحقیق اور اس کے مسائل نسبتاً بہتر ہے اور طلبہ کے لیے بہت مفید بھی ہے

البتہ اس موضوع پر اب تک لکھے گئے مضامین/کتب سے آگے نہیں بڑھتا۔ بہتر ہوتا کہ آج کے تحقیقی مسائل اور نئے وسائل کے حوالے سے بھی کچھ گفتگو کی گئی ہوتی۔

ممتحنہ اختر کا مقالہ ''شبلی کی تنقید پر حالی کے اثرات'' بہت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ خود شبلی نے اردو میں تقابلی تنقید کا آغاز کیا اور یہاں شبلی اور حالی کے تنقیدی طریقہ کار کا موازنہ اسی صالح روایت کا تسلسل قائم کرتا ہے۔ ایسا عمدہ مقالہ لکھنے پر ممتحنہ اختر مبارک باد کی مستحق ہیں۔ ادبی صحافت کی روایت میں ہمارے بعض عمدہ رسائل سینیر ٹی کے اعتبار سے لکھنے والوں کی تقدیم و تاخیر کا بھی خیال رکھتے تھے اور اگر تخلیق/تحریر بہت عمدہ ہو تو کبھی کبھی جونیرس کو اولیت دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ممتحنہ اختر کے مقالے کو کافی پہلے جگہ ملنی چاہیے تھی۔

ثالث شمارہ۔۷ سے ''اعتراف'' کا جو نہایت عمدہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا، وہ ثالث۔۸ میں بھی جاری ہے۔ اس کے تحت طارق متین (شاعر) اور اسرار گاندھی (افسانہ نگار) کی تخلیقی فتوحات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ راشد طراز نے طارق متین کی شاعری کو احساس سے اسلوب تک کے پیرائے میں دیکھا ہے اور ان کی شاعری کو روایت و جدت کے مابین توازن اور استحکام کی صورت گری سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طارق متین کی شاعری امکانات سے لبریز ہے اور راشد طراز نے ان کے فن اور فکر کا بخوبی جائزہ لیا ہے لیکن گنجائش مزید باقی ہے۔

اسرار گاندھی کی افسانہ نگاری کو اجے مالوی نے تخلیقیت افروزی کا نام دیا ہے اور تفصیل کے ساتھ ان کی تخلیقی خصوصیات کو بروئے کار لانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ثالث کے تازہ شمارے میں غزلوں کا حصہ خاصہ وقیع ہے۔ کل تیرہ شعراء کی غزلیں شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر عمدہ اور قابل قدر ہیں۔ جو اشعار مجھے ذاتی طور پر پسند آئے ان کی ایک جھلک یہاں پیش ہے:

میں اپنے آپ میں لوٹا تو سینہ پیٹ کر روئی
مری دیوانگی مجھ سے تھی دامن گیر مدت تک

اپنی صورت سے ہراساں ہے ہر اک شخص یہاں
کون اس شہر میں اب آئینہ بردار رہے

سلطان اختر

اتنے یکساں ہیں مری قوم کے سب معمولات
صرف تاریخ سے اخبار بدل جاتا ہے

قفس ہے جو برنگِ سائباں رکھا ہوا ہے
ہمارے سر پہ جو یہ آسماں رکھا ہوا ہے

رحمان حفیظ

غزل جیسا سراپا تھا کسی کا
کوئی صورت مکمل شاعری تھی

افتخار حیدر

یہ کیسی موج ہے کھینچے لیے جاتی ہے ہم کو
یہ کیا دریا ہے جس کو پار کرتے جا رہے ہیں

اشرف یوسفی

ارزاں ہے التفات ابھی سے جو یار کا
نو واردانِ عشق ! تماشا تمام شد

انجم عثمانی

کچھ نہیں جانتی جیتی ہوں کہ ہاری ہوئی ہوں
میں بہت سوچ سمجھ کر ہی تمھاری ہوئی ہوں

اس کو چاہا بھی بہت اس سے گریزاں بھی رہی
کیا پتا کون سے احساس کی طری ہوئی ہوں

دھوپ بن کر ابھی آ جاؤ، سکھا دو مجھ کو
گیلے کپڑے کی طرح چھت پہ پساری ہوئی ہوں

صدف اقبال

یہی موقع ہے چلو حد سے گذر جانے کا
راستہ کوئی نہیں لوٹ کے گھر جانے کا

طارق متین

مرے لبوں پہ جمی برف سوچ کر چھونا
تمھارے جسم کا آہن پگھل بھی سکتا ہے

ذوالفقار نقوی

سفینہ غرق ہوا کیوں یہ ناخدا جانے
یہی تھا اس کا مقدر تو پھر خدا جانے

مسلم نواز

زخمِ شب دیکھ کیسے رفو ہو گیا
چاند تیری طرح ہو بہو ہو گیا

اپنے پیار کے پھول ستارے سارے اس پر کاڑھ چکی
وہ جو میرے آنچل جیسا وہ جو میری چادر ہے

دیا جیم

«•»

مکتوبات

☆ آپ کا یہ جو دوست ہے نا...... محمد حامد سراج...... اسے نسیان نے آلیا ہے۔ اب کیا کیا جائے...... ایک افسانہ...... جو ایک کیفیت میں سرزد ہوا۔ جانے افسانہ ہے کہ نہیں...... اپ ٹھہرے افسانے کے پارکھ اور یہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ دیکھ لیجئے پرکھ لیجئے...... اب یاد کے کواڑ پر دستک دے دے کر تخیل اور سوچ کی ہتھیلیاں چھلنی ہوگئی ہیں کہ کیا یہ افسانہ کسی ادبی جریدہ کو بھیجا تھا کہ نہیں۔ لگتا ہے نہیں بھیجا۔ ممکن ہے بھیجا ہو۔ اب بھیجنے اور نہ بھیجنے کے درمیان معلق محمد حامد سراج اسے اپنے ''ثالث'' کے لیے بھیج رہا ہے۔ آپ اسے جگہ دے دیجئے ہماری روح کی تھکن اتر جائے گی۔

محمد حامد سراج (میاں والی پاکستان)

☆ ثالث۔۸ موصول ہوا۔ شکریہ!۔ مشمولات تمام عمدہ ہیں، خاص طور پر گوشۂ انتظار حسین تو دستاویزی حیثیت کی چیز ہے۔ شعریات بھی خوب ہیں۔ خاص طور پر سلطان اختر، طارق متین، اور ذوالفقار نقوی کی تخلیقات پسند آئیں۔ ثالث نے بہت جلد اردو کے بڑے جرائد میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ اس کے لیے آپ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں

پرتپال سنگھ بیتاب، ممبئی

☆ بخیر و طالب خیر، بندہ پشیمان و معذرت خواہ ہے، بہت تاخیر سے خدمت میں حاضر ہونے ثالث کی نسبت سے اپنے تاثرات و احساس مستر پیش کرنے کے لیے مصروفیت کو بہانہ نہیں بنا سکتا لیکن اسے سفارشی بنا کر پیش کر سکتا ہوں .... باعث تاخیر کچھ تو ہونا چاہئے۔

بہر حال! فی الوقت ثالث، شمارہ ۷ مطالعے کی گرفت میں ہے یا میرا شوق مطالعہ، ثالث کی گرفت میں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ثالث کی ضرورت کس کو نہیں اور اب ثالثی

کے بغیر کام کہاں چلتا ہے۔ گویا آپ کا اور ہمارا ثالث، بیک وقت ادب العالیہ اور ادب جدید کے درمیان/بیشۂ تنقید اور نخلستانِ تخلیق کے درمیان/جدلیات اور جمالیات کے درمیان اور ماحاصل یہ کہ متن اور قاری کے درمیان ثالثی کو آمادۂ کار کھڑا ہے اور فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے۔ آپ کی محنت اور سلیقے سے؟ آپ کے مرغوب کن اداریے سے؟ یا ان مشمولات سے جو آپ کی نگاہ انتخاب کی سند بنتی ہیں؟

اب مسئلہ یہاں یہ کھڑا ہے کہ اداریے کے پہلے جملے نے میرا دامن پکڑ لیا ہے کہ بات تو یہیں سے شروع ہوگی۔ نظریات خرد کے مضمرات و ممکنات پر مشتمل ہوتے ہیں، اس اعلان نے مجھے حیران و پریشان کردیا ہے...... بابا اب ہمارے جنوں کا کیا ہوگا جو ہم بے عقلوں کے لئے سرچشمۂ نظر و نظریہ ہے.......... اور وہ نظریہ جس کا مخزن تخلیقات اور جمالیات ہے؟ تو کیا نظریات کو ناقد بن اور محققین کے اصطبل میں باندھ دیا جائے اور ہم اپنی نظر کے سہارے آگے بڑھ جائیں......؟ اللہ بھلا کرے، آپ نے خود آگے چل کر میری مشکل کو آسان کر دیا...... ''تخلیق کا کی جولان گاہ حیات و کائنات کے ممکنات و مضمرات تک پھیلی ہوتی ہے، لیکن تنقید کی جولان گاہ فن پارے کے ممکنات و مضمرات تک محدود ہوتی ہے۔'' بشکریہ اگر آپ اس گفتگو کو آئندہ شمارے میں آگے بڑھائیں تو ہم جیسوں کی رہنمائی ہوگی۔

بات گفتگو کی نکلی تو دل کی بات زباں تک پہونچنا چاہتی ہے کہ ثالث کا ہر شمارہ اگر کسی ایک ادبی گفتگو کے ذریعہ نئے سوالات اٹھانے اور موجودہ ادبی (تخلیقی/تنقیدی) صورت حال/منظر نامے کے مضمرات و ممکنات کو آگے بڑھانے کا راستہ نکالے تو ایک طرح سے رسالے کی اشاعت ثمر آور ہو جائے۔ ہر شمارے میں شامل مضامین کے انتخاب کو بھی اس گفتگو سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔

شمارہ ۷ انتہائی پرکشش، دیدہ زیب اور دل پسند ہے۔ اداریے میں نظریات و رجحانات اور تخلیقی و تنقیدی معاملات کے حوالے آپ نے بھر پور گفتگو کی ہے...... اور یہ دیدہ وری و دانشوری کی مارکیٹنگ...... بڑی خطرناک اور عبرتناک صورت حال کی طرف آپ نے اشارہ کردیا ہے۔ نظریات کے زوال کی بات بھی

آپ نے بر وقت اٹھائی ہے۔تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں لیکن مجھے شاہد الرحمٰن اور صابر حسن رئیس کے مظامین خصوصی طور پر پسند آئے۔صابر حسن صاحب نے مخمور سعیدی مرحوم پر ایسے وقت میں گفتگو کی ہے جب مدتوں سے مخمور صاحب پر کوئی تحریر نظر نہیں آئی ہے۔تخلیقی اور تنقیدی جمالیات پر شاہد الرحمٰن نے بے حد جامع اور مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ویسے اردو کو شدھ دیسی رومانس کر دینے کی خواہش تھوڑی وضاحت چاہتی ہے۔بہت زمانے کے بعد حبیب جالب مرحوم پر محنت سے لکھا ہوا مضمون پڑھا۔انقلابی آہنگ ان کا خاصہ ہے مگر یہ آہنگ جب بہت تیز رو ہو جاتا ہے تو شاعری کا دم پھولنے لگتا ہے۔اس معاملے میں فیض اور مجروح اور جذبی اور تابان بے حد کامیاب رہے ہیں۔

آخر میں تھوڑی باتیں شاعری اور افسانے پر بھی ہو جائیں۔

عرفان ستار غزل کے نمائندہ شعراء میں ہیں اور ان یہاں جو ندرت اظہار ہے وہ ان کا شعری اختصاص ہے۔

مجھ سے ممکن یہ نہیں ہے کہ میں کھل کر کہہ دوں
اس کے بس میں یہ نہیں کہ اشارہ سمجھے

اس شعر میں شاعری کی رمزیہ جمالیات کی تاریخ پوشیدہ ہے، اور ایک طرح سے یہ پوری غزل کا عنوان ہے۔ارمان نجمی کا ایک شعر بھی اسی رمزیہ اسلوب کا اشارہ ہے۔

سنا رہا ہوں میں ہوش و حواس میں لیکن
یہ نیند اڑاتے ہوئے خواب کی حکایت ہے

دگر شعرا کی غزلیں بھی پسند آئیں.....اور پھر اگلا قدم جزیرۂ خواب کی طرف تھا۔بھائی یہ صدیق عالم جذب میں نظمیں کہتے ہیں کہ ان کا قاری بھی ان کے جذب میں شامل ہو جاتا ہے۔یہ اس عہد کا بڑا تخلیقی دماغ ہے۔ان کے ساتھ آپ نے رضی شہاب کا نغمۂ سلوک بھی شامل کر لیا ہے۔بہت خوب۔گویا آپ نے ہمیں جذب و سلوک کے درمیان چھوڑ رکھا ہے۔بالآخر ہم گوشہ صورت افسانوں، ناول اور کلاسیکی گلشن، پیتل کا گھنٹہ، کے ذریعہ ایک خصوصی کیف کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ تبصرے بھی خوب ہیں۔بہت بہت مبارک ہو۔ پروفیسر عین تابش (گیا)

☆ آپ سے فون پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔میں نے ایک بار پھر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے کافی ترمیم و اضافہ کیا ہے۔تیسرا پروف بھی دیکھ لیا ہے۔عنوان بھی بدل دیا ہے۔ اب اس کہانی کا عنوان 'ایک جنگ اور' ہے۔پھر بھی اغلاط سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔کیونکہ تخلیق سرکہ کی طرح ہوتی ہے۔اسے جتنی بار چھانا جائے گا اتنی بار کچھ نہ کچھ نکل ہی آئے گا۔

جب یہ کہانی آپ کو پسند آ گئی ہے تب ان شاللہ قارئین 'ثالث' کو بھی پسند آ گئے گی۔خدا کرے 'افسانہ نمبر' دستاویزی اہمیت کا حامل اور تاریخی ہو۔یہی میری دعا بھی ہے۔

ڈاکٹر شاہد جمیل (پٹنہ)

☆ ''ثالث'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔شکریہ! انتظار حسین پر گوشہ خوب ہے۔مرحلہ وار مطالعہ جاری ہے۔واقعی یہ آپ کی ہمت ہے، جب جرائد کے نام ناپید ہو چکے ہیں آپ بڑی بردباری سے سینہ سپر ہیں۔اللہ آپ کو اور اہمت دے۔''ثالث'' قاری کو اپنے ساتھ بہت سا وقت گزارنے پر مائل کرتا ہے، جو کہ آپکی محنت کا ثبوت ہے۔ انتظار حسین عالمی شہرت یافتہ تخلیق کار ہیں۔ان کے لکھنے کا اپنا ایک مخصوص سٹائل تھا۔ ان کی کہانیاں اور ناول زندگی کی حقیقت کے ترجمان ہیں۔''انتظار حسین سے ایک گفتگو'' تو لاجواب ہے۔اس شمارے میں اور بھی بہت کچھ لائق مطالعہ ہے۔''ثالث'' سے وابستگی اور آپ سے دوستی کو اپنی خوش بختی پر محمول کرتے ہوئے آپ کی تادیر صحت و سلامتی کے احتکام کی دعاؤں کے ساتھ۔ عمر فرحت (راجوری جموں کشمیر)

☆ Congratulations! Doctor Saheb, your contribution will be remembered not only in Munger but in entire Urdu world. I hope that this journal will be carried on even after you by your able and charismatic son as well.
I received the journal today, thank you sir
Dr.Pramod Bharatiya(Mussoorie ,Uttrakhand)

☆ اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی مواد کا معیار و مقدار دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ادبی مذاق کی تربیت اور جلا کے لئے ''ثالث'' کو قاری کے لئے بہت مفید و معتبر پایا۔سالک بھائی آئندہ ''ثالث'' کی دائمی قاری بننے کی خواہش مند ہے۔امید

ہے کہ مدیر انداز ثالث کے فیض سے سالک کو بھائی آئندہ فیض یاب کریں گے۔ ممتحنہ اختر (سری نگر، جموں کشمیر)

☆ جناب اقبال حسن آزاد صاحب کی محبتوں/عنایتوں کا شکر گزار رہوں کہ کتابی سلسلہ 'ثالث' شمارہ ۸ موصول ہوا۔اس سے قبل بھی 'ثالث' ہمہ دست ہوتا رہا ہے۔بلا شبہ 'ثالث' اپنی پیشکش اور ندرت انتخاب کی کاوش میں خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔پیش نگاہ شمارے میں گوشۂ انتظار حسین کی شمولیت اس لیجنڈری افسانہ نگار کو بروقت خراج عقیدت ہے اور اس پیش رفت سے 'ثالث' نے دیگر ادبی رسالوں میں سبقت حاصل کر لی ہے۔اداریہ میں فن افسانہ نگاری کے تعلق سے جن امور پر روشنی ڈالی گئی ہے ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افسانہ کے متن کو کسی مخصوص لسانی انصرام کے تحت محدود نہیں کیا جا سکتا۔مہمان اداریہ میں ڈاکٹر منظر اعجاز صاحب نے 'متن سے مکالمہ' کے تحت فن پارے کی تفہیم و تشریح کے حوالے سے جن نکات کو موضوع بحث بنایا ہے وہ دلچسپ بھی ہیں اور کار آمد بھی۔ اس شمارے کے تمام افسانے میرے مطالعے میں آ چکے ہیں۔

عتیق رحمان کا افسانہ 'تحفہ' انسان کی سہولت پسندی کی نفسیات پر مبنی ہے جو ایام عبادت میں بھی انسانی نفس پر شیطان کی طرح قابض رہتا ہے۔عطاء الرحمان خاکی کا افسانہ 'کچھ حقیقت، کچھ فسانہ' حقیقت حیات کے ان نادیدہ پہلوؤں کی گرہ کشائی کرتا ہے جہاں انسانی تدبیریں کام نہیں آتیں اور وہ گردش حالات کا ایک بیجان مہرہ بن کر رہ جاتا ہے۔سید کامی شاہ کا افسانہ 'غریب آباد' نشاط کامی کا متلاشی گردش حالات سے نبرد آزما ایک نوجوان کی روداد ہے جو اپنے جیسے ان گنت نوجوانوں کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہے۔سلمی جیلانی کا افسانہ 'سسکیاں' خانہ جنگی کی ہولناکیوں سے کشید کیا ہوا ایک معصوم سا افسانہ ہے جو قاری کو غور و فکر کی نئی جہت سے آشنا کرتا ہے۔نسترن احسن فتیحی نے اپنے افسانہ 'نسل' میں جنگلی جانوروں کے تحفظ اور ان کی بقاء کے لیے جدوجہد کے مابین انسانوں کے افزائش نسل پر عاید پابندیوں سے جو افسانہ کشید کیا ہے وہ واقعی صدمے اور حیرانی میں مبتلا کرنے والا ہے۔نوشابہ خاتون کا افسانہ 'طلیح' کا موضوع پرانا ہوتے ہوئے بھی

ٹریٹمینٹ کے لحاظ سے متاثر کن ہے۔فارحہ ارشد کا افسانہ 'گرہن گاتھا' صدیوں سے چلی آ رہی فرسودہ روایات میں جکڑی عورت کی گاتھا ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ہما فلک کا افسانہ 'سچا' سچائی سے بیان کیا ہوا ایک اچھا اور سچا افسانہ ہے جو انسانی فطرت کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔احمد عرفان کا افسانہ 'سگنل' اپنے فطری بیانیہ انداز تحریر کی وجہ سے متاثر کر گیا۔یہاں سگنل انسانی محرومیت کا علامیہ بھی بن گیا ہے۔فرحانہ صادق کا افسانہ 'الو کا پٹھا' بھی دلچسپی کا حامل ہے اور انسانی جبلت کے ایک گوشے کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہے۔

یہ تمام افسانے اس لحاظ سے قابل قدر ہیں کہ ان میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔میں جناب اقبال حسن آزاد صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ رسالہ 'ثالث' کے ذریعہ وہ اردو کے عصری افسانوی ادب کو آگے بڑھانے کا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ رفیع حیدر انجم (اریہ)

☆ سہ ماہی ثالث کا آٹھواں شمارہ نظر نواز ہوا۔دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے ایک مرتبہ پھر ادبی مرقعوں کا ایک خوبصورت گلدستہ سجایا ہے، جس میں نوع بنوع کے پھول کھلے ہوئے ہیں، یہ نہ صرف آپ کے حسن نظر اور گل انتخاب کا کمال ہے بلکہ آپ کے ادبی ذوق اور محنت و جستجو کا بھی غماز ہے۔اولین صفحات کو پلٹتے ہی جناب محمد شفیع الرحمان شفیع صاحب کی حمد شریف اور نعت پاک پر نظر پڑی جو انتہائی معیاری ہیں۔اس کو دیکھتے ہی نعیم صدیقی مرحوم کا سیارہ یاد آیا جس کے کسی اداریے میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ اس کی بنیاد ادب اسلامی کی تحریک چلنے کے بعد سیارہ اور اس قبیل کے دوسرے رسائل نے شروع کی تھی، جسے سراہا گیا اور بڑی تعداد میں ایسے رسالہ نظر میں آ جاتے ہیں جہاں تبرکاً شروع میں نعت اور حمد کا اہتمام کیا جاتا ہے۔حسب معمول اس مرتبہ مضامین سے لیکر افسانے تک سبھی عمدہ اور دلچسپ ہیں، آپ نے اداریے میں جن نکات کی جانب نشاندہی کی ہے وہ یقیناً توجہ طلب ہیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ کچھ لوگ زبردستی ایسی ایسی اصطلاحات گڑھ رہے ہیں جس سے زبان آسان ہونے کے بجائے چوں چوں کا مربہ بنتی جا رہی ہے۔

مہمان اداریہ متن سے مکالمہ میں ڈاکٹر منظر اعجاز نے جن نکات پر بحث کی ہے وہ

نئے لکھاریوں کے لئے بڑے خاصے کی چیز ہے۔شہناز شازی کی نظم اسم بہت پیاری لگی۔ تحقیق اور اردو کے مسائل پر نوشاد کامران نے اچھی گفتگو کی ہے اردو تحقیق کے نام پر اس وقت جو چیزیں آرہی ہیں انہیں دیکھ کے کوفت ہوتی ہے، بڑے بڑے قلم کار ماخذ اور حوالہ کا اہتمام نہیں کرتے، کچھ تو اتنے دیدہ دلیر ہیں، یا قاری کو بے وقوف سمجھتے ہیں کہ طویل طویل عبارت متن میں واوین کے ساتھ نقل کر دیتے ہیں۔ وہ قاری کی نظروں میں بھی دھول جھونکتے ہیں اور اس پر انھیں توجہ دلائی جائے تو بہت سادگی سے کہہ دیتے ہیں ہم نے اس چیز کو واوین میں تو لکھ دیا ہے تا یعنی ان کے نزدیک ماخذ کی نشاندہی یا اس کی تفصیلات درج کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، حالانکہ فی زمانہ تحقیق اور ریسرچ ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اسرار گاندھی کے افسانوی فکر وفن میں تخلیقیت افروزی پر اپنے مالوی نے اچھا لکھا ہے۔ انتظار حسین سے ایک گفتگو عمدہ چیز ہے، اس سے ادب، ناول، افسانہ، اسلوب کئی چیزوں کی اچھی معلومات ہوتی ہے۔ حاشیہ میں اگر اس بات کا بھی تذکرہ ہو جاتا کہ یہ انٹرویو کب اور کہاں کیا گیا اس کے پیچھے کیا محرکات تھیں تو یہ ایک دستاویزی چیز ہو جاتی، حالانکہ تاریخی تو اب بھی ہے لیکن قاری کی جستجو بہر حال برقرار رہتی ہے۔ سماج ادب کا آئینہ ہے پر سید عمران بخشی نے اہم نکات پر توجہ دلائی ہے شاید اسی لئے ہمارے بزرگ کہا کرتے ہیں اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب ہے۔

افسانوں کے انتخاب میں آپ نے انتظار حسین کے افسانہ پسماندگان کو شائع کر کے بہت ساری یادوں کو کریدیا ہے۔ اساتذہ یا کلاسیکل ادب کی بات ہی الگ ہے اس افسانہ کا سحر اب بھی برقرار ہے۔ حسب معمول افسانوں کا انتخاب بڑا پیارا لگا، سبھی افسانے دل کو چھو جانے والے ہیں۔ اس مرتبہ کئی نئے چہرے بھی نظر آئے۔ خوشی ہوتی ہے کہ اردو میں اتنے اچھے لکھنے والے لوگ موجود ہیں، ایسے انتخابات کا دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہونا چاہئے، کاش اس بیڑا کو کوئی اٹھاتا تو دنیا کو بھی پتہ چل سکتا تھا کہ اردو میں کس قدر اعلیٰ ادب تخلیق پا رہا ہے۔ آپ کی ایک چیز جو مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ ہے کہ آپ صالح ادب کی آبیاری میں منہمک ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کا ضرور جزا دے گا۔ نسترن احسن فتیحی کے افسانے نے ایک الگ لطف دیا، ان دنوں دلت

ادب کی بات بڑے زور وشور سے اٹھائی جا رہی ہے، میں سمجھتا ہوں ایسے افسانے نمائندہ افسانے ہیں جنھیں نہ صرف دلت ادب کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے بلکہ یہ افسانے یا کہانیاں انسان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

سلمیٰ جیلانی کے افسانے سسکیاں نے بھی کافی متاثر کیا۔ گذشتہ کئی ماہ میں ای ٹی وی اردو میں بین الاقوامی خبروں کا ترجمہ کرنے کی وجہ سے روزانہ ان سرحدوں میں انسانیت کو پامال ہوتے ہوئے، ان کی آہوں، سسکیوں، ظلم اور درد کو خبر کی شکل میں پروسنے کا موقع مل رہا ہے۔ سلمیٰ جیلانی نے ان سسکیوں، آنسوؤں اور آہوں کو ''سسکیاں'' کی شکل میں بہترین الفاظ کا روپ دیا ہے، یہ کہانی اپنے اندر جو داستان لئے ہوئے ہے، وہ مقدونیہ، شام، یمن، ترکی، عراق، چیچنیا، بوسنیا، فلسطین، میانمار سبھی کا درد سمیٹے ہوئے ہے کہ ہر جگہ یہی سسکیاں تو ہیں۔

اس شمارے میں ایک اور خاصیت دیکھنے کو ملی وہ یہ کہ آپ نے اس میں خواتین قلم کاروں کو اچھی خاصی جگہ دی ہے، یہ اچھی کوشش ہے، ایسے نئے لکھاریوں کو بھی جگہ ملنی چاہئے کہ آپ محض رسالہ نہیں نکال رہے ہیں بلکہ جدید نسل کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں۔ اقبال حسن صاحب کے ناول راج سنگھ لاہور یا کا اسلوب اور انداز بیان پیارا لگا، کہانی میں آگے کیا ہونے والا ہے قاری کی بے قراری بڑھانے والی ہے۔ کہانی میں آگے کیا ہونے والا ہے قاری کی بے قراری بڑھانے والی ہے۔

محمد علم اللہ (حیدرآباد)

☆ امید ہے شگفتہ ہوں گے۔ ثالث کا آٹھواں شمارہ پیش نظر ہے۔ مسلسل آٹھ شمارے ،اتنی خوبصورتی اور خوش سلیقگی کے ساتھ، حیرت ہوتی ہے، اور رشک بھی۔ ساتھ ہی دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ نظر بد سے بچائے آمین۔ اس بار گوشہ انتظار حسین خاصے کی چیز ہے، خصوصی طور پہ انکا انٹرویو تو نئے فکشن نگاروں کے لئے مشعل راہ ہے، قند مکرر کے طور پہ پڑھا اور خوب محظوظ ہوا۔ بلاشبہ انتظار حسین ہمارے عہد کے ایک لیجنڈ ہیں۔ عمر فرحت نے انکے فن پر گفتگو کرتے ہوئے کئی افسانوں کا خوبصورت اور فطری تجزیہ کیا ہے۔

اعتراف اور امکان کا سلسلہ اہم اور دلچسپ ہے، اس سے نئی نسل کے تخلیق کاروں کی

نہ صرف حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ انکی تہذیب وتربیت میں بھی مدد ملے گی۔امکان کے تحت ہما فلک ،احمد عرفان اور فرحانہ صادق کے افسانوں کے موضوعات معاشرے کے عام مسائل ومصائب پر مبنی ہیں۔اس سلسلے میں احمد عرفان کا افسانہ سگنل متاثر کن اور افسانہ نگار کے حساس ہونے کا جواز فراہم کرتا ہے،اگر چہ یہ افسانہ کسی بڑے موضوع پر نہیں ،مگر اسکے مرکزی کردار غفور کے یہاں اپنی بیوی اور بچوں کی پرورش کے لئے جدوجہد کرنے کا جذبہ زندگی کی علامت ہے،سیدھا سچا بیانیہ اچھا لگا۔سلطان اختر کی غزلیں مزہ دے گئیں۔ سلیم انصاری (جبل پور)

☆ ''ثالث'' کا شمارہ نمبر۔۸/باصرہ نواز ہوا۔اس عنایت کے لیے شکرگزار ہوں۔ثالث کی روزافزوں مقبولیت دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ایک قلیل مدت کے اندر اس نے ادبی حلقوں میں اپنی منفرد شناخت بنالی ہے جو بلاشبہ آپ کی اور برادرم ثالث آفاق صالح صاحب کی مدبرانہ بصیرت اور ادبی صلاحیتوں کا بلیغ اشاریہ ہے۔اب یہ رسالہ اتنا معیاری ہو چکا ہے کہ اسے بین الاقوامی درجہ دیا جاسکتا ہے۔

زیر نظر شمارے میں اداریہ کے تحت افسانے کی ماہیت پر کھل کر گفتگو کی گئی ہے۔یہ بات صدفی صدی درست ہے کہ وہی افسانے دلچسپ ہوتے ہیں جن میں ترسیل کا المیہ نہ ہو۔ایک وقت تھا تجریدی افسانے کثرت سے لکھے گیے جنھیں قاری نے مسترد کردیا۔چنانچہ آج کے افسانے اپنے افسانہ پن کی وجہ سے پسند کیے جاتے ہیں اور دلچسپی کا موجب بھی ہیں۔

اس شمارے میں شامل غزلیں،مضامین،افسانے اور دیگر مشمولات لائق مطالعہ ہیں۔انتظار حسین ایک قد آور افسانہ نگار تھے۔ان پر گوشہ شایع کر کے آپ نے عمدہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔یہ گوشہ حوالے کے کام بھی آئے گا۔اس وقیع اور معیاری پیش کش کے لیے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

اڑیسہ میں اردو زبان وادب کی موجودہ صورت حال کے تعلق سے ایک مختصر سا مضمون اور دو شعری تخلیقات ارسال خدمت ہیں۔اگر پسند آئیں تو شامل اشاعت کرلیں۔شکرگزار ہوں گا۔ سعید رحمانی (کٹک)

☆ سرحد کے اُس پار.....دشمن کے دیس میں ایک مرد آزاد.....اقبال حسن آزاد۔

اعلا درجے کا بین الاقوامی ادبی جریدہ ثالث شایع کرتے ہیں۔یہ محض جریدہ نہیں ہے۔ہندو پاک کے دانش وروں۔ادیبوں،اور شاعروں کے درمیان محبت کا پل ہے.....مجھ ناچیز کے لیے اقبال بھائی نے ثالث بھیجا تو دل خوش ہو گیا.....چند سطریں خود بہ خود صفحۂ قرطاس پہ بکھر گئیں۔

یہ سطریں اقبال حسن آزاد جیسے حسین اور ذہین قلم کار کی خدمت میں نذرانہ ہیں۔

ادھوری سی بات.....
سرحد کے اُس پار.....
(جہاں سب کہتے ہیں.....دشمن رہتے ہیں)
حد پار کر کے.....
کوئی گولی.....کوئی بم نہ آئے،
کوئی غم نہ آئے،
پیار کی بات آئے.....
سوغات آئے،
کوئی کتاب آئے.....
تب امید جاگتی ہے.....
اِدھر سے بھی کتاب جائے،
پیار کی بات جائے،
کوئی سوغات جائے۔
کوئی گولی،کوئی بم۔کوئی لاشہ
کوئی نفرت کا بتاشا.....
نہ اُدھر جائے.....نہ اِدھر آئے.....

ابن آس محمد (کراچی،پاکستان)